www.Paksociety.com

سپین کی سیاحت پہ نکلے گمشدہ مسافر کی دل ہلا دینے والی داستان

مسلسل اشاعت کے ۵۲ سال

فروری 2012

اُردو ڈائجسٹ

www.urdudigest.pk

کیا مغرب بارے
سوچ
بدلنے کا
وقت آچکا؟

بالی ووڈ کے
حکمران
خان
اردو کے انجانے محافظ

ایرانیوں نے اتارلی
امریکی ڈرون

ویلنٹائن ڈے؟
اصل قصہ کیا ہے

صحت کا
نیا دوست
موبائل فون

چھوٹی عمر میں
بڑی کامیابی
ارفع کریم
دُور کا سوچنے والی دور جانکلی

www.Paksociety.com

www.urdudigest.pk

اردو زبان کی سر بلندی، نظریاتی سرحدوں کی حفاظت، اور شائستگی کے لیے

اُردو ڈائجسٹ

جنوری ۲۰۱۲ء صفر المظفر ۱۴۳۳ھ جلد نمبر ۵۲ شمارہ ۱

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی

مدیر منتظم: طیب اعجاز قریشی

مدیر: اختر عباس editor@urdu-digest.com

مجلس تحریر: حافظ فروغ حسن، سید عاصم محمود، صفیرہ بانو شیریں، محمود جمال، نوید اسلام صدیقی، عمرو یم پشوتہ

منتظم طباعت: فاروق اعجاز قریشی، ویب ایڈیٹر: عبدالوہاب، ایڈیشنل گرافکس: افنان کامران قریشی، [illegible]: عاطف مرزا

مارکیٹنگ/اشتہارات: advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093 info@urdu-digest.com

منیجر ایڈورٹائزمنٹ: احمد فیاض 0322-7474010

لاہور: ندیم حامد 0300-4242620

کراچی کوآرڈینیٹر: احسان الظفر 0300-9620294

سالانہ خریداری subscription@urdu-digest.com

پاکستان: عام ڈاک 600 روپے، رجسٹرڈ 750 روپے

بیرون ملک: انگلینڈ، براعظم ایشیا، افریقہ: $50

یورپ، امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا: $50

نوٹ: خریداری نمبر ضرور تحریر کیجئے

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

"URDU DIGEST
Current A/C No. 600380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

صدر مجلس آفس:
21/19 ۔ ایف ایکسٹینشن، سمن آباد لاہور 54500
فون: 92-42-37589957

ادارتی آفس: (خط و کتابت کے لیے)
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738
فیکس: +92-42-35290731

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے [illegible] 24 [illegible] روڈ سے چھپوا کر 21-19 [illegible] سمن آباد لاہور سے شائع کیا

قیمت: 70 روپے

www.Paksociety.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

مرد اور عورت کے حقوق برابر۔ اعمال پر فیصلہ ہوگا

اور عورتوں کا حق (مردوں پر ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے اور مردوں کو عورتوں پر درجہ ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ☆ (مردوں کو عورتوں پر درجہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ اگر کوئی اختلاف پیدا ہو تو عورت جھک جائے تاکہ گھر کا ماحول خراب نہ ہو۔ ویسے بھی عورتوں کے لیے جھکنا نسبتاً آسان ہے کیونکہ بچوں کی پرورش کے پیشِ نظر ان کی سرشت میں شفقت، نرمی اور ایثار کی خصوصیات زیادہ رکھی گئی ہیں۔ مردوں کو درجہ دینے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ مہر ادا کرنے کے علاوہ تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کرتے ہیں جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۴ میں اس کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اپنے گھر والوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلانے کی ذمے داری بھی ان پر ہے۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ مشقت کے کاموں، جہاد اور امامت وغیرہ کے زیادہ اہل ہیں۔

(سورہ بقرہ، آیت ۲۲۸)

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

رسول ﷺ کا فرمان

آقائے نامدار ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں دیکھیے کہ ایک بہترین شخص کی خصوصیات کیا ہیں:

(۱) بہترین شخص وہ ہے جو اپنے خاندان کی حفاظت کرے اور اس کے دفاع میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہ ہو۔

(۳) جو اپنی عورتوں اور بیٹیوں کا زیادہ خیال رکھتا ہے، وہی سب سے بہتر آدمی ہے۔

(۴) بہترین شخص وہ ہے جس کو اللہ نے نفس پر قدرت و اختیار دیا۔

(۵) بہترین بندے وہ ہیں جو وعدہ وفا کرتے اور معطر رہتے ہیں۔

(۷) سب سے اچھا وہ شخص ہے جس کے دیدار سے تم کو اللہ یاد آئے، جس کی باتوں سے تمھارے علم میں اضافہ ہو، جس کے عمل سے تمھاری رغبت آخرت کی طرف بڑھنے لگے۔

(۸) بہترین دوست وہ ہے کہ جب تم اللہ کو یاد کرو، وہ تمھاری مدد کرے اور جب تم اللہ کو بھلا دو، تو وہ یاد دلائے۔

(۱۲) بہترین عورت وہ ہے کہ جب شوہر اس کی طرف دیکھے تو مسرور ہو، جب اس کو حکم دے تو اطاعت کرے، شوہر کی مخالفت نہ دل میں کرے اور نہ مالی معاملات میں۔

(۱۱) بہترین شخص وہ ہے جو قرآن کی تعلیم دے اور علمِ قرآن حاصل کرے۔

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

منفرد اور خصوصی نمبر

اردو ڈائجسٹ

اس شمارے میں

☆ ارفع نے آخری الفاظ کیا ادا کیے؟

☆ ارفع کے خواب اصل میں کیا تھے؟

☆ کرنل رندھاوا کے گھر "برفی" کون تھی؟

☆ بل گیٹس اسے وہاں کہاں بھجوانا چاہتا تھا؟

☆ ارفع کی میز پر کتابیں کون سی پڑی تھیں؟

☆ ارفع کے بستر پر اتنے کشن کیوں پڑے تھے؟

☆ کیا سیڑھیوں سے گرنا ارفع کی موت کی وجہ تھا؟

☆ ارفع کی والدہ اس کے ساتھ کہاں جاتی تھیں؟

☆ جہاز اڑاتی ارفع کے پائلٹ نے پیچھے مڑ کر کیا کہا؟

☆ پریشان ڈاکٹر نے ۲۵ منٹ تک سی پی آر کیوں کیا؟

☆ سیڑھیوں سے گرنے کے بعد
ایم آر آئی ٹیسٹ کیوں نہ ہوا؟

☆ ارفع کے والد نے
۱۰ تولے سونے کی اینٹ کا کیا کیا؟

ارفع کریم

اختر عباس

☆ ارفع کی بات سن کر بل گیٹس نے کیوں ٹیک لگا لی؟

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
www.paksociety.com

اس شمارے میں کیا کہاں ہے

کچھ اپنی زبان میں	نااہلی اور خود مختار الیکشن کمیشن	الطاف حسن قریشی	١٩
قلم کہاں کھڑے ہیں	اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی	الطاف حسن قریشی	٢١
گوشۂ سیرت سرورِ عالم	محسنِ انسانیت	نعیم صدیقی	٢٣
کشمیر جنت نظیر	۵ فروری کی یادیں	نوید اسلام صدیقی	۵١
کیریئر کونسلنگ	معیشت کے طلبہ کیلئے راہنما تحریر	یوسف الماس	۵٧
نعتِ شریفہ	محبوب آپ کے قدموں میں	فرحت قادر	٦١
گوشۂ ست رنگ	ملک کی تحریریں	نوید اسلام صدیقی	٦۵
سنسنی خیز انکشاف	ایران نے امریکی ڈرون کیسے اتارا؟	سید عاصم محمود	٨٣
مریم جونی ایڈونچر	ال ملٹسین کا گم شدہ مسافر	بدیع حسین	٩٠
پرلسیانہ طنز و مزاح	ڈپٹی صاحب کی پالیسی	ذوالفقار احمد چیمہ	٩٧
طب و تحقیق	ہیلتھ نیوز	طاہرہ اعجاز ملک	١٠٠
گوشۂ عبرت	دیس بدیس کی رعنائیاں	اقصیٰ فاطمہ	١٠٣
نئی سوچ، نیا نقطۂ نگاہ	مغرب سب بدل رہا ہے	ڈاکٹر فیصل احمد	١٠٩
طنز و مزاح	مزاح کی کیمسٹری، نصر اللہ خان کے کالم	محمود عزیز	١١۵

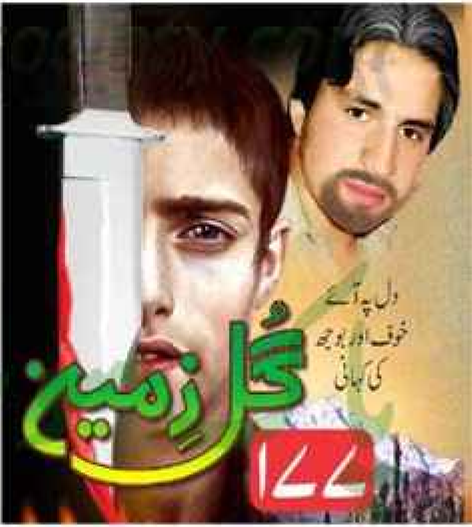

اس شمارے میں کیا کہاں ہے

	نہ جنوں رہا نہ پری رہی — طویل کہانی	اختر حسین شیخ	۲۰۸
یادِ رفتگان	سلیم احمد / استاد الاساتذہ	محمود احمد لئیق	۲۲۵
بچوں کا ادب	فرض	خواجہ مظہر نواز صدیقی	۲۳۲
ہلکی پھلکی تحریر	ہمت کے بادبان سے تھکی ہوا	سلطان یوسف	۲۳۵
مقبول سلسلہ	مشورہ حاضر ہے	صغیرہ بانو شیریں	۲۳۷
سچے واقعات	انعامِ عظیم	اعجاز احمد ڈنگ	۲۴۳
تاریخی واقعہ	ویلنٹائن ڈے ۔ اصل قصہ کیا ہے؟	عاصم محمود	۲۴۹
داغ مفارقت کی شہرت	وہ ذائقہ پائیے جو آپ کو پسند ہے	نوشین ناز	۲۴۹
ہندستانی فلم	بھارت میں اردو کے نمائندے محمد رفیع ۔ خان	سید عاصم محمود	۲۵۴
کھیلوں کی دنیا	دلچسپ واقعات و ریکارڈ	رانا محمد شاہد	۲۶۵
اصلاحِ زبان	روزمرہ غلطیوں کی اصلاح	پروفیسر آسی ضیائی	۲۷۳
آپس کی بات کرتے ہیں	۲۰۱۳ میں اپنی ایک عادت بدلنی ہے	مدیر	۲۷۹
قارئین کے خطوط	حسنِ خیال	تنقید و مشورے	۲۷۹
ترجمانِ ہمدست	پرائی چھت پہ آباد	اختر عباس	۲۸۵

www.Paksociety.com

کچھ اپنی زباں میں

نااہل اور خودسر الیکشن کمیشن

تمام سیاسی جماعتیں اس بات پر متفق ہیں کہ الیکشن کمیشن غیر جانب دار اور بااختیار ہونا چاہیے اور اٹھارویں آئینی ترمیم کے ذریعے اس کی میعاد اور اختیارات میں اضافہ بھی کیا گیا ہے' مگر چیف الیکشن کمشنر جناب جسٹس (ر) حامد مرزا نے سیاسی جماعتوں کے مشاورتی اجلاس میں جن خیالات کا اظہار کیا، وہ حد درجہ چونکا دینے والے اور خطرناک رجحانات کے حامل ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ رواج چل نکلا ہے کہ اپنی نااہلی اور آئین پر عمل درآمد میں کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے، اس کی ذمے داری دوسرے پر ڈال دی جاتی ہے۔ دستور کی رو سے ہر سال ووٹروں کی فہرستیں اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کا فریضہ الیکشن کمیشن پر عائد ہوتا ہے، جس میں وہ بری طرح ناکام رہا ہے اور جب عدالتِ عظمیٰ نے ۲۳ رفروری تک حتمی فہرستیں شائع کرنے کا حکم نامہ جاری کیا، تو جناب چیف الیکشن کمشنر کی شدید نااہلی، بے پروائی اور غیر ذمے داری پر گوشمالی کرنے کے بجائے ہمارے زیادہ تر سیاسی زعماء نے سپریم کورٹ کے حکم کو جبر قرار دیا اور کہا کہ انتخابات سپریم کورٹ کے بجائے سیاسی جماعتوں کو لڑنے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کوئی مہمل بات نہیں ہو سکتی۔ سپریم کورٹ کا تو مدعا یہ تھا کہ منصفانہ، شفاف اور قانون کے مطابق انتخابات کے لیے ہر حال میں مصدقہ اور غیر متنازع انتخابی فہرستیں تیار کی جائیں اور اس مقصد کے لیے الیکشن کمیشن کی سہل نگاری اور دست روی پر قابو پانے کے لیے ایک ڈیڈ لائن مقرر کر دی جائے۔ اس میں جبر کا پہلو کہاں نکلتا ہے؟ الیکشن کمیشن اگر نادرا کے ساتھ بروقت معاہدہ کر لیتا تو غلطیوں سے پاک انتخابی فہرستیں بہت پہلے تیار ہو چکی ہوتیں۔

جناب چیف الیکشن کمشنر نے بڑے طنطنے سے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ضمنی انتخابات روکنے کا عدالتی حکم غیر آئینی ہے اور عدالت کو الیکشن کمیشن کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں۔ یہ وقت بھی آنا تھا کہ عدالتِ عظمیٰ کے حکم نامے کو اسی عدالت کے ایک ریٹائرڈ جج غیر آئینی قرار دیں۔ دلیل ان کی یہ تھی کہ الیکشن کمیشن خود مختار ادارہ ہے اور کسی دوسرے ادارے کی مداخلت انارکی پھیلا سکتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ

www.paksociety.com

دستور نے تمام اداروں کو اپنے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرنے کا حق دیا ہے اور الیکشن کمیشن کو اپنے دائرہ اختیار میں کام کرتے رہنا چاہیے۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ موجودہ انتخابی فہرستوں پر ضمنی انتخابات نہ کرانے کا حکم انتہائی غیر آئینی ہے۔ بلاشبہ آئین تقسیم اختیارات کے فلسفے کا حامل ہے جس میں تمام ریاستی اداروں کے اختیارات و فرائض طے کر دیے گئے ہیں، مگر اس میں چیک اینڈ بیلنس کا نظام بھی قائم ہے۔ پارلیمنٹ قانون سازی کے علاوہ حکومت کی تشکیل کرتی اور اس کی کارکردگی پر نگاہ رکھتی ہے جبکہ عدلیہ ان دونوں اداروں کو اپنے دائرۂ اختیار سے تجاوز کرنے اور دستور کے تحت فرائض سے غفلت پر گرفت کرتی ہے۔ اس اعتبار سے اسے ایک بالادست ادارے کی حیثیت حاصل ہے اور اسی بنیاد پر وہ دستور کی محافظ سمجھی جاتی ہے۔ الیکشن کمیشن جس نے شفاف انتخابی فہرستوں کی تیاری میں جس مجرمانہ غیر ذمے داری سے کام لیا، اس پر عدالتِ عظمیٰ کی بازپرس اور یہ ہدایات کہ غلط اور غیر مصدقہ انتخابی فہرستوں پر ضمنی انتخابات نہ کرائے جائیں، دستور کی روح کے عین مطابق تھیں۔

جناب چیف الیکشن کمشنر نے تمام آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خودسری کا بھی مظاہرہ کیا اور بڑی تنگ مزاجی سے کہا کہ ۲۳ فروری تک انتخابی فہرستیں تیار نہیں ہو سکتیں اور حتمی فہرستوں کی منظوری سپریم کورٹ دے، ہم تو نہیں دے سکتے۔ ان کا یہ طرزِ عمل عدالتی ہدایات کی حکم عدولی میں آتا اور اداروں کے درمیان انتشار پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ مسلم لیگ (ن) کے سیکرٹری جنرل جناب ظفر اقبال جھگڑا نے مشاورتی اجلاس میں اس امر کی طرف درست نشان دہی کی ہے کہ سپریم کورٹ نے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ایک ڈیڈلائن مقرر کی ہے جس کا احترام ضروری ہے۔ قومی راہنماؤں کو الیکشن کمیشن سے یہ سوال پوچھنا چاہیے تھا کہ اس کی ۳ سالہ کارکردگی کیا ہے اور امریکہ نے انتخابی فہرستوں کی بروقت تیاری کے لیے جو ایک ارب دیے تھے، وہ کہاں استعمال ہوئے اور اس کے اعمال نامے میں کتنے خوش رنگ پھول ہیں۔ باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ انتہائی مایوس کن کارکردگی کے صلے میں بڑے پیمانے پر افسروں کو اگلے گریڈ میں ترقیاں دی گئی ہیں۔ کیا عوام کو یہ جاننے کا حق نہیں کہ ہمارا الیکشن کمیشن قومی وسائل کا کتنا بڑا حصہ اپنی طاقت اور جاہ و جلال پر خرچ کر رہا ہے؟ وقت اس کی نااہلی اور خودسری کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ قومی حلقوں میں یہ بات بھی زیرِ بحث ہے کہ انتخابی فہرستوں کی تیاری میں اس لیے تاخیر کی جا رہی ہے کہ وقت سے پہلے انتخابات نہ کرائے جا سکیں۔ ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے اعلیٰ سطح پر ایک تحقیقاتی کمیشن کا قیام ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

الطاف حسن قریشی

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اللہ کی سنّت کبھی تبدیل نہیں ہوتی

اقتدار کے ایوانوں، منتخب اسمبلیوں، ریاست کے اداروں اور سیاسی جماعتوں کے خفیہ اجلاسوں میں مفادات کی جو کشمکش جاری ہے، اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اور قدرت کا کیا فیصلہ آنے والا ہے

جب سے کائنات وجود میں آئی ہے، اللہ کی سنت میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوا اور اقوام عالم کا عروج و زوال اسی کے مطابق ترتیب پا رہا ہے۔ عزت و ذلت کے پیمانے طے شدہ ہیں جن کا اطلاق پچھلی امتوں پر بھی ہوا اور آنے والی نسلوں پر بھی ہوگا۔ یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ کسی قوم کی حالت اسی وقت بدلتا ہے جب اس کے اندر اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا شعور، داعیہ اور پختہ ارادہ بروئے کار آتا ہے۔ اسی لازوال سنت کی رو سے قیادت کے منصب پر وہی قومیں فائز ہوتی ہیں جو علم و تحقیق، علم و فنون، تسخیر کائنات اور اجتماعی شعور میں دوسروں پر سبقت لے جاتی ہیں۔ قدرت کا یہ بھی ایک اٹل اصول ہے کہ معاشرہ ظلم پر قائم نہیں رہ سکتا اور وہ لوگ آخر کار فنا ہو جاتے ہیں جن میں قانون کی حکمرانی اور انصاف کی فراہمی زوال پذیر ہوتی ہے اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے ایک ایسا بالادست طبقہ وجود میں آتا ہے جو غریبوں اور ناداروں کے حقوق سلب کرتا اور اپنے مفادات کی پرورش کے لیے تمام استحصالی ہتھکنڈے بروئے کار لاتا ہے۔ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اقوام اللہ کے غضب کی مستحق ٹھہری ہیں جن کے حکمران اپنے رب کی سرکشی پر اتر آئے تھے، فرعون اور ہامان بن بیٹھے تھے، اپنے آپ کو ہر قانون سے بالاتر سمجھنے لگے تھے اور اپنے سامان عیش و عشرت کے لیے خلق خدا کا خون چوستے تھے۔ اللہ کی سنت کے عین مطابق وہ معاشرے امن و سکون اور قلب و روح کی

آسودگی سے محروم رہتے ہیں جن میں اجتماعی فلاح و بہبود کے بجائے اونچے خاندان اور جاگیردار پوری طاقت کے ساتھ اس امر کا پورا اہتمام کرتے ہیں کہ عوام دو وقت کی روٹی کو ترستے اور غربت اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پاکستان کے بارے میں اللہ کی سنت کیا فیصلہ صادر کرے گی؟ اس مملکتِ خداداد کا رشتہ اُن آفاقی اصولوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے جن پر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک عظیم الشان اسلامی ریاست قائم کی تھی۔ اس نظریاتی تعلق کا معجزانہ اظہار اس تاریخی حقیقت سے ہوا کہ پاکستان ماہِ رمضان کی لیلۃ القدر میں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تھا جس کے بارے میں حضرت قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اسے عصرِ حاضر میں اسلام کی جدید تجربہ گاہ کا مقام حاصل ہو گا اور یہ ثابت کیا جا سکے گا کہ اسلام ہر زمانے میں پوری نوعِ انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرنے اور اسے امن و سلامتی سے ہمکنار کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس اعلان کی روح کے عین مطابق اُنہی کے دستِ راست وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے ۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد پیش کی جس کے ارکان کو انتخابات لڑنے کے لیے قائداعظم نے ٹکٹ جاری کیے تھے۔ ۱۲ مارچ کو یہ قرارداد منظور ہوئی جس کے متن میں درج ہے:

''چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود میں استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور یہ اختیارِ حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔''

''چونکہ پاکستان کے عوام کا منشا ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں ریاست اپنے اختیارات و اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔''

''جس میں اسلام کے وضع کردہ جمہوریت' آزادی' مساوات' رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر پوری طرح عمل کیا جائے گا۔''

''جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔''

''جس میں اقلیتوں کو آزادی کے ساتھ اپنے عقیدے پر قائم رہنے' اس پر عمل پیرا ہونے اور اپنی ثقافت کو فروغ دینے کے لیے قرار واقعی انتظامات کیے جائیں گے۔''

''جس میں قانون اور اخلاقِ عامہ کے تابع بنیادی حقوق کی ضمانت فراہم کی جائے گی جو حیثیت' مواقع اور قانون کے سامنے برابری' معاشرتی' معاشی اور سیاسی انصاف اور خیال کے اظہار' عقیدے' عبادت اور اجتماع کی آزادی پر مشتمل ہوں گے۔''

''جس میں عدلیہ کی آزادی پوری طرح محفوظ ہو گی۔''

''جس میں اقلیتوں' پس ماندہ اور پسے ہوئے طبقات کے جائز مفادات کے تحفظ کا قرار واقعی اہتمام کیا جائے گا۔''

ہمارے بیشتر مسائل اس قرارداد مقاصد پر عمل پیرا نہ ہونے سے پیدا ہوئے ہیں اور باہمی یگانگت اور آسودہ زندگی کی جگہ فرعونیت اور محاذ آرائی نے لے لی ہے۔

☆☆☆

حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا ایک شاخسانہ یہ تھا کہ ۱۹ جنوری کی صبح وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی گاڑی خود چلاتے اور جناب اعتزاز احسن اور سینیٹر رضا ربانی کی معیت میں سپریم کورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے۔ ان کے عقب میں ۵۰ سے زائد گاڑیوں کا قافلہ اور فضا میں دو ہیلی کاپٹر ان کی نگرانی پر مامور تھے۔ کورٹ روم نمبر ۴ حاضرین سے کھچا کھچ بھرا تھا جس میں ۲ صوبائی گورنروں، ۳ وزرائے اعلیٰ کے علاوہ ارکان کابینہ اور اتحادی جماعتوں کے زعما بھی شامل تھے، تاہم ایم کیو ایم نے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔ عدلیہ نے اسے ایک تاریخی دن قرار دیا کہ وزیراعظم قانون کی عدالت کے سامنے خود پیش ہوئے۔ جناب گیلانی نے اپنی صفائی میں کہا کہ سوئس حکام کو خط لکھنے کے سلسلے میں مجھے یہی مشورہ دیا جاتا رہا کہ چونکہ صدر مملکت کو استثنیٰ حاصل ہے اس لیے خط لکھنا آئین سے کھلا انحراف ہوگا۔ ان کے وکیل نے بھی کم و بیش یہی دفاع پیش کیا، تاہم وہ صدر کے استثنیٰ کو زیر بحث لانے سے حتی المقدور اجتناب کرتے رہے، لیکن فاضل جج جناب آصف کھوسہ اور جناب عثمانی نے اس بات پر اصرار کیا کہ جب عدلیہ کے احکام کی تعمیل میں آئین کی شق ۲۔۲۴۸ حائل ہے، تو اس پر دلائل دیجیے تاکہ عدالت کسی فیصلے تک پہنچ سکے۔ عدالت کا ماحول بہت خوشگوار تھا، جبکہ عدالت سے باہر وکلا کا ایک گروپ فاضل چیف جسٹس کے حق میں اور جناب اعتزاز احسن کے خلاف نعرہ بازی کرتا رہا جو پیشہ ورانہ اخلاقیات کے منافی تھی اور اس کی پرزور مذمت اور حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے ورنہ انارکی پھیل جانے کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ دن بظاہر جناب گیلانی کی فتح، لیکن ان کے وکیل جناب اعتزاز احسن کی داخلی ٹوٹ پھوٹ کا دن تھا کہ انھیں اپنے متعدد بار دہرائے ہوئے موقف سے انحراف کرنا پڑا تھا۔

پیپلز پارٹی نے ۴ سال اقتدار میں کچھ اس طرح گزارے ہیں کہ پارلیمنٹ جو جمہوری امنگوں کا مظہر ہوتی ہے، اسے حکمرانوں نے ربڑ اسٹمپ کے طور پر استعمال کیا ہے اور احتساب کے شکنجے سے بچنے کے لیے نیب کو عضوِ معطل بنا کر رکھا ہے جو مدتوں چیئرمین اور پراسیکیوٹر جنرل سے محروم چلا آرہا تھا۔ کلیدی مناصب پر نااہل، ناتجربے کار، دیانت و امانت سے ناآشنا اور من پسند افراد بٹھا دیے گئے۔ سیاسی سطح پر حزب اختلاف کی جماعتوں کے ساتھ آنکھ مچولی جاری رہی جس کے باعث بنیادی امور پر اتفاق رائے پیدا نہ ہو سکا۔ قومی اور عوامی ایشوز پر بالغ نظری اور یک سوئی سے منصوبہ بندی کرنے کے بجائے نمائشی اقدامات بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کیے جاتے رہے جس کے نتیجے میں ملکی سلامتی اور قومی وحدت پر آنچ آنے لگی۔ اس وقت بلوچستان ہمارا سب سے حساس مسئلہ ہے اور اہلِ نظر تواتر کے ساتھ خبردار کر رہے ہیں کہ وہاں مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور آزاد بلوچستان کی تحریک زور پکڑتی جارہی ہے جسے حکومت کی ناقص حکمت عملی، بے پروائی اور لاتعلقی کے علاوہ غیر ملکی عناصر بھی ہوا دے رہے ہیں۔ صدر جناب زرداری نے ایک بار اہل بلوچستان سے گزشتہ ناانصافیوں پر معافی مانگی تھی اور حکومت

نے آغازِ حقوقِ بلوچستان کا اعلان بھی کیا تھا، مگر اعلیٰ سیاسی قیادت نے احتجاج کا رُخ کرنے کی ہمت ہی گوارا نہیں کی۔ دور بیٹھ کر ہمدردی کا اظہار کرنے سے زخم بھر نہیں جاتے اور اخوت و یگانگت کے چشمے ابل نہیں پڑتے، چنانچہ بلوچوں اور غیر بلوچوں کی ٹارگٹ کلنگ جاری ہے، نوجوان پاکستان سے لڑنے کے لیے پہاڑوں پر چلے گئے ہیں اور حکومت کی رٹ حرفِ غلط کی طرح مٹتی جا رہی ہے۔ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا اور سب سے اسٹریٹجک اہمیت کا حامل صوبہ مسائل کی آگ میں جل رہا ہے اور پیپلزپارٹی کی قیادت چین کی بانسری بجا رہی ہے اور اقتدار کو طول دینے کے لیے نت نئے شگوفے کھلا رہی ہے۔

☆☆☆

دراصل اس پارٹی کو ہوسِ دولت کی طغیانیوں سے کام ہے اور اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ عوام کی کشتی مصائب کے دریا سے پار ہو یا درمیان رہے۔ وہ ۱۲ سال حرمِ اقتدار سے باہر حسرت بھری سسکیاں لیتی رہی اور جب حکومت کے سنگھاسن پر بیٹھی، تو اس نے خاک شدہ آرزوؤں کا حساب پورا کرنا شروع کر دیا۔ طے پایا کہ صرف وہی کام کیے جائیں گے جن سے نوٹ جھڑتے ہوں اور ڈالروں کی چمک آنکھیں خیرہ کر دیتی ہو، چنانچہ انہی منصوبوں کے پی سی ون منظور ہوئے جن سے کروڑوں روپے کی یافت ممکن تھی۔ اوپر سے نیچے تک ملکی وسائل بڑی بے دردی سے لٹائے جا رہے ہیں۔ اس لوٹ مار کو جاری رکھنے کے لیے عوام کی طاقت کا انتشار اور اضمحلال ضروری تھا، چنانچہ طے شدہ منصوبے کے تحت عام شہری زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور سہولتوں سے محروم کیے جا رہے ہیں۔ روزمرہ استعمال میں آنے والی اشیا کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی اور وہ ۷۰ فیصد آبادی کی پہنچ سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے تازہ ترین سروے کے مطابق عام آدمی کے لیے غذا کا حصول دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ توانائی کے بحران کی پیش بندی کرنے کے بجائے کمیشن کھانے کی ہوس میں رینٹل پاور اسٹیشن خرید لیے گئے جن سے ۳ سال میں ۱۰۰ میگاواٹ بجلی بھی حاصل نہ کی جا سکی۔ اس وقت کے پانی اور بجلی کے وزیر جناب راجہ پرویز اشرف نے تواتر سے یہ پبلک بیان دیا کہ بجلی کی لوڈشیڈنگ دسمبر ۲۰۰۹ء میں ختم ہو جائے گی، مگر اس میں کئی گنا اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اس پر وزیر موصوف کے ساتھ جناب وزیراعظم کو مستعفی ہو جانا چاہیے تھا، مگر وہ اقتدار سے جونک کی طرح چمٹے رہے۔ گیس کی لوڈشیڈنگ نے لاکھوں گھروں کے چولہے بجھا دیے اور صنعت کا پہیہ جام کر دیا ہے۔ لوگ خودکشی اور اپنے بچے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے اور ہولناک اندھیروں سے گھبرا کر سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ چشمِ فلک نے عوام کی اس قدر بے بسی اور زبوں حالی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

بلاشبہ ملکی معیشت پر دہشت گردی کے خلاف جنگ نے منفی اثرات ڈالے ہیں، لیکن اس کی بدحالی میں حکومت کی حد سے گزری ہوئی بدانتظامی اور شوقِ خودنمائی کا بہت عمل دخل ہے۔ ہمارے انتظامی اور فوجی اخراجات ہماری آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں اور ادائیگیوں کا توازن ہولناک حد تک بگڑتا جا رہا ہے، جبکہ ہمارے اربابِ اختیار اپنی آسائش اور اپنی نمائش پر ایک روز میں اربوں روپے لٹا رہے ہیں۔ ترقیاتی منصوبے جیبوں کے بھرنے کا سب سے آسان ذریعہ ہیں۔ پچھلے دنوں بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لیے روزانہ اربوں کے نوٹ چھاپے جاتے رہے جس پر اسٹیٹ بینک چیخ اٹھا اور اس نے اپنی سہ ماہی رپورٹ میں حکومت کے خلاف چارج شیٹ شائع کر دی۔

صدر محترم اور جناب وزیر اعظم کی شاہانہ روش یہ ہے کہ جو لوگ جیل اور ہسپتال میں ان کی خدمت کرتے رہے ' انھیں اعلیٰ مناصب بخش دیے جائیں ' چنانچہ میٹرک پاس شخص کو او جی ڈی سی کا ایم ڈی لگا دیا گیا جو توانائی کا سب سے نفع بخش اور اسٹریٹیجک اہمیت کا ادارہ ہے۔ ڈاکٹر عاصم جنھوں نے جناب آصف زرداری کی ضیاء الدین ہسپتال میں دیکھ بھال کی تھی' وہ پٹرولیم کے وزیر لگا دیے گئے جو اس کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ وہ آئے روز قوم کو مژدہ سناتے رہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں گیس کا سخت قحط پڑنے والا ہے۔ علی بابا اور چالیس چور لمیٹڈ کمپنی نے پاک ریلویز' پی آئی اے' پاک اسٹیل اور دوسرے نفع آور اداروں کا جو حشر کیا ہے' اس کا بڑا مقصد ملکی معیشت کی کمر توڑ دینا اور عوام کو نا ختم ہونے والی ابتلا میں دھکیل دینا ہے۔ ہمارے ارباب بست وکشاد کو صنعتی' زرعی' تعلیمی اور معاشی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں اور ان کا زیادہ تر وقت اپنے سہانے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے میں گزرتا ہے۔ ملک مفلوک الحال ہے' جبکہ ہمارے حکمرانوں کی پانچوں انگلیاں گھی اور سر کڑاہی میں ہے۔

☆☆☆

جناب آصف زرداری نے تاریخ سے ایک بڑا سبق یہ سیکھا ہے کہ دشمنوں کے بجائے دوست بنائے جائیں اور قتل کرتے وقت بھی مفاہمت کی کرامت دکھائی جائے۔ سیاسی مفاہمت کے نام پر جمہوریت نمبر گیم کے قالب میں ڈھال دی گئی ہے اور قومی اسمبلی میں بھاری اکثریت کا ایک سانچہ موجود ہے' چنانچہ ٹھوس بنیادوں پر حکومت کا نظم ونسق چلانے کے بجائے اپنے حلیفوں میں مفادات کے علاقے تقسیم کر دیے گئے ہیں۔ اے این پی بلا روک ٹوک اپنے صوبے میں رشوت کا بازار گرم کیے ہوئے ہے اور اُن کے وزیر ریلوے اربوں ڈالر ڈکار چکے اور اربوں روپے کے اُمیدوار ہیں۔ مسلم لیگ (ق) اس لیے حکومت کے دامن سے وابستہ ہوئی کہ جناب پرویز الٰہی اپنے بیٹے مونس الٰہی کو احتساب کے شکنجے سے آزاد کرانے اور خود سینئر وزیر بن جانے میں کامیاب ہوئے۔ ایم کیو ایم کو کراچی' حیدر آباد اور سکھر میں فری ہینڈ مل گیا ہے اور جہاز رانی کی وزارت ابھی اس کے تصرف میں ہے جو کمائی کا ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ فاٹا کے ارکان بھی وقتاً فوقتاً اپنی خدمات کا صلہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یوں جناب آصف زرداری نے حکمرانی کو ایک وسیع کاروبار میں تبدیل کر دیا ہے۔ جمہوریت کھلی سودے بازی، بھاری رشوت اور فردِ واحد کی آمریت میں ڈھل گئی ہے' جس میں اب عام آدمی کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے' ڈرون حملے اس کے جسم کے پرخچے اڑا رہے ہیں اور یہ مناظر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے شاید ناقابلِ برداشت ہوتے جا رہے ہوں۔

امریکی ڈرون حملوں کے خلاف سب سے پہلے' جماعت اسلامی' پھر مولانا فضل الرحمن اور عمران خاں نے آواز اُٹھائی' شہر شہر احتجاجی جلسے کیے اور وہ امریکہ کی جنگ کے خلاف گہری تشویش کا اظہار کرتے رہے۔ سیاسی سست روی کے تمام تر الزامات کے باوجود جناب نواز شریف پہلے سیاسی قائد ہیں جنھوں نے بلوچستان میں اُمنڈتے ہوئے خطرات کی سنگینی شدت سے محسوس کی۔ وہ کراچی میں سردار عطاء اللہ مینگل سے ملے اور اُن سے انتہائی سنگین صورتِ حال میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ معاملات میرے ہاتھ سے نکل چکے اور اب مذاکرات ان بلوچ نوجوانوں کے ساتھ کرنا ہوں گے جو پہاڑوں پر چلے گئے ہیں' تاہم اُن پر اس

ملاقات کا خاصا خوشگوار اثر مرتب ہوا اور انہوں نے بی بی سی پر انٹرویو دیتے ہوئے بلوچ نوجوانوں سے کہا کہ تمہیں یہ جائزہ بھی لینا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اس کا تحفظ کیونکر ممکن ہو گا" گویا وہ پیغام یہ دے رہے تھے کہ پاکستان ہی تمہارے لیے ایک محفوظ علاقہ ہے۔ اس کے بعد جناب نواز شریف بھری سردیوں میں کوئٹہ گئے اور انہوں نے بگٹی ہاؤس میں بلوچی عمائدین سے تفصیلی تبادلہ خیال کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ فوری طور پر اسلام آباد میں بلوچستان کے مسئلے پر ایک کل جماعتی کانفرنس کا انعقاد وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں کہا کہ اعتماد کے شدید بحران پر قابو پانے کے لیے دل اور دماغ جیتنے والے اقدامات میں تاخیر نہیں کی جانی چاہیے۔ ان کی طرف سے اسلام آباد میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان بھی ہوا جو حکومت کی طرف سے اٹھائے ہوئے ہنگاموں کی نذر ہو گیا' تاہم یہ امر قابل تحسین ہے کہ وہ بلوچستان اور سندھ کی نیشنلسٹ جماعتوں کو قومی دھارے میں لانے کی انقلابی سوچ پر عمل پیرا ہیں۔

☆☆☆

پونے چار کروڑ غیر مصدقہ ووٹوں سے منتخب ہونے والے ہمارے حکمران اقتدار پر اپنی گرفت قائم رکھنے کے لیے طرح طرح کے تنازعات اٹھاتے رہے اور عوام کے جذبات میں ہیجان برپا کرنے کے لیے پرکشش اعلانات کا سہارا لے رہے ہیں۔ جناب وزیراعظم نے سرائیکی صوبے کی تحریک میں صور پھونک دیا ہے اور ایم کیو ایم نے ہزارہ اور سرائیکی صوبوں کے قیام کے لیے قومی اسمبلی میں بل پیش کر دیا ہے جو مکروفریب میں ڈھلی ہوئی ایک سیاسی چال ہے۔ اس مسئلے پر مسلم لیگ (ن) اور جماعت اسلامی' پاکستان تحریک انصاف اور جمعیت علمائے اسلام (ف) اور مہاجر قومی موومنٹ حقیقی کا موقف بے حد مناسب اور غایت درجہ سائنٹیفک ہے۔ ان کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اچھی حکمرانی کے لیے ملک میں نئے صوبوں کا قیام ازبس ضروری ہے' مگر اس پیچیدہ اور انتہائی سنجیدہ کام کے لیے ایک قومی کمیشن قائم کیا جائے جو تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے جن پر آئین میں طے شدہ ضابطے کے مطابق عمل درآمد کیا جائے۔ جناب وزیراعظم یہ جو نعرہ لگا رہے ہیں کہ سرائیکی لوگ تخت لاہور سے آزادی چاہتے ہیں' اس میں سیاسی افراتفری پنہاں ہے۔ کچھ تجزیہ نگار اس خطرناک پہلو کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ایم کیو ایم سرائیکی اور ہزارہ صوبوں کی حمایت اس لیے کر رہی ہے کہ لسانی بنیادوں پر ان کے قیام سے صوبہ سندھ کی لسانی بنیاد پر تقسیم کا جواز پیدا ہو جائے گا اور یوں مہاجروں کا ایک علیحدہ صوبہ وجود میں آسکے گا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پنجاب کا صوبہ ہر اعتبار سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ترقیاتی کام ہو رہے ہیں اور اعلیٰ سطح پر کرپشن کا وہ عفریت دکھائی نہیں دیتا جو دوسرے صوبوں اور وفاق میں نظر آتا ہے۔ حکومت عوام کی فلاح و بہبود' تعلیم اور صحت کے فروغ پر توجہ دے رہی ہے اور امن و امان کی صورت حال بھی نسبتاً بہتر ہے۔ وزیراعلیٰ شہباز شریف صوبے کو عالمی معیار پر لانے کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں اور ترکی اور جرمنی سے رابطوں میں ہیں۔ ان کی دلی آرزو ہے کہ غریبوں کی حکمرانی قائم کی جائے اور ان کے گمبھیر مسائل اولین ترجیح کی بنیاد پر حل کیے جائیں۔ انہوں نے جنوبی پنجاب میں عوام کی سہولت کے لیے بڑے بڑے منصوبے شروع کر رکھے ہیں جن

میں سے بیشتر تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ یہ اُنہی کی سیاسی فراست اور دوراندیشی کا اعجاز تھا کہ این ایف سی ایوارڈ میں پنجاب نے اپنا حصہ کاٹ کر بلوچستان کے حصے میں اضافہ اور کوئٹہ میں ایک ہسپتال قائم کیا۔ وہ پورے پاکستان کے ذہین طلب کی حوصلہ افزائی کرنے کے علاوہ انہیں قیادت کے لیے موقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ اگر تنظیمی پر سرسوں جمانے کی خُو پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں، تو انہیں منتظمین کی ایک اچھی ٹیم دستیاب ہو سکتی ہے۔ اللہ کی سنت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہر مرحلے میں زیادہ سے زیادہ مشاورت سے کام لیا جائے اور میانہ روی اور خوش مزاجی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

☆☆☆

وہ حکمران جو اللہ کی سنت کا علم نہیں رکھتے، یہی سمجھتے ہیں کہ اقتدار و اختیار کے وہی مالک ہیں اور عوام کی حیثیت بھیڑ بکریوں کی سی ہے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت نے مصالحت میں منافقت کی آمیزش کر کے سیاسی جماعتوں کی ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کر رکھی ہے البتہ مسلم لیگ (ن) وفاقی حکومت کا حصہ نہیں۔ پچھلے دنوں میاں نواز شریف نے اعلان کیا تھا کہ وہ کرپٹ اور عوام دشمن حکومت سے جلد نجات پانے کے لیے لانگ مارچ بھی کر سکتے ہیں اور استعفوں کا آپشن بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں انہوں نے مشاورت کی خاطر اپوزیشن کے قائدین کا اجلاس طلب کیا جس میں گوہر ایوب، محمود خان اچکزئی، مولانا فضل الرحمٰن، پروفیسر خورشید احمد، سید منور حسن اور قاضی حسین احمد شریک ہوئے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہیے جو غیر سیاسی طاقت کو اقتدار سنبھالنے کا موقع فراہم کرے۔ مشاورت کے نتیجے میں جو اسلامی تعلیمات کا ایک انتہائی اہم عنصر ہے، ایک توازن پیدا ہوا اور یہ طے پایا کہ آئین اور قانون کی حدود میں رہتے ہوئے سیاسی جنگ لڑی جائے، جو حکمرانوں کو جلد اور شفاف انتخابات کا اعلان کرنے پر مجبور کر دے گی۔

اپوزیشن اور دوسرے عناصر کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے خلاف زرداری حکومت بڑی ہوشیاری سے پارلیمنٹ کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ اس نے جنوری کے تیسرے عشرے میں ایک نیم جاں سی قرارداد ایوان سے منظور کرائی جس کے ذریعے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ حکومت کو عظیم اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ اصل منصوبے کے مطابق وزیراعظم یہ چاہتے تھے کہ صدر اور وزیراعظم پر اعتماد کی قرارداد منظور کرائی جائے۔ جب انہوں نے اپنی حلیف سیاسی جماعتوں سے مشورہ کیا تو یہ تجویز سامنے آئی کہ بدلے ہوئے حالات میں صدر اور وزیراعظم پر اعتماد کی قرارداد منظور کرانا مشکل ہوگا، چنانچہ ان کی جگہ سیاسی قیادت پر اعتماد کے الفاظ قرارداد میں شامل کیے گئے اور اس امر پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ ادارے آئین کی حدود میں رہتے ہوئے کام کریں۔ ڈھائی سو سے زائد ارکان نے جن میں مولانا فضل الرحمٰن بھی شامل تھے، اس کی حمایت میں ووٹ دیے جبکہ مسلم لیگ (ن) اور جناب شیر پاؤ نے واک آؤٹ کیا۔ وزیراعظم اس کامیابی پر بہت خوش تھے، مگر انہیں شاید یہ احساس نہیں ہوا کہ جس ایوان میں وہ تمام اراکین کی تائید سے لیڈر منتخب ہوئے تھے، اس حمایت میں خاصا بڑا شگاف پڑ چکا ہے۔

☆☆☆

این آر او کیس اور میمو ایشو ہماری قومی زندگی پر بڑی قوت سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ایک کا تعلق اس جنگ سے ہے جو گزشتہ چار پانچ سال سے ایگزیکٹو اور عدلیہ کے مابین جاری ہے۔ دوسرے کا رشتہ سول ملٹری تعلقات میں آنے والے بھونچال سے ہے۔ ان کی تخلیق ایک مائنڈ سیٹ نے کی ہے اور یہ مائنڈ سیٹ ہمارے بے لگام اور مطلق العنان حکمرانوں کا ہے۔ این آر او صدر مشرف نے ۵ر اکتوبر ۲۰۰۷ء کی رات جاری کیا تھا جنھیں صدارتی انتخاب لڑنے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے محترمہ بے نظیر کی حمایت درکار تھی۔ دونوں شخصیتوں کو 'ڈیل' کے رشتے میں پرونے کے لیے امریکہ نے بہت فعال کردار ادا کیا تھا۔ سابق وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس نے اپنی کتاب میں ایک ایک لمحے کی تفصیل بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ۳ر اکتوبر کی پوری رات اُن کی براہ راست بے نظیر بھٹو اور جنرل مشرف کے ساتھ مصالحتی گفتگو میں گزری اور صبح کے وقت ان کے مابین اتفاق رائے پیدا ہوا کہ جنوری ۱۹۸۶ء سے ۱۲ر اکتوبر ۱۹۹۹ء تک بدعنوانی، اغوا اور قتل کے جو بھی مقدمات سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کے خلاف قائم کیے گئے تھے، وہ سب ختم کر دیے جائیں گے۔ بادی النظر میں این آر او قومی دولت کے لٹیروں، قاتلوں اور چوروں کو تحفظ فراہم کرنے والا کالا قانون تھا جو سپریم کورٹ میں چیلنج ہوا۔ فاضل عدالت نے اپنی معاونت کے لیے معروف قانون دانوں کی خدمات حاصل کیں اور کئی روز کی سماعت کے بعد اس کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔ جنرل پرویز مشرف نے ۳ر نومبر کی سہ پہر ایمرجنسی نافذ کر ڈالی اور جج صاحبان برطرف اور گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری سے پہلے عدالت عظمیٰ کے ۹ر جج صاحبان نے ایک حکم جاری کیا کہ جو شخص بھی پی سی او پر حلف اُٹھائے گا، وہ آئین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا۔

فاضل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی جگہ جناب عبدالحمید ڈوگر چیف جسٹس مقرر ہوئے جنھوں نے این آر او کے خلاف حکم امتناعی ختم کر دیا جس کے نتیجے میں ۸ر ہزار سے زائد مقدمات واپس لے لیے گئے۔ اس دوران اٹارنی جنرل ملک عبدالقیوم نے کمال عجلت میں سوئس حکام کو خط لکھا کہ ریاست پاکستان سوئس عدالتوں میں بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کے خلاف چلنے والے مقدمات میں سول پارٹی کی حیثیت سے علیحدگی کا اعلان کرتی ہے۔ یہ خط اُنھوں نے مجاز اتھارٹی کی اجازت کے بغیر بھیجا تھا۔ مقدمے کی نوعیت یہ تھی کہ سوئس حکام نے ان دونوں کے خلاف منی لانڈرنگ میں ۶۰ر ملین ڈالر کا سراغ لگایا تھا اور عدالت میں ان کے بارے میں تفتیش جاری تھی، ایک مرحلے پر سزا بھی سنا دی گئی تھی اور ۶۰ر ملین ڈالر منجمد کر دیے گئے تھے۔ ایک مرحلے پر پاکستان کی ریاست نے اس مقدمے میں سول پارٹی بننے اور منجمد رقم پاکستان کے عوام کو منتقل کرنے کی درخواست دی۔ جناب ملک عبدالقیوم کی طرف سے خط کے بعد وہ منجمد رقم ریلیز کر دی گئی اور اس مقدمے کی پیروی میں حکومت جو قانونی معاونت فراہم کر سکتی تھی، وہ غیر مؤثر ہو گئی۔ یوں پاکستان کے عوام ایک خطیر رقم سے محروم ہو گئے تھے، جبکہ اس مقدمے کے بند ہو جانے سے جناب زرداری منصب صدارت پر جلوہ افروز ہونے میں کامیاب رہے۔ اسی دوران ۱۵ر مارچ کی دوپہر میاں نواز شریف کی قیادت میں لانگ مارچ شروع ہوا تو آرمی چیف جنرل کیانی کی مداخلت پر جناب صدر زرداری تمام جج صاحبان کی بحالی پر طوعاً و کرہاً مجبور ہو گئے اور اُنھیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ عدلیہ اور فوج ان کے

www.paksociety.com

اقتدار کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد کیری لوگر بل کا تنازع اور این آر او پر عدالت عظمیٰ کا فیصلہ حشر بداماں ثابت ہوا۔

☆☆☆

این آر او محض ایک مقدمہ نہیں' اس کے پیچھے غلط بیانی' فریب کاری' چالبازی' عدالت کی بے حرمتی اور ایگزیکٹو کی منہ زوری کی ایک ہوشربا داستان ہے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کی آئینی درخواست پر ۷ دسمبر ۲۰۰۹ء کو این آر او مقدمے کی فل کورٹ نے سماعت شروع کی جو ایک ہفتے سے زائد جاری رہی۔ حکومت کی طرف سے جناب کمال اظفر پیش ہوئے جو ایک بڑے وکیل ہونے کے علاوہ گورنر سندھ بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ڈرامائی انداز میں انکشاف کیا کہ این آر او ہمارے خلاف ایک سازش ہے' جو جی ایچ کیو کر رہا ہے۔ ان کے افکار عالیہ پر جب شور اٹھا تو اگلے روز انہوں نے وضاحت فرمائی کہ یہ میرے ذاتی خیالات تھے۔ انہوں نے فاضل عدالت سے این آر او کو اجراء کے دن ہی سے غیر آئینی قرار دینے کی درخواست کی کہ حکومت اس کے دفاع کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی' لہٰذا ۱۷ رکنی بینچ نے این آر او کو یوم اجراء سے غیر قانونی قرار دیا اور یہ حکم صادر کیا کہ وہ خط فوری طور پر واپس لیا جائے جو اٹارنی جنرل ملک عبدالقیوم نے مجاز اتھارٹی کی اجازت کے بغیر سوئس حکام کو لکھا تھا تاکہ عوام کے لوٹے ہوئے ۶۰ ملین ڈالر پاکستان لائے جا سکیں جو اس مقدمے میں ایک سول پارٹی ہے۔ حکومت نے فیصلے پر عمل کرنے کے بجائے عذر تراشا کہ تفصیلی فیصلے سے پہلے کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔ جنوری ۲۰۱۰ء میں تفصیلی فیصلہ بھی آ گیا اور اس وقت کے اٹارنی جنرل نے کہا کہ سوئس حکام کو خط لکھا جانا چاہیے۔ حکومت نے پے در پے دو اٹارنی جنرل فارغ کیے' جبکہ قانون کے ۲ وفاقی سیکرٹری' نیب کے چیئرمین اور پراسیکیوٹر جنرل بھی اس کے عتاب کی نذر ہو گئے۔ اس سرجیکل آپریشن کے دوران وزیر قانون جناب ڈاکٹر بابر اعوان کی طرف سے یہ نکتہ اٹھایا گیا کہ فاضل عدالت نے چونکہ حکومت کا موقف سنا ہی نہ تھا' اس لیے ہماری طرف سے نظرثانی کی اپیل دائر کی جائے گی۔ یہ ایک ایسا جھوٹ تھا جو وہی لوگ بول سکتے ہیں جو اخلاقی گراوٹ کی انتہا کو پہنچ گئے ہوں۔

اس لیت و لعل کا اصل مقصد سوئس حکام کو خط لکھنے میں زیادہ سے زیادہ تاخیر روا رکھنا تھا' تاکہ پاکستان سول پارٹی کی حیثیت سے ۶۰ ملین ڈالر حاصل نہ کر سکے۔ حکومت نے فاضل عدالت کی حکم عدولی کرتے ہوئے جناب طارق کھوسہ' جناب ظفر قریشی اور جناب سہیل احمد کے لیے ایسے حالات پیدا کیے کہ ان کے لیے اپنے فرائض منصبی ادا کرنا اور عدالت کی ہدایات پر عمل پیرا ہونا جان جوکھوں کا مسئلہ بن گیا۔ عدالت عظمیٰ قومی اداروں کو تباہی سے بچانے کے لیے بدعنوان افسروں اور بااثر شخصیتوں سے لوٹی ہوئی دولت قومی خزانے میں جمع کرانے اور انہیں قانون کی گرفت میں لانے کے لیے احکام جاری کرتی اور اربوں وصول کرنے میں کامیاب بھی رہی' لیکن حکومت کی سرتوڑ کوشش یہی تھی کہ احتساب کا نظام نتیجہ خیز نہ ہونے پائے۔ ایگزیکٹو کی تمام تر سرکشی اور بدنیتی کے باوجود عدالت عظمیٰ نے حیرت انگیز قوت برداشت کا مظاہرہ کیا۔ وہ منتخب حکومت کو اپنی اصلاح کا پورا موقع فراہم کرنا اور سیاست میں فوج کا راستہ مستقل طور پر بند کرنا چاہتی تھی۔ اس نے تاریخ ساز فیصلے دیے کہ آئندہ کسی فوجی بغاوت کو حکمرانی کی

www.paksociety.com

سند جواز فراہم نہیں کی جائے گی اور دستور توڑنے والوں کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلے گا۔ جج صاحبان کی قومی اور جمہوری خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے بجائے حکومت نے ان کے ساتھ اہانت آمیز طرز عمل اختیار کیے رکھا۔ ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۱ء کے سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ نظر ثانی کی اپیل ایک مذاق کے سوا اور کچھ نہیں تھی' کیونکہ اس کی سرے سے کوئی ٹیکنیکل بنیاد ہی موجود نہ تھی۔ بابر اعوان پیش ہوئے اور قانونی نکات پر بحث کرنے کے بجائے سیاست گری کرتے رہے۔ اپیل مسترد ہوگئی اور ۷ رکنی بینچ نے فیصلے پر عمل درآمد کا ایک بار پھر حکم صادر کیا جسے مذاق میں ٹال دیا گیا اور طنز کے تیر بھی برسائے جاتے رہے۔

سپریم کورٹ نے این آر او پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لیے فاضل جسٹس آصف کھوسہ کی سربراہی میں ایک ۵ رکنی بینچ تشکیل دیا جس نے جنوری کے پہلے عشرے میں حکومت کا موقف کامل توجہ اور تحمل کے ساتھ سننے کے بعد فیصلہ سنایا کہ حکومت این آر او کے عدالتی فیصلے پر عمل درآمد میں ناکام رہی ہے' جبکہ صدر مملکت اور وزیر اعظم اپنے حلف کی پاسداری نہیں کر سکے اور بادی النظر میں جناب وزیر اعظم دیانت دار اور امین بھی نہیں رہے۔ فاضل بینچ نے ایک لارجر بینچ تشکیل دینے کی استدعا کی اور اس کی راہنمائی کے لیے ۶ آپشن تجویز کیے۔ چوتھا آپشن یہ تھا کہ عدالت کے سامنے صدر کے استثنیٰ کا معاملہ کبھی نہیں اٹھایا گیا اور اگر کوئی صاحب استثنیٰ کے دعوے دار ہیں' تو وہ عدالت میں درخواست دیں تاکہ اس کا فیصلہ کیا جا سکے۔ لارجر بینچ نے ۱۶ جنوری کو این آر او کے فیصلے پر عمل درآمد کی سماعت شروع کی اور اٹارنی جنرل کی آمد کا انتظار کیا۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے آئے اور فرمانے لگے کہ مجھے صدر اور وزیر اعظم کی طرف سے رات کے ۲ بجے تک ہدایات موصول نہیں ہوئیں' اس لیے حکومت کا موقف پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ فاضل عدالت نے انہیں وزیر اعظم سے رابطے کے لیے ۲۰ منٹ دیے، مگر وہ ناکام لوٹے، اس لیے وزیر اعظم کے نام توہین عدالت کے اظہار وجوہ کا نوٹس بھیجنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ عدالت نے سید یوسف رضا گیلانی کو ۱۹ جنوری کی صبح عدالت میں پیش ہونے کا حکم صادر کر دیا۔ ایک روز پہلے چیئرمین نیب ایڈمرل (ر) فصیح بخاری نے عدلیہ کے حضور غیر مشروط معافی مانگ لی اور تعمیل احکام کی یقین دہانی کروائی۔ ۱۷ جنوری کی صبح عدالت عظمیٰ کے ایک سہ رکنی بینچ نے جس کی سربراہی فاضل چیف جسٹس فرما رہے تھے' توہین عدالت میں ڈاکٹر بابر اعوان کی وکالت کا لائسنس عارضی طور پر معطل کر دیا۔ اعوان صاحب دادرسی کے لیے سیدھے ایوان صدر پہنچے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق صدر مملکت نے عدالت عظمیٰ کا سر خم کرنے کے لیے انہیں وزیر قانون بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا، مگر جناب وزیر اعظم راہ میں حائل ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ وہ حلف برداری کی تقریب میں شریک نہیں ہوں گے۔

☆☆☆

اس نازک مرحلے پر جناب اعتزاز احسن اپنی وضع داری کے ہاتھوں جناب وزیر اعظم کا مقدمہ لڑنے پر آمادہ ہوئے' مگر اپنی شخصیت اور عظمت پر مصلحت کیشی کا داغ لگا بیٹھے۔ وہ دراصل ایک ایسے مائنڈ سیٹ کی حمایت میں آن کھڑے ہوئے ہیں جو عدلیہ کی آزادی' اس کے وقار اور اس کے احترام کا سرے سے قائل ہی نہیں۔ کیا وہ گزشتہ

چار پانچ برسوں سے عدالتِ عظمیٰ کی گت بنتے نہیں دیکھ رہے اور کیا وہ محسوس نہیں کرتے کہ ایگزیکٹو اتھارٹی قانون اور آئین کے تقاضے کھلے بندوں پامال کر رہی ہے اور عوام کے بنیادی مسائل سے یکسر غافل ہے؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ این آر او کے فیصلے پر آپ کا اپنی قیادت سے بنیادی اختلاف تھا جس پر جناب آصف زرداری نے سنٹرل کونسل کی رکنیت معطل کر دینے کے بعد آپ کو مشاورتی عمل سے الگ تھلگ کر دیا تھا؟ کیا آپ بار بار یہ نہیں فرماتے تھے کہ عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے کی رو سے حکومت کو سوئس حکام کو خط لکھنا پڑے گا جبکہ جناب صدر زرداری اسے بے نظیر بھٹو کی قبر کے ٹرائل سے تعبیر کرتے اور سرِ عام کہتے رہے کہ میری صدارت کے بعد ہی خط لکھا جائے گا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جناب وزیرِ اعظم نے جوشِ خطابت میں یہ بھی فرمایا تھا کہ میں اپنی پارٹی کے موقف کا ساتھ دوں گا؟ کیا انہوں نے یہ بھی ارشاد نہیں کیا تھا کہ فوج اور عدلیہ جمہوریت کو پٹری سے نہیں اتار سکتے؟

جناب اعتزاز احسن ایک زیرک وکیل اور روحِ عصر کے شناسا دانش ور ہیں، مگر ان کی یہ بات قانونی اور سیاسی حلقوں میں پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے کہ وہ اکیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں اس تصور کی وکالت کیوں کر رہے ہیں کہ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ آپ جو فوجداری مقدمات میں صدر کے استثنیٰ کی بات کر رہے ہیں، اس کا واضح مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ صدر ہر جرم کے ارتکاب کا حق رکھتے ہیں۔ اسلام اس جاہلانہ تصور کی نفی کرتا ہے اور اس کی اعلیٰ تعلیمات کی رو سے ہر فرد آئین اور قانون کا پابند ہے۔ قراردادِ مقاصد جو ہمارے آئین کا ایک لازمی حصہ ہے، اس میں بھی قانون کے سامنے برابری اور عدلیہ کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ ہمارے دستور کے آرٹیکل ۲۵ میں یہی اصول کامل وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ صدر کے استثنیٰ کا آرٹیکل ۱۹۵۶ء کے دستور میں شامل نہیں تھا جو عوام کے نمائندوں نے منظور کیا تھا۔ استثنیٰ کی شق پہلی بار فیلڈ مارشل ایوب خاں نے ۱۹۶۲ء کے دستور میں شامل کی تھی جنہیں ہر آن یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ایک روز سیاست دان آئین توڑنے پر ان کا ٹرائل کریں گے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ شق ایک آمر کے دستور سے لی گئی ہے جسے سیاست اور قانون کے جدید تصورات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بیرسٹر اعتزاز احسن یہ بھی فرما رہے ہیں کہ استثنیٰ کے آرٹیکل کی رو سے ملک اور ملک سے باہر کی عدالتوں میں بھی صدر کو استثنیٰ حاصل ہے۔ بادی النظر میں ان کا فرمان بڑا عجیب لگتا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے ویانا کنونشن کے بعد منی لانڈرنگ کے معاملات میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں اور عالمی برادری سوئس بینکوں میں جمع شدہ رقوم ان کے ملکوں میں منتقلی کے قوانین وضع کر چکی ہے اور عالمی احتساب کا بھی ایک نظام وجود میں آ رہا ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ جناب اعتزاز احسن وضع داری نبھانے کی خاطر پاکستان کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالیں اور اس قافلۂ عشاق میں شامل رہیں گے جو اقتدار کو ایک مقدس امانت سمجھتا ہے، عدلیہ کی طاقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اور انصاف کا ساتھ دینے میں ایک گونہ فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ کلیدی معاملات ہیں جن میں اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

www.paksociety.com

اردو ڈائجسٹ
ارفع کریم پر شائع ہونے والی پہلی جامع اور مفصل رپورٹ
ارفع نے آخری الفاظ کیا ادا کیے؟
بیٹی کے کھو جانے پر اداس ہوں، مایوس نہیں، اُس کا نام زندہ رہے گا
اندر بھی زمیں کے روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے
ارفع کریم
چھوٹی عمر میں بڑی کامیابی
دُور کا سوچنے والی دور جا نکلی
اختر عباس
www.Paksociety.com

بڑی

سوچ کو مالک الملک کی طرف سے بڑی خیر پڑتی ہے یا بڑے خواب کو بڑی تعبیر ملتی ہے۔ فیصلہ کرنا مشکل ہے کیونکہ ۲ رفروری ۱۹۹۵ء کو پیدا ہونے والی بڑی بڑی آنکھوں والی اس بچی کو جب دادا نے اپنے ہاتھوں پہ اٹھایا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکلا ارفع......

بیٹیوں بیٹوں میں سے کسی نے دھیرے سے کہا ''کیا مطلب؟'' دادا نے پورے لاڈ اور مان سے کہا ''ارفع و اعلیٰ والی ارفع۔'' میرا دل کہتا ہے، یہ بچی اسم با مسمیٰ ہوگی۔

اس قدر محبت سے سوچنے اور نام رکھنے والے دادا چودھری عبدالکریم رندھاوا تھے۔ فیصل آباد کے ایک گاؤں رام دیوالی کے مکین۔ اپنی پوتی کی زندگی کے صرف ۳۰ روز ہی دیکھ سکے تھے کہ خالق کا بلاوا آگیا اور وہ سعید روح واپس چلی گئی۔ عجیب بات ہے لوگ انھیں نام سے کم اور ''توسرا'' یعنی تو سر والے کے نام سے زیادہ جانتے تھے۔ ایک ایسا زمیندار جو آزادی کی لڑائی میں پوری طرح سرگرم رہا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کی مہم میں شریک، ریلوے اسٹیشن پر قائداعظم ایک دورے کے دوران دروازے پر آئے تو پُرجوش ہجوم بے قابو ہوگیا۔ قائد کے سر سے ٹوپی نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ تبھی عبدالکریم نے بھاگ کر اسے سنبھالا اور پھر اپنے سردار و قائد کے سر پر سجا دی۔ چودھری عبدالکریم کی سوچ باقی لوگوں سے بہت مختلف اور آگے کی تھی۔ گھر میں نوائے وقت اور اردو ڈائجسٹ باقاعدگی سے آتے اور وہ اپنی تینوں بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے کو پڑھ پڑھ کر سناتے۔ پڑھنا پڑھانا اتنا پسند تھا کہ بیوی بیاہ کر لائے تو اسے بھی پڑھنے ڈال دیا۔ گاؤں کی لڑکی کو شادی کے بعد میٹرک کروایا۔ جے وی کروایا اور ٹیچر بنا دیا۔ اس نیک بخت نے میاں کا شوق دیکھا تو زمیندار کی روایتی بیوی اور چودھرائن بننے کے بجائے استاد بننے اور دوسروں کے بچوں کو اچھے انسان بنانے کا کردار سنبھال لیا۔ میاں بیوی کو اخبار، رسالے، کتابیں پڑھتے دیکھا تو بچوں کو بھی یہی طرزِ زندگی پسند آگیا۔

ارفع کی پھوپھو انجم النساء جو اسلام آباد میں سوشیالوجی کی پروفیسر ہیں، جب بیٹھک سے لے کر مجھے ارفع کے بیڈروم میں لے جا رہی تھیں تو میرے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ اندر جا کر مجھے یقین ہو جائے گا کہ دادا کی روح پوتی میں اتنا عرصہ جیتی رہی تھی۔ ارفع کے آرام دہ بیڈ کے ساتھ رکھے میز پر کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد سے کسی کا ان کی طرف دھیان بھی نہیں گیا۔ وہاں کلام اقبال تھا، بلھے شاہ کے کلام کی ہنگھو والی خوب صورت کتاب تھی، سرفراز شاہ کی کہے فقیر، فیض کا نسخہ ہائے وفا اور سٹیفن آرکووے کی کتاب Principal Centered Leadership جگہ جگہ سے نشان زدگی ہوئی پڑی تھی۔ خوب ذوق اور شوق سے پڑھی ہوئی یہ کووے کی بہترین کتاب اور بڑے بڑے کارپوریٹ لیڈروں کی پسندیدہ اور محبوب تحریر مانی جاتی ہے۔

ارفع کون تھی، کیا تھی جو ایک دنیا اس کے لیے فکرمند تھی۔ اس کی بیماری کے دوران، اس کے جنازے پر، اس کی وفات کے بعد، اب تک اس کا ذکر ہونا کم نہیں ہوا۔ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی سے لے کر وزیراعلیٰ شہباز شریف تک، صوبائی وزرا سے لے کر مرکزی وزیر اطلاعات تک، سیاسی جماعتوں کے سربراہ، کارکنان، ماہرین تعلیم، اخبار نویس، اخباری صفحات، ٹی وی چینلز ہر جگہ اس کی ذہانت، اس کی سمجھداری، اس کے اعتماد کا تذکرہ ہے۔ اسے پاکستان کا اصل جوہرِ قابل کہا جا رہا ہے۔ کہیں اس کے خوابوں کو زندہ رکھنے کے وعدے ہو رہے ہیں۔ کہیں اس کے نام پر آئی ٹی یونیورسٹی بنانے کے اعلان فضا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس کی یاد میں ڈاک ٹکٹ بھی جاری کر دیا ہے۔ اس پر فلم بنانے، کتاب لکھوانے اور ملک کا اعلیٰ ترین سول اعزاز دلوانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

ایسے میں یہ جاننا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دیہی خاندان سے تعلق رکھنے والی یہ لڑکی پاکستان بھر کی آنکھ کا تارا کیسے بن گئی۔ نئی نسل نے اس کو اپنا آئیڈیل کیونکر قرار دے لیا۔ وہ اتنا عمدہ کیسے سوچ لیتی تھی۔ اس نے رشتوں کو کس قدر محبت سے سنبھال کر رکھا۔ وہ خود اعتمادی کی دولت سے اس قدر آسودہ کیسے ہوئی۔ ارفع نے ایک بار اپنے انٹرویو میں کہا:

''اگر آپ زندگی میں کچھ بڑا کام کرنا چاہتے ہیں تو یاد رکھیں اپنی جھجک (Shyness) پر قابو پانا ہوگا۔ شائی نیس صرف انسانی ذہن کے اندر ہوتی ہے۔ اگر آپ کی سوچ میں یہ شامل ہے تو آپ شرمیلے بن جاؤ گے اور اگر آپ کی سوچ میں اعتماد ہے تو آپ اپنے کاموں میں بااعتماد اور پر اعتماد بن جائیں گے۔ لہٰذا شرمیلے پن کو بھی اپنے ذہن پر حاوی نہ ہونے دیں۔''

ارفع کی والدہ کو اس کی آواز اور محبت پسند تھی۔ وہ اکثر اس سے فرمائش کرتیں، ارفع بیٹے کچھ سنا دو تو وہ اپنی ماں کے جذبات سمجھتے ہوئے انھیں نعت سنا دیتی۔ اللہ نے اسے بہت ہی کمال ذہن کے ساتھ ساتھ بے حد عمدہ آواز سے بھی نوازا تھا۔ اس کی والدہ کو نور جہاں کے پرانے گیت اچھے لگتے تو وہ ''گانے کی دنیا گیت میرے'' گنگنانے لگتی۔ والدہ کہتی رہتیں بیٹا ارفع! تم گھر میں پڑھتی نظر نہیں آتی، تو کہتی میں جو سکول میں پڑھتی اور لیکچر سنتی ہوں وہ پوری توجہ اور یکسوئی سے سنتی ہوں۔ وہ میرے ذہن میں نقش ہو جاتا ہے۔ مجھے دوبارہ پڑھنے کی حاجت نہیں رہتی۔ کلاس میں اس کی توجہ کا یہ عالم ہوتا کہ وہ صرف استاد کو ہی دیکھتی اور سنتی۔ کوئی لفظ ضائع نہ ہونے دیتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ استاد کسی بات پر اٹک جاتے اور کلاس کے درمیان سوچ میں پڑ جاتے تو ارفع کسی موزوں حل کی طرف بڑی آسانی کے ساتھ اشارہ کر دیتی۔

بڑی پھوپھو انجم اسے برقی کہتیں۔ ان کے بچے اسلام آباد سے فون پر ارفع سے اپنی کلاسز کے مسائل پوچھتے پھر حیرت سے اپنی ماں سے کہتے اماں! یہ کیا چیز ہے۔ ایسے آسانی سے سمجھا دیتی ہے کہ ہم جتنوں لگے

رہیں تو اس طرح تفہیم نہیں کر سکتے۔

ارفع کی دادی کا یقین تھا ''یہ پڑھ بیٹے گی، کچھ بڑا کام کرے گی۔'' ارفع نے اپنی محبت کرنے والی دادی کا مان نہیں توڑا۔

۵ سال کی عمر میں جب اس نے پہلی بار کمپیوٹر دیکھا تو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ پھر بعد میں اپنے اس تجربے اور مشاہدے کے بارے میں اس نے کہا ''یہ خوب جادو ہے بٹن دباؤ تو ڈبے کے اوپر جادو کی سی چیز نمایاں ہو جاتی ہے۔''

اس جادو کے ڈبے کو سمجھنے پر اس نے توجہ کی، اس پر غور کیا۔ اس عمر میں بچے کہاں توجہ کرتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس کے ابو جب اسے فیصل آباد ایک کمپیوٹر سنٹر پر لے گئے اور بتایا کہ میری بچی کو کمپیوٹر کا بہت شوق ہے، اسے داخل کر لیں تو کمپیوٹر سنٹر والوں نے کہا ''ہم بچوں کو داخل نہیں کرتے۔''

والد نے اصرار کیا۔ ''آپ اس سے مل لیں بات کر لیں اگر بات سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ورنہ ہم واپس چلے جائیں گے۔'' ایک ۸ سال کی بچی کی ذہانت اور سمجھداری نے انھیں حیران کر دیا۔ ٹیچر سہیل نے اس حیران کرنے والی بچی کو اپنا شاگرد بنا لیا اور پھر جلدی ایک حیرت نے پاکستان ہی نہیں پاکستان سے باہر بھی لوگوں کو آن لیا کہ ۹ سال کی ایک لڑکی ارفع کریم جسے بہت سے لوگ عارفہ کریم لکھتے اور پڑھتے رہے، نے مائیکروسافٹ کی سرٹیفائیڈ پروفیشنل کا امتحان اعلیٰ درجے میں پاس کر لیا۔ والد نے یہ خبر دنیائے کمپیوٹر کے شہ دماغ اور مائیکروسافٹ کے بانی بل گیٹس تک پہنچانے کی کوشش کی تو وہاں کی بندہ لائن آڑے آگئی۔ وہ ماننے پر تیار ہی نہ تھے کہ ۹ سال کی پاکستانی بچی اتنا بڑا کام کر سکتی ہے۔ باپ نے ہمت نہیں ہاری اور کہا آپ ایک بار بچی سے مل لیں، انٹرویو کر لیں۔ اگر بات سمجھ میں آگئی تو فبہا، ورنہ میرا اصرار نہیں رہے گا۔ مائیکروسافٹ والوں نے ایک بندہ کراچی آفس سے اور دوسرا سنگاپور سے بھجوایا۔ ملاقات بے یقینی کی حالت میں شروع ہوئی۔ انھوں نے انٹرویو ہی نہیں کیا بلکہ

سرٹیفکیٹس کا پورا فیسٹ دوبارہ دے لیا۔ ہر سوال پر دونوں میں انگلیاں داب لیتے۔

کسی بچی کو خدا اس قدر ذہانت اور حافظہ بھی دے سکتا ہے۔ وہ ایک شکرگزار اور قانع باپ کی بیٹی تھی جو زندگی میں بہت پیسے نہیں کمانا چاہتا تھا۔ تب وہ فوج میں میجر تھا اور جگہ جگہ اس کے ٹرانسفر ہوتے رہے۔ مگر وہ اپنی بیٹی کی پرورش اور فکرِ تربیت سے غافل نہ تھا۔ وہ دل سے سمجھتا تھا کہ یہ بیٹی نہیں خدا کا عطیہ ہے۔ اس کو سکھانا پڑھانا اور سب سے عمدہ سکھانا مجھ پر واجب ہے۔

''ارفع میری بیٹی نہیں میرا بچہ ہوا کرتا تھا۔'' کرنل امجد کریم رندھاوا نے بڑی معصومیت سے بتایا تھا ''میری زندگی کے سارے خواب اس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اسے لیڈر بنانے، اسے نئی نسل کا رول ماڈل بنانے، اسے اقبال کا شاہین اور عاشقِ صادق بنانے۔ وہ اقبالؒ کے اشعار پڑھتی اور سمجھتی۔ کبھی کبھی ان اشعار کے معنی و مفہوم پر غور کرتے کرتے ہم دونوں کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ اسے میں نے ''بلھے شاہ'' یاد کروایا، تفسیر المعانی، اللہ میاں تھلّے آ، کے فقیر۔ جو جو کتاب مجھے اچھی لگتی اسے لا کر دیتا اور وہ اسے پڑھ ڈالتی۔ اسے ایک ایک بات یاد رہتی۔ جب جہاں ضرورت پیش آتی وہ Reproduce کر دیتی۔''

والدہ نے لقمہ دیا ''آپ کو پتا ہے کتنے ہی انکل اس کے شکرگزار تھے کہ ان کے CV وہ بناتی تھی۔ جن جن کو جاب ملی وہ کہتے تھے۔ اس کا شکریہ بہت دیر ادا نہیں ہو سکے گا۔''

بل گیٹس سے ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کو لوگوں کو قائل کرنے کے بعد بھی کئی مراحل تھے جو طے ہونا باقی تھے۔ تب والد کانگو گئے ہوئے تھے۔ انھیں وہاں سے امریکہ پہنچنا تھا۔ مائیکروسافٹ سے ٹکٹ آگئی مگر ویزہ کا مسئلہ تو باقی تھا۔ یہ مسئلہ کون حل کرتا، کون انھیں قائل کرتا۔

پھوپھو انجم النساء نے دور خلاؤں میں اپنی بھرفی کو سوچتے اور مٹھاس محسوس کرتے کہنا شروع کیا ''وہ میرے پاس اسلام آباد آئی ہوئی تھی، صبح ہم نے سفارت خانے جانا تھا۔ وہ رات دیر تک جاگتی اور بچوں سے باتیں کرتی رہی۔ میں نے کہا ارفع بیٹے سو جاؤ، صبح جانا ہے۔ بولی آپ بس ایک آواز دیجیے گا میں اٹھ جاؤں گی۔ صبح ہوا بھی یہی۔ اس نے تیار ہونے میں کل ۳ منٹ لیے اور پھر ہم سفارت خانے کے لیے روانہ ہوگئے۔ راستے بھر میں سوچتی رہی کہ امریکیوں کا لہجہ بڑا تیز اور ایکسنٹ مختلف ہوتا ہے، بات کرنے میں مجھے وقت پیش آئے گی۔ بے شک کالج میں پڑھاتی ہوں مگر امریکی تھوڑے مختلف اور مشکل لوگ ہیں ان کو کیسے قائل کر پاؤں گی۔ سفارت خانے میں رش تھا، خوب لائنیں لگی تھیں۔ ہماری باری آئی میں نے بات کرنا شروع ہی کی تھی کہ ارفع میرے پیچھے سے نکل کر سامنے آگئی اور امریکی لہجے میں بولی:

"Mr. this is my ticket and this is schedule of meeting with Bill Gates. My father has to come from Kango to join us there. This is the situation and now you have to work out the solution."

www.paksociety.com

وہ دو الا حیران پریشان اس کو دیکھتا، اس کی باتیں سنتا، اس کے اعتماد کو انجوائے کرتا رہا۔ پھر اچانک اس آدمی نے کہا یہ تو مشکل ہے۔ ارفع بولی "مشکل ہے تو آپ کے پاس آئے ہیں، حل آپ کے پاس ہے، نکالیے۔ یہ آپ ہی نے کرنا ہے۔"

اس نے ویزہ سنٹر کے بتایا سارے عملے کو اپنی ونڈو پر بلایا اور کہا "دیکھو تو سہی۔ یہ ۹ سال کی لڑکی اور باتیں کیسے کرتی ہے۔ یہ کام ایسے تھوڑی ہوتا ہے، ہمارے کچھ اصول ہیں، حدود ہیں۔"

ارفع نے اعتماد سے کہا "کام تو ہوتا ہے اور آپ ہی کے ہاتھوں ہونا ہے۔"

ٹھیک ۱۵ منٹ بعد انھوں نے ارفع کو بلایا اور پاسپورٹ واپس تھما دیا۔ اس نے پورے یقین اور اعتماد سے کھولا۔ ۵ سال کے ملٹی پل ویزے کی سٹیمپ لگی ہوئی تھی۔ اس نے انتظارگاہ سے باہر آکر اپنا کالر کھڑا کیا اور پھوپھو کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولی "ہاں تو پھوپھو...... کیسی رہی؟"

کیا وہ اچھی تعلیم کی وجہ سے ایسی تھی کہ وہ بیکن ہاؤس، لرننگ الائنس جیسے مہنگے اور ایل جی ایس جیسے معیاری سکولوں میں زیرِ تعلیم رہی یا گھر کی تربیت نے اسے ایسا بنایا۔

ارفع کے گھر والوں کا خیال بالکل مختلف ہے۔ والدہ ثمینہ کریم رندھاوا نے کہا "فیصل آباد میں اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ خاک سونے والی میری بچی جس کی تین تین جگہ نماز جنازہ پڑھی گئی، تو رب کی عطا تھی۔"

والد کرنل (ر) امجد کریم رندھاوا کا کہنا تھا "وہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت تھی، معجزہ تھا، انعام تھا اور بس۔"

پھوپھو انجم نے کہا "وہ اللہ کا فضل تھا، اسے بنانا اور پروان چڑھانا عام انسان کے بس میں نہیں تھا۔ میرا بھائی، میرا اور پورا پاکستان ہی ہمیشہ۔ وہ اپنی ہی بیٹی کا سب سے بڑا "والا و شیدا" تھا۔"

کیا کرنل رندھاوا کی زندگی میں ارفع کے علاوہ بھی کچھ اہم تھا۔ گھر کے مرکزی کمرے میں آویزاں دو ہی طرح کی تصاویر تھیں۔ چودھری کریم اور ان کی اہلیہ کی تصاویر اور ارفع کی تصاویر۔ سابق صدر، وزیرِاعظم اور بل گیٹس کے ساتھ۔ اسی کے میڈل، اسی کے تحفے، اسی کی کتابیں، اسی کی باتیں۔

ایسے باپ کم ہوں گے جو اولاد کو اس قدر توجہ اور وقت دیں کہ لاہور رہنے اور بیٹی کو پڑھانے کی خاطر فوج کی وہ نوکری چھوڑ دی جو کبھی بہت عزیز رہی ہو۔ فوج سے ملنے والے پلاٹ کی قربانی دے کر ایک گاؤں میں رہائش اختیار کر لیں کہ جس میں جانے کے لیے بھی گندے نالے کو عبور کرنا پڑے اور جہاں انسانوں سے زیادہ بھینسوں سے واسطہ پڑے۔

ارفع کے روم میٹ اس کے ۲ بھائی داؤد اور سرمد تھے۔ دونوں بھائی ارفع کو چھیڑتے کہ بڑی ذہین فطین بنی پھرتی ہے، رہتی تو گاؤں میں ہی ہو، بھینسوں کی ہمسائیگی میں تو وہ مسکرا کر کہتی "مکان، مکین سے ہوتے ہیں، مکین مکان سے نہیں۔"

ارفع کے کیمسٹری کے استاد نے بے اختیار کہا تھا "نوٹس نوٹ کرنے کا اس کا انداز سب سے مختلف تھا۔ زبردست توجہ اور محویت۔ وہ اہم چیزوں اور باتوں کو ساتھ ساتھ ہائی لائٹ کرتی جاتی تھی۔"

تعزیت کے لیے ہم نیو ایئرپورٹ کے سامنے فیز ۸ میں داخل ہونے کی کوششوں میں جب ۲ بار ناکام ہو چکے تو ایک گندے نالے کے ساتھ ساتھ اندر جاتی سڑک پر ہم نے گاڑی اتار دی۔ کافی آگے جا کر بڑا نالہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک پلی عبور کی۔ دو چار لوگوں سے پوچھا اور پھر اس گلی میں داخل ہو گئے جہاں مکان کی چھت پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا اور دروازے پر کسی کی طرف سے بینر آویزاں تھا "ارفع کریم! ہم تمھارے خواب نہ مرنے دیں گے۔"

عام دنوں میں اور عام لوگوں کے لیے گھر اور محل وقوع بے حد اہم ہوتے ہیں مگر ہم سے پہلے اس گلی سے میڈیا کی گاڑیاں نکل رہی تھیں۔ ہر اہم چینل کا سٹاف

اور ادبی دنیا میں اس عمر کے چکر لگا رہی تھیں۔ ابھی ابھی وزیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان نے ارفع کے لیے ڈراما بنانے اور اس پر کتاب لکھوانے کا اعلان کیا تھا۔

''میں اس کا باپ نہیں مینیجر تھا، جو سارے باپ نہیں ہوتے۔ بڑے لوگوں سے ملتے ہمیشہ اچھے تجربات نہیں ہوتے۔'' وہ بتا رہے تھے۔ ''ایک صاحب نے دبئی بلوایا، خوب بڑا فنکشن کیا، لوگوں سے ملوایا اور آخر میں ایک معاہدہ سامنے رکھ دیا کہ آیندہ ارفع میری مرضی اور اجازت کے بغیر دنیا بھر میں نہ کسی کو انٹرویو دے گی نہ ملے گی۔'' میں نے حیرت سے کہا آپ نے تو لکھا تھا ہم اسے عزت افزائی کے لیے بلا رہے ہیں۔ یہ بنیاؤں کی طرح معاہدے کرنے کا پروگرام کب تھا۔ میں اپنی بیٹی کے لیے اب کوئی معاہدہ نہیں کرنے والا۔''

داؤد اور سرمد ۲۰ ر بھائی اور ۳ ر روم میٹ، دونوں کے بیڈ کمرے کے ایک طرف لگے تھے جہاں ارفع کا بیگ اور ساتھ وارڈروب تھی۔ داؤد شرارتی ہے۔ وہ اکثر بہن کی کاپیوں پر کارٹون بنا دیتا۔ اس پر ارفع کو غصہ بھی آتا۔ کبھی اظہار کرتی، کبھی خاموش رہتی۔ اصل میں وہ صلح کرنے والی روح تھی۔

کبھی والد کو گھر کے معاملات پر غصہ آتا تو ماں کو سمجھاتی ''مما! پپا کہتے تو ٹھیک ہیں۔ جو کہا کریں کر دیا کریں۔''

ماں مسکرا دیتی ''باپ کی بیٹی۔''

وہ کھانا بڑا اچھا بنا لیتی تھی۔ جس روز اس نے پہلی بار کھانا بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ماں کو بہت دیر یقین نہیں آیا۔ آج کی لڑکیوں کو کہاں شوق ہوتا ہے، بولی ''مما! یہ تو ہنر ہے اور ہنر میں ہی عزت ہے۔ کھاتے ہیں تو پکانے کا سلیقہ بھی تو آنا چاہیے۔'' خدا جانے ایسی باتیں کیسے کر لیتی تھی۔

ماں بھی بہت خوش ہوتی تو بیٹی کو ساتھ لے کر چھوٹی سی ایف ایکس پر گول گپے کھانے نکل کھڑی ہوتیں۔ کھٹاس اور کھٹا رائتہ دونوں اسے مرغوب تھے۔ اسے الگ سے سوچنا اور بھی زیادہ مرغوب تھا۔

وہ اپنے ٹیچر کے نام سے ایک سافٹ ویئر بنانا چاہتی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہر گاؤں کا بچہ اپنی بکری پالے، اس کے بچے ہوں تو ان کو بیچ کر کمپیوٹر لے، پڑھے اور آگے بڑھے۔ وہ دھرتی سے جڑی ہوئی بیٹی تھی۔ خلا میں خلائی قلعے نہیں بناتی تھی۔ ڈیجی کان ویلی، ڈسٹنس لرننگ جیسے منصوبے بنا چکی تھی۔ پڑھ لکھ کر ان کو عملی جامہ پہنانے کے ارادے تھے۔ فیصل آباد والے سکول میں وہ خود سے کمپیوٹر لیب بنوانے کا سوچتی تھی۔

باپ کا بھی یہی عالم تھا۔ بیٹی کی پڑھائی کے لیے سب سے مہنگا سکول چنا۔ زندگی کی آسائشیں کم کر لیں۔ سکول پر خرچہ بڑھا دیا تاکہ ملک و قوم کا مستقبل، اس کی روح کا ٹکڑا کل آسمان کا ستارا بن کر چمک سکے۔

Living کمزور ہونے کا خوف اور احساس کمتری پیدا ہونے سے بچانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ باپ بار بار یاد دلاتا ''بیٹے کی مکان میٹر نہیں کرتا، مکین میٹر کرتے ہیں۔'' یوں بچوں میں کمپلیکس پیدا نہیں ہوا۔

ارفع صرف پڑھائی میں اچھی نہیں تھی۔ اس میں خداداد قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ لاہور گرامر سکول پیراگون کی ہیڈ گرل بھی تھی، جہاں اس کا پورے سکول کی طالبات سے واسطہ پڑتا تھا اور وہ خوشی سے ان کے مسئلے سننے اور حل کرنے کو تیار رہتی۔ گھر میں اس کا فوری واسطہ اپنے دونوں بھائیوں

سے پڑ تا تھا جو اس کے کمرے کے مکین تھے۔

یاسر نے کہا ”ارفع زندہ ہوتی تو اتنے لوگوں کو روتے اور دعائیں کرتے دیکھ کر یقیناً اسے اچھا لگتا، پھر وہ ہنس دیا۔ میں اسے دھمکاتا تھا کہ تمھاری چیزیں چھیڑوں گا اور نام لے کر بلاؤں گا۔ کاش وہ زندہ رہتی تو میں اسے آپی کہہ کر بلاتا۔ اس کمرے میں رہنا اور اپنی بہن کے بغیر پڑھنا کس قدر مشکل ہے، یہ کوئی یاسر سے پوچھے جس کی اٹھتے بیٹھتے اپنی بہن کی چیزوں پر نگاہ پڑتی ہے۔

اسے یاد تھا ایک بار بل گیٹس نے ہارورڈ یونیورسٹی کے طالب علموں سے خطاب کیا تھا:

”آپ طالب علموں کا زمانہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ کے پاس ایسی ٹیکنالوجی ہے جس کا ہماری نسل کے لوگوں نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ آپ کو دنیا میں پائی جانے والی عدم مساوات کا ہم سے زیادہ اندازہ ہے۔ اس شعور کے ساتھ آپ کا ضمیر بھی زندہ ہے جو آپ کو ملامت کرتا رہے گا، اگر آپ نے ان لوگوں کو تنہا چھوڑ دیا، جن کی زندگیوں کو آپ تھوڑی سی کوشش سے بدل سکتے تھے، آپ کے پاس ہم سے زیادہ ہے، لہٰذا آپ کو ہر کام جلد شروع کرنا اور ہم سے زیادہ عرصے تک کرنا ہے۔“

ارفع کو ہارورڈ یونیورسٹی اور ایم آئی ٹی دونوں ادارے اعلیٰ تعلیم کے لیے بے حد پسند تھے۔ ابھی اے لیول مکمل کرنے کے بعد اس کا ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلے کا پروگرام تھا۔ والد بتا رہے تھے کہ دبئی میں ایک بہت بڑی کمپنی نے اسے ۱۰ تولے سونے کی اینٹ کا تحفہ دیا تھا۔ انھوں نے اسے بیچ کر اس کے داخلے کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔

وہ کہتی تھی ”مجھے لگتا ہے ہمارے نوجوان ماہ و سال کے حوالے سے نوجوان ہیں، جدت پسندی، تخلیقی صلاحیتوں اور جرأت مندانہ فیصلوں کے حوالے سے کافی کمزور بلکہ اکثر تو عمر رسیدہ لگتے ہیں۔ اگر ایسی صورت حال جاری رہی تو ہمارے ہاں مائیکروسافٹ کے چیئرمین بل گیٹس اور فیس بک کے چیف مارک زوکربرگ جیسے لوگ پیدا نہیں ہوں گے۔“

ارفع نے ۹ سال کی عمر میں نام پانا شروع کیا۔ بل گیٹس سے ملاقات سے پہلے ۳ روز تک اسے مائیکروسافٹ کے مختلف شعبوں کے وائس پریذیڈنٹس نے پریزنٹیشن دی۔ اس کے بعد میڈیا سے اس کی ملاقات ہوئی جہاں وہ اکیلی سب کے سوالوں کے جواب دیتی اور حیران کیے جاتی۔ بل گیٹس سے اس کی ملاقات کی اصل کہانی بھی کافی دلچسپ ہے۔ ملاقات شروع ہوئی تو سب کا خیال تھا کہ چند منٹوں کی ہوگی۔ اتنی چھوٹی سی لڑکی بھلا کیا بات کرے گی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ملاقات سے پہلے چند منٹوں میں اس نے بل گیٹس پر ایک خوبصورت نظم بھی لکھ ڈالی تھی۔ ملاقات کے دوران بل گیٹس نے پاکستانی خواتین کے نقاب لینے اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا تذکرہ کیا تو ارفع نے کہا ”کبھی میرے ملک آیئے اور بڑے شہر میں نہیں میں آپ کو اپنے گاؤں چک ۴ ج ب۔ فیصل آباد لے چلوں گی۔ وہاں عورتیں اپنی مرضی کا لباس پہنتی اور زندگی کی دوڑ میں مردوں کی طرح شریک ہیں۔ کوئی انھیں روکتا نہیں، مجبور نہیں کرتا۔ ہمارے تو کلچر کی خوبصورتی ہی یہ ہے۔ آپ کو کسی نے غلط بتایا کہ نقاب یا چادر ہماری عورتوں کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہ تو گاؤں کی بات ہے، پردے اور نقاب والی عورتیں شہروں میں بھی پڑھتی ہیں، آگے بڑھتی ہیں۔ پھر اس نے پلٹ کر بل گیٹس سے کہا ”ایک سوال میرا بھی ہے، آپ کے ہاں تو عورتوں مردوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع حاصل ہیں۔ میں جاننا چاہوں گی کہ کیا مائیکروسافٹ میں عورتیں، مردوں جتنی تعداد میں اپنی ذمے داریاں نبھا رہی ہیں؟“ بل گیٹس نے سوال سن کر سوچا اور کرسی سے ٹیک لگا کر کہا ”Statistically you are correct کہ ہمارے ہاں جینڈر بیلنس نہیں ہے۔ عورتیں کافی کم تعداد میں ہیں۔ ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا۔“ بل گیٹس نے بڑی محبت کے ساتھ آفس کے باہر اس کے ساتھ تصاویر بنوائی تھیں۔ اسے وہ پریوں جیسی ذہین بچی اچھی طرح یاد رہی، اس لیے بیماری کے دنوں میں

www.paksociety.com

اس نے ڈاکٹروں کا پینل بنایا جو ویڈیو کانفرنس کے ذریعے
رابطے میں تھا۔ اگر اس کی حالت ذرا سی سنبھل جاتی تو
بل گیٹس کا جہاز اسے وہیں کے امریکی ہسپتال لے جانے کے
لیے تیار تھا۔ کچھ تو ایسا آپ کے اندر علم، فہم، دانائی، ذہانت
ہو کہ لوگ زندگی میں اور جانے کے بعد یاد رکھیں۔"

بل گیٹس سے مل کر واپس آئی تو دوستوں نے پوچھا
"کیسا لگا بل گیٹس؟" اس نے وہاں بھی کمال بات نوٹ کی
تھی۔ کہنے لگی:

"میں سمجھتی تھی، وہاں اس کا سب سے بڑا آفس ہوگا
مگر اس کا تو نارمل سا آفس تھا۔ نہ کوئی چپڑاسی اور اتنا سادہ
کہ جسے کہتے ہیں Down to earth۔ اس کا لہجہ اتنا نرم
اور انداز اتنا Humble کہ مجھے یقین کرنے میں وقت لگا۔"

یہ سچ ہے کہ کامیابی کی آخری سیڑھی پر جانے والوں
میں کچھ نہ کچھ خاص بات ضرور ہوتی ہے۔ ارفع کے
بارے میں یہ جان کر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ اس کو
گانے کا شوق ہوا تو جواد کے ساتھ بھی ایک گانا گا ڈالا۔
گائیکی کا سرٹیفکیٹ بھی لیا اور سنبھال رکھا کہ MIT میں
داخلے کے وقت کام آئے گا...... وہ لوگ گریڈز کے علاوہ
سرگرمیوں کو بھی نوٹ کرتے ہیں، کتابی کیڑا نہیں لیتے۔
ارفع کی دوستیں کہتی ہیں کہ کلاس میں کوئی فنکشن ہوتا یا
تقریری مقابلہ تو کسی کو فکر نہ ہوتی۔ ارفع ہر مرض کی دوا کے
طور پر موجود ہوتی۔ ایک بار چاند باغ سکول میں گانوں
کے مقابلے تھے۔ اے لیول، او لیول کے بچے حصہ لے
رہے تھے اور وہاں ایک چھوٹی سی بچی بھی پہنچی ہوئی تھی۔
منتظمین تو اس کو مقابلے میں شریک کروانے سے ہی منکر
تھے۔ وہاں اس نے کلاسیکل انداز میں "مجھ سے پہلی سی محبت
میری محبوب نہ مانگ" گا کر سب کو حیران پریشان کر دیا۔

اڑھائی سال کی عمر میں سکول جانے کا آغاز کرنے
والی ارفع کی پہلی سکول ٹیچر ملتان میں تھی۔ جہاں ان دنوں
میجر صاحب کی پوسٹنگ تھی۔ وہ ٹیچر ان دنوں کینیڈا میں
ہیں۔ انھوں نے نیٹ پر اس کی بیماری کی خبر اور تصویر دیکھی
تو نہ جانے کہاں کہاں سے رابطہ کرکے بالآخر ارفع کے
والدین کا نمبر ڈھونڈ نکالا۔ تعزیت کرتے ہوئے اس نے
کہا "بڑی بڑی آنکھوں والی اس لڑکی کو کیسے بھول سکتی
ہوں۔ اس کی آنکھیں کلاس سے جاتے ہوئے بھی میرا
پیچھا کرتی تھیں۔ جب میں وہاں سے آئی تو مجھے لگتا تھا وہ
مجھے ہی روک رہی ہیں۔"

ارفع سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرنے والے
اس کے والد نے بھی اس کو نام سے نہیں بلوایا۔ والدہ کہتی
ہیں "جب دونوں باپ بیٹی بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے تو
ہم دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنے کاموں میں لگ
جاتے تھے۔ باپ ہی بیٹیوں کو بناتا اور سنوارتا ہے۔ وہ
کبھی اقبال کے فقر، سادگی کا فلسفہ سنا رہے ہوتے، کبھی
شاہین اور کوے کا فرق بتا رہے ہوتے۔ بلھے شاہ باپ کو
بہت پسند تھا۔ اس نے بیٹی کی پسند بھی بنا دیا۔"

بلھیا اساں مرنا ناہی
گور پیا کوئی ہور

ارفع کمرے سے باہر چلی جاتی یا باتھ روم میں گئی
ہوتی اور باپ کو نظر نہ آتی تو گھر میں چودھری عارف،
چودھری عارف کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ پھوپھو انجم نے

کہا ”میرا وہ (بھائی) اپنی بیٹی کے عشق میں تھا۔ وہ اس کی کل کائنات تھی اور وہ اس کو سب کا راہنما بنا دینا چاہتا تھا۔“

جن لوگوں نے ارفع کو ”ایک دن جیو کے ساتھ“ میں دیکھا وہ اس کی باتیں سن کر اور اعتماد دیکھ کر ماشاء اللہ کہہ اٹھے تھے۔ ۱۶ سالہ لڑکی سیلیکان ویلی کی طرز پر ڈیجی کان ویلی کا خواب دیکھ رہی ہو۔

والدہ نے اچانک چونکتے ہوئے کہا ”کل ہم اس کی کیسٹ سن رہے تھے، تب ۱۲ سال کی ہوگی۔ میں نے کہا پہلا کلمہ سناؤ تو اس کی آواز آئی پہلا نہیں اوّل ہوتا ہے۔ اپنی کزن سے کہتی مطلب نہیں مطلب ہوتا ہے۔

۱۰ سال کی عمر میں ارفع دبئی میں سیسنا جہاز اڑا رہی تھی۔ جو اس نے ۲۰ دن میں اڑانا سیکھ لیا تھا۔ سیسنا اڑاتی ارفع کے ساتھ بیٹھے پائلٹ نے پلٹ کر پچھلی نشستوں پر بیٹھے اس کے والدین سے کہتے یقین سے کہا تھا ”اگر یہ بچی تھوڑے دن ہمارے ساتھ رہی تو اسے کمرشل پائلٹ کا لائسنس ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔“

۲۰۰۶ء میں ارفع بارسلونا بھی گئی جہاں اس نے ایک آئی ٹی کانفرنس میں شرکت کی۔ مندوبین میں وہ اکیلی پاکستانی تھی۔ آخری دنوں میں وہ بل گیٹس کو پاکستان بلانے اور اپنی ڈیجی کان ویلی کے افتتاح کے لیے سرگرم تھی۔ جو ممکن ہے کسی روز اس کے نام پر بننے والی کسی یونیورسٹی یا ادارے کے افتتاح کے لیے اس سرزمین پر اترے۔

ویسے تو صوبہ سندھ حکومت نے ۱۴ اگست کو یوتھ کے عالمی دن کو ارفع کے نام منسوب کرنے کے ساتھ ساتھ میڈیا سنٹر کو بھی ارفع کے نام سے منسوب کرنے کا اعلان کیا ہے۔ حکومت پنجاب نے دنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے لاہور ٹیکنالوجی پارک کا نام بدل کر ارفع سافٹ ویئر ٹیکنالوجی پارک رکھ دیا ہے اور طلبہ و طالبات میں لیپ ٹاپ کی تقسیم کی پہلی تقریب کو بھی اس کے نام سے منسوب کرتے وزیراعلیٰ پنجاب نے کہا ”ارفع ہمیں تمھارے جانے کا بہت دکھ ہے لیکن ہم تمھارے خواب بکھرنے نہیں دیں گے۔“

ارفع نے زندگی کی آخری بات کیا کہی، کیا کی۔ ”میرا سوال سن کر والدہ نے اداسی سے کہنا شروع کیا ”کچھ ہفتوں سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ۴ روز پہلے وہ سیڑھیوں سے گری تھی لیکن بظاہر بالکل ٹھیک تھی۔ والد نے سٹی سکین بھی کرایا۔ ایم آر آئی نہیں کروا سکے کیونکہ اس کو بریسز لگے ہوئے تھے۔ والد نے سکول جانے سے روکا ہوا تھا کہ آرام کر لے۔ اس روز شام کو میں اس کے کمرے میں گئی جہاں وہ اپنے بیڈ پر ۳ کشن رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے خلاف معمول اپنے چہرے پر بھی ایک کشن رکھا ہوا تھا۔ میں نے اٹھا کر وہ پرے کر دیا تو بولی ”اب آرام ہے۔“

میں نے دعا پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور قریب پڑی اس کی کرسی پر بیٹھ کر تسبیح کرنے لگی۔ اچانک میری چھٹی حس نے مجھے متوجہ کیا۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر گئی تو اس کی دونوں آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔ میں نے خوفزدہ ہو کر اس کو آوازیں دینی شروع کیں۔ اس کو فٹ پڑ چکا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں اس کے ابو اور ان کے ایک کرنل ڈاکٹر دوست بیٹھے تھے۔ میری چیخیں سن کر وہ

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دونوں بھاگ کر آئے۔ گاڑی میں ڈالنے سے پہلے پھر فٹ پڑا۔ سی ایم ایچ پہنچنے تک اس کے ہونٹ نیلے ہو چکے اور چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹرز نے حملے کو رد کیا اور قریباً ۲۵ منٹ CPR کیا۔ اس کے سانس رُک چکے تھے۔ ڈاکٹرز نے سینے سے دبا کر سانسوں کو واپس لانے کی کوشش کی۔ کوئی حل نہ پا کر پھر اس کو مشینوں پر ڈالا گیا۔ اس لمحے کے بعد اس نے کبھی حرکت کی نہ سانس لیا۔ اس کا دماغ ریسپانس نہیں کر رہا تھا۔ ارفع کے والد جانتے تھے مگر انھوں نے کسی کو نہیں بتایا۔ ایک نرس نے مجھے بتایا تھا کہ ہسپتال کے کوری ڈور کے آخر میں جا کر پاؤں کے بل وہ کتنی دیر تنہا بیٹھے اپنا درد خود سے بانٹ آتے تھے۔

جب آپ یہ فیچر پڑھ رہے ہوں گے۔ فروری کی ۲ تاریخ ہوگی۔ یہی ارفع کا جنم دن ہے۔ اس بار یہ دن کافی مختلف ہوگا۔ اس دن وہ مبارک باد لینے، کیک کاٹنے خود موجود نہ ہوگی۔ نہ تالیاں بجیں گی نہ موم بتیاں جلیں گی۔ جلنے کو سینے ہوں گے، دل ہوں گے اور درد دھواں بن کر اس پورے گھر کو اپنے گھیرے میں لیے رکھے گا جہاں ارفع اور خوبصورت آنکھوں اور زندہ وجود کے ساتھ موجود ہوتی تھی۔

میں نے ابھی ابھی ارفع کے ابو کو فون کیا ہے۔ اس کی والدہ نے اٹھایا اور بہت سی دعائیں دی ہیں۔ اس روز ملاقات میں نہ جانے کیا تھا جب انھوں نے کہا ”ہم نے کبھی کسی کو اپنی بیٹی کے کمرے تک رسائی نہیں دی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو لے چلوں۔“ ارفع کی پھوپھو جب پورا کمرا دکھا چکی تو پھر ادا سی سے اس کی وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے دھیرے سے کہا ماشاء اللہ خوب چوائس ہے، اپنی اماں سے بھی شیئر کر لیتی ہوگی۔ وہ مسکرا دیں ”ہاں کیوں نہیں اب تو اپنی اماں کے کپڑے بھی اس کو پورے آنے لگے تھے۔“

۱۷ سال کی عمر میں ۷۰ سال کے خواب دیکھنے والی وہ سعید روح چلی گئی اور سارا بوجھ اپنے باپ پر ڈال گئی

جسے اپنی فیملی، بیٹے، بیوی اور برادری کو ہی نہیں دیکھنا، اپنی بیٹی کے خوابوں پر پہرہ بھی دینا ہے۔ ورنہ بھولنے کو یہاں کب دیر لگتی ہے۔ میں نے ارفع کے ابو سے فرمائش کی ہے کہ مجھے وہ نظم سنا دیں جو ارفع نے لکھی تھی۔ وہ بے خودی میں سنا رہے ہیں اور میں سر جھکائے لکھے جا رہا ہوں:

دور کہیں تنہا ایک پرندہ تھا انگشت بدنداں
سوچتا تھا کہ یہ لوگ کیوں ہیں اتنے ناداں
جانتے ہوئے بھی کہ جانا ہے اس کے پاس
کیوں نہیں آتے یہ بُرے کاموں سے باز
اے حضرتِ انساں تو راہِ راست پر نہیں ہے
جانا ہے کہیں اور تو کہیں اور ہے
اپنی آنکھیں کھول، سوئے منزل چل
کہ آ رہا ہے ترے سامنے ایک نیا کل

ایک نئے کل کا کسی اور کو نہیں، خود اس کو سامنا کرنا پڑا۔ خدا جانے کیوں یقین ہے کہ ۱۴ جنوری ۲۰۱۲ء کو ۲۲ دن بے ہوش رہ کر فوت ہونے والی ارفع، اپنے رب کے ہاں آرام سے ہوگی۔ یہی اس کی زندگی کے آخری الفاظ تھے، جو اس نے کہے تھے۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

چھوٹی عمر میں بڑے بڑے کام

وقار خالق

۲۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو پی ٹی وی لاہور کے مقبول سٹیج شو میلہ کے میزبان دلدار بھٹی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "ناظرین اب آپ کے سامنے ایک ننھا گلوکار آرہا ہے۔ اتنے لمبے لمبے شعر پڑھے گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ ماہیا پیش کرتے ہیں وقار خالق..... اس کے ساتھ ہی ساڑھے چار سال کے موٹی موٹی آنکھوں والے ایک معصوم بچے نے سٹیج پر آ کر اپنی توتلی آواز میں ماہیا گایا۔ چٹا ککڑ بنیرے تے ..... اس نے اتنا لمبا گانا اتنے اعتماد اور ایکشن کے ساتھ گایا کہ جس نے بھی یہ پروگرام دیکھا اس بچے کو نہیں بھلا پایا۔ بچے بوڑھے خاص کر عورتیں اس پروگرام کے وقت ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتیں اور بڑے شوق سے اس کا گانا سنتیں۔ ٹی وی پر وقار خالق کے تقریباً ۱۵۰ کے قریب گانے نشر ہوئے۔ پنجاب کے تمام لوک گیتوں کی دھنوں پر لکھے ہوئے قومی گیت اس نے گائے جو ایک منفرد بات تھی۔ اس کے لیے پی ٹی وی کے سب مشہور میوزک ڈائریکٹروں نے گانے کمپوز کیے جن میں میاں شہریار، خلیل احمد، رفیق علی، ماسٹر منظور، ضمیر حیدر، قادر علی شگن اور وزیر افضل شامل ہیں۔ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف اسے بہت پیار کرتے تھے۔ اندرون شہر ان کی الیکشن کمپین میں وقار اپنی نظمیں پڑھ کر جلسے لوٹ لیتا تھا جس پر میاں صاحب بے ساختہ اسے گود میں اٹھا کر چومنے لگتے تھے۔ وقار خالق پاکستان کا پہلا کم عمر گلوکار تھا جس کی ۷ سال کی عمر میں گانوں کی آڈیو کیسٹ مارکیٹ میں آئی۔ اس کی زندگی میں پنجاب کے جتنے بھی گورنر آئے، انھوں نے گورنر ہاؤس بلا کر اس سے گانا سنا۔

اتنی کم عمری میں اتنی زیادہ شہرت وقار اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ کسی بے رحم نے ایک فنکشن میں اسے زہر کھلا دیا۔ گھر آتے ہی اس کو خون کی الٹیاں شروع ہو گئیں۔ فوری طور پر شیخ زید ہسپتال لے جایا گیا۔ جگر بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ ۲۱ ستمبر اس کا یوم پیدائش تھا جس روز وہ شیخ زید ہسپتال میں داخل ہوا اور ۳ روز کومے کی حالت میں رہنے کے بعد ۲۵ ستمبر کو ہلکی سی ہچکی کے ساتھ مالک حقیقی کے پاس چلا گیا۔ وقار کو بعد از وفات پی ٹی وی ایوارڈ دیا گیا۔

ماسٹر مدن

۱۹۲۷ء میں جالندھر کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے گیتوں کی تعداد ۸ ہے۔ ماسٹر مدن نے ۳ سال کی عمر میں گانا شروع کیا۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں اپنے فن کا عوامی مظاہرہ کیا۔ اس سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں مہاتما گاندھی شملہ میں جلسے کرنے آئے تو بہت کم لوگوں نے اس میں شرکت کی، زیادہ تر لوگ ماسٹر مدن کا گیت سننے چلے گئے۔ فن کے لیے بے تحاشا جسمانی دباؤ سے اس کی صحت متاثر رہنے لگی لیکن اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ صحت زیادہ خراب ہوئی تو طبی معاینہ کروایا گیا۔ اس کے جسم میں زہر کے اثرات دیکھے گئے۔ موسیقی کا ننھا جادوگر ۱۹۴۲ء میں اپنی پندرھویں سالگرہ سے پہلے شملہ میں انتقال کر گیا۔

www.Paksociety.com

نبی کریم ﷺ کے ان حیات آفریں کارناموں کا ذکرِ خیر جنھوں نے بنی نوعِ انسان کی کایا پلٹ دی

عظیم ترین
انسانی انقلاب کے داعیِ اول

محسنِ انسانیت ﷺ

ربیع الاول کی خصوصی پیشکش

نعیم صدیقی

ربیع الاوّل

کے ماہِ مبارک کی ۱۲ تاریخ محسنِ انسانیت حضرت محمد ﷺ اس دیارِ فانی کو اسلام کی کرنوں سے منور کرنے تشریف لائے۔ ہم اس موقع کی مناسبت سے الفیصل پبلشرز کی شائع کردہ کتاب ''محسنِ انسانیت'' کے مقدمے سے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔ ''محسنِ انسانیت'' سیرتِ پاک پر لکھی گئی کتب میں منفرد پہچان رکھتی ہے۔ پچھلے ۶۰ سال میں یہ کتاب اردو، بنگالی اور اراکان زبان میں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور اراکان میں ایک لاکھ سے زائد کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ ماہر القادری نے اس کتاب کے بارے میں ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا ''غیب کا حال تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، مگر میرا وجدان پیشین گوئی کر رہا ہے کہ اس کتاب کو ان شاء اللہ قبولِ عام حاصل ہوگا۔'' مضمون کا آغاز مصنف کے خوبصورت نعتیہ مجموعے ''نور کی ندیاں رواں'' سے لیے گئے اشعار سے ہوتا ہے۔ (مدیر)

تو رسولِ حق، تو قبولِ حق، ترا تذکرہ ہے فلک فلک
تو ہے مصطفیٰ، تو ہے مجتبیٰ، ترا ذکرِ خوش ملک ملک

ترے سب زماں، ترا کل مکاں، ترے معجزے تری کہکشاں
تو اِدھر سے اٹھے تو اُدھر سے آئے تو یہاں چمک، تو وہاں دمک
ادب، انکسار، عفو، حیا، غمِ حشر، صدق، صفا، دعا
ہیں یہ سات رنگ ہوئے بہم تری شخصیت کی بنی دھنک

ہمارے سامنے آنے والی صدیاں ان گنت چیلنج لیے کھڑی ہیں۔ وقت کے راستے پر پیچھے بھاگنے کا امکان نہیں لیکن چیلنج کا جواب دینے کی صلاحیت موجودہ تہذیب اور اس کے بنائے ہوئے انسان میں نہیں۔ کوئی نیا فلسفہ بھی نہیں ابھر رہا جو کم سے کم ایک چھلاوے کی طرح وقتی طور پر سرمایۂ اطمینان بن سکے۔ کسی طرف کوئی راہِ نجات حقیقی نظر نہیں آتی۔

اضطراب کے اس لمحے میں جب ہم چاروں طرف نگاہیں گھمائیں تو تاریکی کا سمندر شش جہت سے محاصرہ کیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس سمندر میں دور...... ۱۴ر صدی کی دوری پر...... ایک نقطۂ نور دکھائی دیتا ہے۔ یہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن محمد ﷺ کے پیغام کی مشعل ہے۔ وہی مشعل جس کی روشنی کو خود ہم نے، حضرت محمدؐ کے نام لیواؤں نے اپنے افکارِ پریشاں اور

www.Paksociety.com

اعمال پراگندہ کے غبار میں گم کر رکھا ہے۔

بنی نوع انسان کا نجات دہندہ

تاریخ کے وسیع دائروں پر نظر ڈالیں، تو اس میں ہمیں کئی مصلحین دکھائی دیتے ہیں۔ شیریں مقال واعظ اور آتش بیان خطیب سامنے آتے ہیں، بہت سے فلسفہ طراز ہر دور میں ملتے ہیں، بادشاہوں اور حکمرانوں کے انبوہ ہمیشہ موجود رہے ہیں جنھوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ جنگجو فاتحین کی داستانیں ہم پڑھتے ہیں۔ جماعتیں بنانے اور تمدن میں مدوجزر پیدا کرنے والوں سے تعارف حاصل کرتے ہیں۔ انقلابی طاقتیں نگاہوں میں آتی ہیں جنھوں نے نقشہ حیات کو بار بار زیروزبر کیا۔ رنگا رنگ مذاہب کی نیو ڈالنے والے بکثرت سامنے آتے ہیں۔ اخلاقی خوبیوں کے داعی بھی اسٹیج پر آئے۔ کتنے ہی مقنن ایوان تہذیب میں جلوہ گر رہ چکے ہیں۔

لیکن جب ہم ان کی تعلیمات، کارناموں اور ان کے پیدا کردہ مجموعی نتائج دیکھتے ہیں تو اگر کہیں خیروفلاح دکھائی دیتی ہے تو وہ جزئی قسم کی ہے۔ اس کے اثرات زندگی کے کسی ایک گوشے پر ابھرتے ہیں۔ پھر خیروفلاح کے ساتھ طرح طرح کے مفاسد ترکیب دکھائی دیتے ہیں۔ انبیاء کے ماسوا کوئی عنصر تاریخ میں ایسا نہیں دکھائی دیتا جو انسان کو...... پورے کے پورے انسان کو اندر سے بدل سکا ہو۔

حضورؐ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپ کی دعوت نے پورے کے پورے اجتماعی انسان کو اندر سے بدل دیا اور صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے لے کر بازار تک، مدرسے سے عدالت تک اور گھروں سے میدانِ جنگ تک چھا گیا۔ ذہن بدل گئے، خیالات کی رو بدل گئی۔ نگاہ کا زاویہ بدل گیا، عادات و اطوار بدل گئے، رسوم و رواج بدل گئے، حقوق وفرائض کی تقسیمیں بدل گئیں، خیروشر کے معیارات اور حلال وحرام کے پیمانے بدل گئے، اخلاقی قدریں بدل گئیں۔ دستور اور قانون بدل گیا، جنگ وصلح کے اسالیب بدل گئے، معیشت اور ازدواج کے اطوار بدل گئے اور تمدن کے ایک ایک ادارے اور ایک ایک شعبے کی کایا پلٹ گئی۔

اس پوری کی پوری تبدیلی میں جس کا دائرہ ہمہ گیر تھا، ایک سے دوسرے سرے تک خیروفلاح کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ کسی گوشے میں شر نہیں، کسی کونے میں فساد نہیں، کسی جانب بگاڑ نہیں۔ ہر طرف بناؤ ہی بناؤ، تعمیر ہی تعمیر اور ارتقا ہی ارتقا ہے۔ درحقیقت محسنِ انسانیتؐ کے ہاتھوں انسانی زندگی کو نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی۔ حضورؐ نے ایک نظامِ حق کی صبح درخشاں سے مطلع تہذیب کو روشن کرکے بین الاقوامی دورِ تاریخ کا افتتاح فرمایا۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔

ظہورِ قدسی

محسنِ انسانیتؐ کا ظہور ایسے حالات میں ہوا جب کہ پوری انسانی نسل تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہیں دورِ وحشت چل رہا تھا اور کہیں شرک اور بت پرستی کی لعنتوں نے مدنیت کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ مصر اور ہندوستان، بابل اور نینوا، یونان اور چین میں تہذیب اپنی شمعیں گل کرچکی تھی۔ لے دے کر فارس اور روم تمدنی عظمت کے پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ رومی اور ایرانی تمدنوں کی ظاہری چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کردینے والی تھی مگر ان شیش محلوں کے اندر بدترین مظالم کا دور دورہ اور زندگی کے زخموں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔

خود عرب کا قریب ترین ماحول جو حضورؐ کا اولین میدانِ کار بنا، اس کا تصور کیجیے تو دل ہل جاتا ہے۔ وہاں عاد وثمود کے ادوار میں سبا اور عدن اور یمن کی سلطنتوں کے سائے میں کبھی تہذیب کی روشنی نمودار بھی ہوئی تھی تو اب اسے گل ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں، بقیہ عرب پر دورِ وحشت کی رات چھائی ہوئی تھی۔ تمدن کی صبح ابھی تک جلوہ گر نہیں ہوئی تھی اور انسانیت نیند سے بیدار نہ ہو پائی تھی۔ ہر طرف انتشار تھا۔ انسان اور انسان کے درمیان

www.paksociety.com

تصادم تھا۔ جنگ و جدل اور لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ شراب اور زنا اور جوئے سے ترکیب پانے والی جاہلی ثقافت زوروں پر تھی۔

قریش نے مشرکانہ اور بت پرستانہ مذہبیت کے ساتھ کعبے کی مجاوری کا کاروبار چلا رکھا تھا۔ یہود نے کلامی اور فقہی موشگافیوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ باقی عرب فکری لحاظ سے ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ مکہ اور طائف کے مہاجنوں نے سود کے جال پھیلا رکھے تھے۔ غلام سازی کا منحوس ادارہ دھوم دھڑکے سے چل رہا تھا۔ حاصل مدعا یہ کہ انسان خواہش پرستی کی ادنیٰ سطح پر گر کر درندوں اور چوپایوں کی شان سے جی رہا تھا۔ جو زور والا تھا، اس نے کمزوروں کو بھیڑ بکریوں کے گلوں کی طرح قابو کر رکھا تھا اور کمزور، قوت والوں کے قدموں میں سجدہ پاش تھے۔

یہ تھے حالات جن میں حضرت محمدؐ عظیم ترین تبدیلی کا پیغام لے کر یک و تنہا اٹھتے ہیں۔ ایسے مایوس کن حالات میں کوئی دوسرا ہوتا، تو شاید بھاگ کھڑا ہوتا۔ دنیا میں ایسے نیک اور حساس لوگ بکثرت پائے گئے ہیں جنھوں نے بدی سے نفرت کی، مگر وہ اس کا مقابلہ کرنے پر تیار نہ ہو سکے۔ اپنی جان کی سلامتی کے لیے تمدن سے کنارہ کش ہو کر غاروں، کھوہوں میں پناہ گزین ہوئے اور جوگی اور راہب بن گئے۔ مگر حضورؐ نے انسانیت کی نیا کو طوفانی موجوں میں ہچکولے کھاتے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر نہیں کی، بلکہ بدی کے ہلاکت انگیز گردابوں سے لڑ کر ساری اولاد آدم کے لیے نجات کا راستہ کھولا۔ تمدن کی کشتی کی پتوار سنبھالی اور پھر اسے ساحل مراد کی طرف رواں کر دیا۔

وقت، مقام اور انسانی مواد

مشیت الٰہی نے جہاں انسانیت کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے حضورؐ کی بہترین ہستی کا اصطفا کیا، وہیں بدترین حالات کے باوجود حضورؐ کے لیے بہترین زمانہ، مقام، دعوت اور بہ حیثیت اولین مخاطب کے بہترین قوم کا انتخاب بھی کیا۔

مجموعی لحاظ سے زمانہ یوں موزوں ترین تھا کہ قبائلی دور ختم ہو کر جلد ہی بین الاقوامی دور شروع ہونے والا تھا اور تاریخ کچھ ہی گردشوں کے بعد سائنس کے عہد میں داخل ہونے والی تھی۔ حضورؐ کا زمانہ بعثت گویا دو دوروں کے درمیان خط فاصل تھا۔ آنے والے وسیع تر اور روشن دور کا افتتاح کرنے کے لیے ضروری ہوا کہ انبیا کی دعوت حق کو ایک بار پوری طرح اجاگر کر دیا جائے۔ دین کی روح کو ابھارا جائے۔ خدا پرستانہ تہذیب کی بنیادیں مضبوطی سے جما دی جائیں اور عدل و مساوات کا نظام رحمت کامل شکل میں پیش کر دیا جائے تاکہ حضورؐ کے اس کارنامے کی روشنی سے بعد کے ادوار منور ہوں۔ پھر یہ زمانہ اس لحاظ سے بھی موزوں ترین تھا کہ عام لوگوں کے سامنے کوئی دوسری امید گاہ باقی نہ تھی اور ان کے دل میں قبول اسلام کے دروازے آسانی سے کھل سکتے تھے۔

مقام دعوت کے لحاظ سے دیکھیں تو عرب باوجود بے آب و گیاہ خطہ ہونے کے تب کی متمدن دنیا میں وسطی حیثیت رکھتا تھا۔ مشرق و مغرب اور شمال سے آنے والے تمام کاروانی راستے عرب کی سرزمین میں آ کر ملتے تھے۔ مختلف ممالک کے درمیان جتنی تجارت خارجہ ہوتی، اس کا واسطہ عرب ہی کے تجار تھے۔ یہاں کسی بین الانسانی دعوت کا مرکز دوسرے ہر علاقے سے زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ پھر سرزمین عرب میں مکہ اور مدینہ کے مقامات یہ اہمیت رکھتے تھے کہ مذہبی، تجارتی اور تمدنی حیثیت سے ان کی قیادت کا سکہ چلتا تھا۔

عرب کا غیر متمدن اور مبتلائے انتشار اور اقتصادی حیثیت سے کمزور ہونا اگرچہ کئی مشکلات کا باعث تھا مگر اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ علاقہ بیرونی تسلط سے بھی بڑی حد تک آزاد تھا۔ داخلی طور پر بھی کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو باقاعدہ سیاسی اقتدار پورے ملک پر جماتی اور پھر اقتدار، قانون اور تعلیم سے کام لے کر انسانوں کو ایک

www.paksociety.com

خاص نقشے پر ڈھال لیتی۔ ایسی طاقت اگر کوئی موجود ہوتی تو وہ اسی طرح دعوت حق کو کچل سکتی تھی جیسے پہلے بعض ظالم بادشاہوں نے انبیاء کی دعوتوں کو تکمیل تک پہنچنے سے قبل روک دیا۔ بلاشبہ قریش کا بڑا گہرا اثر موجود تھا اور یہ پورے زور سے رکاوٹ بنا لیکن قریش کو پورے عرب پر باقاعدہ سیاسی تسلط حاصل نہ تھا۔ ان کا مذہبی و تجارتی اثر کتنا بھی گہرا رہا ہو، منظم حکومت کا بدل نہیں ہو سکتا۔

دینی لحاظ سے دیکھیں تو اس سرزمین کے چاروں طرف انبیاء ماسبق کی دعوتوں کے چراغ روشن رہ چکے تھے اور ان کی اقوام کے آثار آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ خداپرستی اور توحید اور اصلاح انسانیت کے فروغ کے لیے آخر اس سے بہتر علاقہ اور کون سا ہو سکتا تھا؟ یہاں دعوت حق کی آواز اٹھانے سے انسانی ذہن میں سابق انبیاء کے چھوڑے ہوئے دھندلے نقوش بہ آسانی تازہ ہو سکتے تھے۔

انسانی مواد (Human Material) بھی وہ تھا جو عرب کی سرزمین میں بہترین موجود تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے خزانے ابھی تک غیر استعمال شدہ اور محفوظ پڑے تھے۔ یہ لوگ ابھی ان مہلک روگوں سے محفوظ تھے جو روم و ایران کے بے پیمانہ تمدنوں نے پیدا کر دیے تھے۔ ان میں وحشیانہ طرز زندگی کی خرابیاں موجود تھیں مگر دوسری طرف خوبیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یہ لوگ بدویت کی وجہ سے مزاج میں فطری سادگی رکھتے تھے اور تکلفات اور تصنعات سے پاک تھے۔ آثار فطرت کا قریبی مشاہدہ رکھنے کی وجہ سے کائنات میں آیات حقیقت کو پڑھ سکتے تھے۔

گرم آب و ہوا، لو کے تھپیڑوں، دن رات کے سفروں، بھوک اور پیاس کے تجربوں اور آئے دن کے قتل و غارت کی وجہ سے ان میں سخت جانی موجود تھی اور وہ جذبۂ شجاعت کو پروان چڑھانے میں ممد بنی۔ ایک عالمی تحریک کو لے کر اٹھنے کے لیے شجاعت مند عنصر ہی مفید ہو سکتا تھا۔ ان میں فیاضی موجود تھی اور ایک بڑا کام کرنے کے لیے کوئی بخیل قوم موزوں نہ ہوتی۔

اس قوم کا حافظہ بلا کا تھا اور یہ اپنے انساب کے علاوہ اپنے گھوڑوں تک کے سلسلۂ ہائے نسب محفوظ رکھتے تھے۔ ایسے لوگ ایک نظام زندگی کی تعلیم کو اخذ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے بہترین کارکن بن سکتے تھے۔ ان میں غیرت و حمیت کا جذبہ بھی پوری طرح برسرکار تھا۔ اس لیے یہ جوہر خود کا تحفظ کر سکتے تھے۔ ان کی زبان ایک اعلیٰ، وسیع اور ترقی پذیر زبان تھی۔ اس میں فصاحت و بلاغت کا جوہر خوب نکھر چکا تھا۔ لہٰذا علمی حیثیت سے بھی وہ بآسانی آگے بڑھ سکتے تھے۔ تیز دوسروں کو کسی انقلابی پیغام سے متاثر کرنے میں زیادہ اچھی طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔

عرب عزم اور ذہن کے پکے تھے۔ وہ اگر غلط روش پر چلتے تو پورے شرح صدر سے چلتے اور مزاحمتوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرتے لیکن ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ اگر انھیں راہ راست پر ڈال دیا جائے تو پھر ان کے قدم بھی نہ ڈگمگائیں۔ یہ تمام وجوہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ حضورؐ جہاں اپنی ذات میں اپنے مشن کے لیے بہترین داعی و قائد تھے، وہاں آپؐ کو بہترین انسانی مواد بھی فراہم کیا گیا۔

ایک دین......ایک تحریک!!

حضورؐ نہ تو فلسفی تھے کہ محض چند اونچے اور گہرے خیالات دیتے اور واقعاتی احوال سے تعرض نہ کرتے اور نہ ایک واعظ تھے جو اجتماعی فساد سے آنکھیں بند کر کے محض فرد کو مخاطب بناتے اور محض اچھے اچھے وعظ سنایا کرتے اور نتائج پر سرے سے سوچا ہی نہ کرتے۔ انسانیت کے اس محسنؐ نے پورے تمدنی شعور کے ساتھ حیات انسانی کی کامل تبدیلی پیش نظر رکھی۔ ان قوتوں اور عناصر کو پہچانا جو نظام حیات پر حاوی تھیں۔ اس قیادت کو زیر نظر رکھا جو جاہلی تمدن کی گاڑی چلا رہی تھی۔

حضورؐ نے چونکہ ایک مکمل دین برپا کرنے کے لیے

www.paksociety.com

تحریک برپا کی تھی، اس لیے آپؐ نے ایک ایک کر کے سلیم الفطرت افراد کو تلاش کیا۔ پھر جس کے سینے میں بھی کلمہ حق کی شمع روشن ہوگئی اسے ایک تنظیم میں پرو دیا۔ اس کی تربیت کی۔ اسے اپنے ساتھ کشمکش کی بھٹی میں ڈالا اور پھر جس مرحلے میں جتنی منظم قوت حاصل تھی، اسے اپنی قیادت کے تحت جاہلی نظام کے خلاف معرکہ آرا کیا۔ فکری میدان میں، سیاسی میدان میں بھی اور بالآخر جنگ کے میدان میں بھی!

جو لوگ حضورؐ کے گرد جمع ہوئے ان کو آپؐ نے صوفی اور درویش نہیں بنا دیا، راہبوں اور جوگیوں کے نقشے پر نہیں ڈھالا، بدی سے بھاگنے اور غالب قوتوں سے خوف کھانے اور دولت و اقتدار سے مرعوب ہونے والی ذہنیت نہیں دی۔ وہ لوگ بھولے بھالے اور معذورانہ شان کے زاہد نہیں تھے۔ وہ جری اور بے باک، باشعور اور بصیرت مند، خوددار اور غیور، ذہین اور زیرک، فعال اور متحرک، پیش رو اور تیزگام تھے۔ وہ پادریوں اور سادھوؤں کے سے انداز نہیں رکھتے تھے بلکہ کارفرمائی کی صلاحیتوں سے آراستہ تھے۔

بہترین فطرت کے لوگ بہترین تربیت پا کر، بہترین تنظیمی رشتے سے بندھ کر اور بہترین قیادت کے ہاتھوں میں جا کر ناقابل شکست قوت بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک چھوٹی سی اقلیت ہونے کے باوجود سارے عرب کی عظیم ترین اکثریت کو اپنے سائے میں لے لیا۔ جب مکہ میں جماعت اسلامی کی تعداد ۴۰ رہتی تھی تو مکہ اور اردگرد کی آبادیوں میں اس تعداد نے ایک ہمہ وقتی مدوجزر پیدا کر دیا اور پھر برسوں تک گھر گھر اور کوچے کوچے اگر کوئی موضوع گفتگو تھا تو وہ حضورؐ کی دعوت اسلامی تھی۔ مدینہ میں جا کر ابھی تحریک اسلامی کے علم برداروں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی کہ غیر مسلم اکثریت کے علی الرغم اسلامی ریاست کی نیو ڈال دی گئی۔

حضور اکرمؐ اور آپؐ کی جماعت کا طرز یہ نہیں تھا کہ پہلے سارا عربی معاشرہ اسلام قبول کر لے یا اس کی اکثریت کی اصلاح ہو جائے تو پھر جا کر نظام اجتماعی کی تاسیس کی جائے۔ نہ نقطہ نظر یہ تھا کہ بس دعوت دیتے رہو، خیالات و اعتقادات کی اصلاح کرتے رہو، بالآخر ایک صالح نظام خود بخود برپا ہو جائے گا یا بطور انعام اللہ تعالیٰ حق کو غلبہ دے دیں گے۔ وہاں تاریخ کی یہ حقیقت سامنے تھی، کہ عوام کی بھاری اکثریت حالت جمود میں پڑی ہے اور معاشرے کا ایک قلیل عنصر فعال ہوتا ہے۔ جس میں سے ایک حصہ اصلاح یا انقلاب کی دعوت کا علمبردار ہے اور ایک حصہ مزاحمت کرتا ہے۔ اصل بازی اسی فعال عنصر کی دونوں صفوں کے درمیان ہوتی ہے اور اس کا جب فیصلہ ہو جاتا تو پھر عوام خود بخود حرکت میں آتے ہیں۔

پس جب حضورؐ کے گرد عربی معاشرہ کے فعال عنصر میں سے سلیم الفطرت افراد کی اتنی تعداد جمع ہوگئی کہ وہ اخلاقی قوت سے سرشار ہو کر جاہلی قیادت اور اس کے حامیوں کا مقابلہ کر سکے تو حضورؐ نے اپنے سیاسی نصب العین کی طرف کوئی ضروری قدم اٹھانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

بدقسمتی سے حضورؐ کے کارنامے کا سیاسی پہلو اتنا اوجھل رہ گیا کہ آج آپؐ کی دعوت اور نصب العین کا صحیح تصور باندھنا مشکل ہے۔ حضورؐ پورا دین لائے تھے۔ حق کی بنیادوں پر ساری زندگی کا نظام قائم کرنے آئے تھے۔ خدا کے قوانین عملاً جاری کرنے آئے تھے۔ اس لیے ہمیں یہ شعور ہونا چاہیے کہ حضورؐ جامع اور وسیع معنوں میں تمدنی اصلاح اور انسانیت کی تعمیر نو کی تحریک چلانے آئے تھے۔ اس تحریک کو چلانے کے لیے بہترین قائدانہ بصیرت اور اعلیٰ درجے کے سیاسی شعور سے آپؐ کی ہستی مالا مال تھی۔ جس طرح کسی اور پہلو میں حضورؐ کا کوئی ہمسر نہیں ہو سکتا، اسی طرح سیاسی قیادت کی شان میں بھی آپؐ کا کوئی ہمسر نہیں ہے، جس طرح آپؐ کی زندگی ہر معاملے میں اسوہ و نمونہ ہے، اسی طرح سیاسی جدوجہد کے لیے بھی آپؐ ہی کی ذات ہمیشہ کے لیے اسوہ و نمونہ ہے۔

حضورؐ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے نیکی کی دعوت دی۔ نیکی کے غلبے کے لیے جدوجہد کی اور نیکی کا ایک مکمل نظام قائم کر دیا۔ یہ کام مذہب کے محدود تصور کے دائرے میں سما نہیں سکتا۔ یہ دین تھا، یہ تحریک تھی۔

اصلاحِ تمدن کے لیے حضورؐ کا نصب العین

سیرتِ پاک سے صحیح استفادہ کرنے کے لیے اس اہم سوال کا جواب ضرور سامنے ہونا چاہیے کہ حضورؐ کے پیش نظر تبدیلی کا دائرہ اور کام کا پیمانہ کیا تھا؟ تمدنی نظام میں حضورؐ کوئی جزئی اصلاح چاہتے تھے یا ہمہ گیر؟ دعوت مذہبی و اخلاقی تھی یا وہ سیاسی اہمیت بھی رکھتی تھی؟ بالفاظِ دیگر تمدنی دائرہ میں نصب العین کیا تھا؟

اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں بڑی وضاحت سے موجود ہے اور مختلف پیرایوں میں تکرار سے اسلامی دعوت کا مدعا واضح کیا گیا ہے۔ خود حضورؐ کی بعثت کی غایت اور زیادہ صراحت سے بیان کی گئی اور وہ بھی ایک سے زیادہ بار۔ سورہ الصف (آیت ۹) میں فرمایا ''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور دینِ حق دے کر اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہر دین کے مقابلے میں اسے (پوری انسانی زندگی پر) غالب کر دے۔ اگرچہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔''

مدعا یہ کہ قریش اور عرب کے دوسرے مشرکین تو اپنے جاہلی نظامِ حیات کو برقرار رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا ئیں گے مگر ان کی ناگواریوں کی پروا کیے بغیر ان کے محاذِ مخالفت کو توڑ کر حضورؐ کو اقامتِ دین کرنا اور خدا کا ضابطۂ ہدایت عملاً جاری کرنا ہے۔ یہ مدعا اگر دعوتِ حق میں مضمر نہ ہوتا تو کشمکش اور جہاد اور ہجرت کے ابواب کہاں سے آتے؟ جان و مال کی قربانیاں کیوں مانگی جاتیں؟ ''حزب اللہ'' یا اللہ کی پارٹی تشکیل پاتی؟ کس نصب العین کے لیے شہدا چنے جاتے؟ قرآن اور سیرت دونوں کا فہم دعوتِ حق کے مدعا کو ذہن نشین کیے بغیر ممکن نہیں رہتا۔

ایک موقع پر جب تشدد کی چکی خوب گرم تھی، حضورؐ کے رفقا نے اپنا دکھڑا بیان کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے پہلے تو ان کو بتایا کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کی گھاٹیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں اور پھر پورے وثوق سے مژدہ سنایا کہ ''خدا کی قسم! اس مہم کو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے مرحلۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔'' پھر اس مرحلۂ تکمیل کی کیفیت بیان کی ''ایک سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔'' یعنی ایک ایسا نظامِ عدل اور دورِ رحمت چھا جانے والا ہے اور ایسا پُرامن ماحول قائم ہونے والا ہے کہ آج جہاں ڈاکے پڑ رہے اور قتل ہو رہے ہیں، وہاں مسافر کل تن تنہا اس سرزمین میں بے کھٹکے سفر کرے گا۔ کسی کو اس کے جان و مال سے تعرض کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ نصب العین کا کتنا واضح اور اجلا تصور ہے۔

درحقیقت حضورؐ کے پیش نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا، وہاں پوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا۔ جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی، وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی۔ دوسرے لفظوں میں حضورؐ نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا اور اس کی اصلاح اس کے جملہ تمدنی رابطوں سمیت کرنا چاہی۔ حضورؐ نے انسان کو مدن سے منقطع فرد کی حیثیت سے نہیں لیا اور اپنی دعوت اس کی نجی زندگی تک محدود نہیں رکھی۔ یہ حقیقت سامنے رکھیے اور حضورؐ کے نصب العین کی پوری وسعت کو ذہن نشین کر لیجیے تو پھر واقعاتِ سیرت میں پورا تسلسل دکھائی دے گا اور ہر واقعہ اور اقدام اور تدبیر کی توجیہہ ہوتی جائے گی۔

زندگی کی ہم آہنگی

محسنِ انسانیت کی مقدس تحریک نے انقلاب لا کر جو نظامِ زندگی قائم کیا اس کی امتیازی شان یہ تھی کہ اساسی کلمہ

کی روح زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں سرایت کیے ہوئے تھی۔ پورے تمدن میں ہم آہنگی تھی۔ سارے ادارے یک رنگ تھے۔ جس خدا کی عبادت مسجد کی چار دیواری میں ہوتی، اسی کی اطاعت کھیت اور بازار میں بھی ہوتی۔ جو قرآن نماز میں پڑھا جاتا تھا، اسی قرآن کے قانون کے ذریعے عدالت میں معاملات کے فیصلے ہوتے۔ جو اخلاقی اصول گھروں کی محدود فضاؤں میں کارفرما تھے، وہی بین الاقوامی دائرۂ ربط میں بھی چھائے ہوئے تھے۔ جن صداقتوں کی تعلیم منبر سے دی جاتی، انہی صداقتوں پر حکومت کا نظم ونسق چلتا۔ جو اعتقادات افراد کے ذہن نشین کرائے جاتے وہی اعتقادات اجتماعی ہیئتوں پر بھی غالب تھے۔ جو طرز فکر نظام تعلیم میں کام کرتا تھا اسی کے مطابق پوری ثقافت تشکیل پا رہی تھی، جو رضائے الٰہی نماز روزہ میں مطلوب تھی، وہی میدان جنگ میں تیر کھانے اور تلوار چلاتے ہوئے بھی مطلوب تھی۔

یہ ایک ایسا نظام تھا جس میں پوری انسانی زندگی ایک ہی خدائی ضابطۂ ہدایت کے تحت تھی اور مختلف دائروں میں مختلف اقدار اور ضابطے نہیں چلتے تھے۔ اس نظام میں تضاد نہ تھے۔ اس کے اجزاء آپس میں ٹکرانے والے نہ تھے۔ اس کے مختلف عناصر میں الجھاؤ نہ تھا۔ کوئی پیوندکاری نہیں کی گئی تھی۔ اسے معجون مرکب نہیں بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تحت انسان نے جس رفتار سے ترقی کی اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

انقلاب کی روح

انسانیت کی شاید سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ جس کسی کو بھی برسرِقوت آنے کا موقع تاریخ میں ملا ......تلوار کے زور سے، سازش کے بل پر، جمہوری انتخاب کے راستے سے یا کسی اتفاقی حادثے کے تحت۔ اسی کو اپنے متعلق یہ زعم ہوگیا کہ وہ نوعِ انسانی کا معلم اور زندگی کا مصلح بھی ہے۔ ایسے مصلحین و معلمین کے ہاتھوں جب اقتدار کا نشہ آجاتا تو وہ عقل کل بن بیٹھتے۔ وہ اپنے آپ کو بہترین مفکر سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ہر چشمۂ علم سے بے نیاز ہوکر اور معاشرہ کے بہترین ذہین اور حساس عناصر کو برطرف رکھ کر اندھادھند محیر العقول اقدامات کرنے لگتے ہیں جن میں سے ہر اقدام ایک خوف ناک حادثہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ تشدد کے ہتھیاروں سے انسان کو انسان بناتا اور زندگی کی پیٹھ پر کوڑے برسا برسا کر اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

محسنِ انسانیت نے جو انقلاب برپا کیا اس کی روح تشدد نہیں، محبت و خیرخواہی کی روح تھی۔ حضورؐ انسانیت کے لیے صد درجہ رحم دل تھے اور ابنائے آدم کے ساتھ آپؐ کو سچا پیار تھا۔ اپنی دعوت کی نوعیت کو آپؐ نے مثال دے کر سمجھایا کہ تم لوگ پروانوں کی طرح آگ کے گڑھے کی طرف لپکتے ہو اور میں تم کو کمر سے پکڑ پکڑ کر بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ قرآن نے اسی لیے آپؐ کو پیغمبر رحمت قرار دیا۔ ذرا اس حقیقت پر غور کیجیے کہ وہ ہستی اتنا عظیم انقلاب لاتی ہے مگر تشدد سے کام لینے کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

آپؐ نے سارا دارومدار اپنی دعوت کی صداقت اور اپنے کردار کی پاکیزگی پر رکھا۔ کبھی کسی پر دھونس نہیں جمائی، کبھی رعونت نہیں دکھائی، کبھی کسی کی انسانیت کی تحقیر، کبھی اکڑفوں سے کام نہیں لیا بلکہ دوسروں کی جو درحقیقت کمزور اور بے بس تھے، رعونتوں کو صبر سے برداشت کیا۔ یہی وجہ تھی کہ دشمنوں کے دل مسخر ہو جاتے۔ ساتھ آنے والے دیدہ و دل فراش راہ کرتے۔ مخالفت کرنے والے اپنے آپ کو پست اور ذلیل محسوس کرتے۔ پھر جب حضورؐ کی صداقت و شرافت کے آگے سر جھکا دیتے تو ان میں ایسی تبدیلی آتی گویا کایا پلٹ ہوگئی۔

حضورؐ کا انقلابی کلمۂ حق جس دل میں اترا، اس کی کایا پلٹ دی، جس زندگی میں داخل ہوا، اس کا نقشہ بدل دیا اور اس بیج سے نئی انسانیت پیدا ہوئی اور نشوونما پانے لگی۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

۵ فروری ۵ یادیں

"یومِ یکجہتی کشمیر" کے حوالے سے جدوجہدِ آزادی کا ولولہ تازہ کرنے والی منتخب تحریریں

نوید اسلام صدیقی

کشمیر

کا ذرہ ذرہ محبت، حسن اور عشق کی لازوال دولت سے معمور ہے۔ اس سرزمین حسین کے مکین بھی حسین ہیں۔ گھنگھور گھٹاؤں سے انکھیلیاں کرتی ہوئی ناگن زلفیں، حسن زاروں کے درمیان مچلتی جوانیاں اور آتش بازوں کے پانی کو چھونے والے مرمریں پاؤں کی حسین پازیبوں کی جھنکار۔ تھرتھراتے اجالے، سنسناتے اندھیرے، مقدر کے کھلونے تصویرِ کشمیر کا ایک ایک نقش، نقشِ آرزو دکھائی دیتا ہے۔ جہانگیر نے وفورِ جذبات میں سچ ہی کہا تھا۔

گر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کشمیر کہانیوں کا ایک وسیع و عریض سمندر ہے، جس کی تہ میں کئی بیش قیمت موتی چھپے ہوئے ہیں۔ ہر موتی کی اپنی چمک دمک اور رنگ روپ و خصوصیت ہے۔ خود کشمیر کیا ہے اور کس حال میں ہے؟ رطب اللسان ہے کہ۔

میں فکر و رازِ ہستی کا پرستار
مری تسبیح کے دانے زمانے

(تصویرِ کشمیر۔ ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ ناز)

آزاد کشمیر

قدرت اللہ شہاب کی عظیم تصنیف "شہاب نامہ" کے ایک باب "آزاد کشمیر" سے کچھ اقتباسات:

برصغیر میں جوں جوں حصولِ پاکستان کے مطالبے نے زور پکڑا ریاست کشمیر میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے مسلم کانفرنس کا پلہ بھاری ہوتا گیا۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی اسی فیصد نشستیں جیت لیں۔ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا یہ حال دیکھ کر ڈوگرہ حکومت بدحواس ہو گئی اور انھوں نے اس ریاست میں ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔ فقط راشٹریا سیوم سیوک سنگ کو جلسے کرنے اور جلوس نکالنے کی آزادی تھی۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مسلم کانفرنس نے سیاسی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کی تو اس کے تمام راہنماؤں اور بے شمار کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کا فارمولا منظور ہوا تو برصغیر کی ۵۶۲ ریاستوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے جغرافیائی اور معاشی حقائق کے پیش نظر اور آبادی کی خواہشات کے مطابق بھارت یا پاکستان سے الحاق کر

www.paksociety.com

لیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی آبادی ۸۰ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس کی سرحدوں کے ۹۰۰ میل مغربی پاکستان کے ساتھ مشترک تھے۔ ریاست کی واحد ریلوے لائن سیالکوٹ سے گزرتی تھی اور بیرونی دنیا کے ساتھ ڈاک و تار کا نظام بھی مغربی پاکستان کے ذریعے قائم تھا۔ ریاست کی دونوں پختہ سڑکیں راولپنڈی اور سیالکوٹ سے گزرتی تھیں اور کشمیر کی تمام درآمدات و برآمدات کا راستہ بھی پاکستان سے وابستہ تھا۔

ان سب حقائق کے پیش نظر کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق لازمی طور پر ایک قدرتی اور منطقی فیصلہ ہونا چاہیے تھا لیکن مہاراجہ ہری سنگھ اور کانگریسی لیڈروں کے دلی عزائم اس فیصلے کے بالکل برعکس تھے۔ اپنے مذموم عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ مل کر سازشوں کا ایسا جال بنا جس کے پھندے میں مقبوضہ ریاست کے بے بس اور مظلوم باشندے آج تک بُری طرح گرفتار ہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوا تو ضلع گورداس پور کی آبادی میں واضح مسلمان اکثریت کے باوجود اسے بغیر کوئی وجہ بتائے انتہائی شرانگیز بدنیتی کے ساتھ بھارت کو دے دیا گیا تھا۔ کیونکہ گورداسپور کے بغیر بھارت کو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کا موقع ہاتھ آسکتا نہ راستہ مل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اب ایسے تاریخی آثار و شواہد منکشف ہو رہے ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بذات خود اس سازش میں پوری طرح ملوث تھا۔

پاکستان کے وجود میں آتے ہی مہاراجہ ہری سنگھ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ جموں کے صوبے میں پوری مسلمان آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس مہم کی کمان مہاراجہ نے خود اپنے ہاتھ میں لے کر مسلم رعایا کا قتل عام شروع کرادیا۔ علاوہ ازیں لوٹ مار، خواتین کی بے حرمتی اور جوان لڑکیوں کے اغوا کی جو قیامت برپا ہوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ صوبہ جموں کے بیشتر علاقے

دخترِ کشمیر

رویائے نگاریں ہے
رخسار کے انگارے
نظارہ خوابی ہے
کیا شعلہ تابی ہے
اور آنکھ جبابی ہے
یا چادر آبی ہے
اک پھول کی پتی ہے
نظروں میں حیا پنہاں
یا ہونٹ گلابی ہے
انداز حجابی ہے
گردن وہ صراحی سی
گفتار میں وہ جادو
مینائے شرابی ہے
افسون زبابی ہے
وہ دست حنا آلود
پیکر میں بہر عنواں
پھولوں کی رکابی ہے
فردوس خیابی ہے
آواز میں جادو ہے
پرواز عقابی ہے
شاہکار میں فطرت کے
قد سرو چنار اس کا
بس ایک خرابی ہے
اور روپ شہابی ہے
''کشمیر کی بیٹی'' ہے
زلفیں ہیں کہ سنبل ہے
کچھ بس میں نہیں اس کے
پرواز سحابی ہے
تقدیر کی بیٹی ہے

([illegible])

www.paksociety.com

میں مسلمان آبادی کا صفایا کرنے کے بعد اب مہاراجہ نے مسلمانانِ پونچھ کی طرف اپنا رخ پھیرا۔

پونچھ کی آبادی میں ۹۵ فیصد مسلمان تھے۔ اس آبادی کا ایک کثیر حصہ ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل تھا جو دوسری جنگِ عظیم میں دنیا کے کئی محاذوں پر دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ صوبہ جموں کے مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں سن کر ان کا خون پہلے ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ گلگت میں مقامی مسلمانوں نے علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے اور مہاراجہ کی حکومت جڑ سے اکھاڑ کر آزادی کا اعلان کرنے والے ہیں۔

اس پس منظر میں مہاراجہ کے بہیمانہ عزائم کو بھانپ کر پونچھ کے غیور اور بہادر مسلمانوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کے ساتھ الحاق کا عزم بالجزم کر لیا۔ سارے علاقے میں ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ گونجنے لگا۔ ڈوگرہ حکومت نے جگہ جگہ اپنی فوج اور پولیس کی تعداد بڑھا کر عوام الناس کو تشدد سے کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن مقامی مسلم گوریلے دستے منظم ہوتے گئے اور انھوں نے پے در پے ڈوگرہ فوج کے چھکے چھڑا کر اپنی سرزمین ڈوگرہ حکومت کے پنجۂ استبداد سے آزاد کروانا شروع کر دی۔

مسلمانوں کی ان جنگی کارروائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ پونچھ شہر اور اس کے گرد و نواح کا تھوڑا سا رقبہ چھوڑ کر باقی سارا علاقہ آزاد تھا۔ یہ آزادی مٹھی بھر گوریلوں نے اپنے اپنے طور پر مقامی مجاہدین کو منظم کر کے جسم و جان کی بے مثال قربانیاں دے کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل کی تھی۔ جب پونچھ کا بیشتر علاقہ آزاد ہو کر ڈوگرہ حکومت کی لعنت سے پاک ہو گیا تو رفتہ رفتہ چاروں طرف پھیلے ہوئے گوریلا قائدین اور مجاہدین کا بھی آپس میں رابطہ ہوتا گیا اور ۱۹۴۷ء کے ماہ اکتوبر کے وسط میں انھوں نے ایک مرکزی جنگی کونسل قائم کر لی۔ اس کے بعد آزاد شدہ علاقے کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں و کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے صدر سردار محمد ابراہیم خاں تھے۔

مسئلہ کشمیر اور پاکستان

کشمیر کے نام پر پاکستان میں کیا ہوتا رہا؟ یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ۲ رفقا کو ۱۹ ماہ جیل میں گزارنے پڑے۔ مولانا اسلامی دستور کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حکومت نے الزام لگایا کہ مولانا ''جہادِ کشمیر'' کے خلاف ہیں، وہ اس کو شرعی طور پر جائز نہیں سمجھتے۔ اس لیے سیفٹی ایکٹ کے تحت اکتوبر ۱۹۴۸ء میں نظربند کر دیے گئے۔

۱۹۶۵ء میں ایوب خاں نے کشمیر کو آزاد کرانے کا منصوبہ بنایا۔ بھٹو صاحب ان دنوں وزیرِ خارجہ تھے۔ انھوں نے ایوب خاں کو اطمینان دلایا کہ آپ کشمیر میں بے فکر ہو کر اپنے منصوبے پر کام کرتے رہیں، بھارت بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گا لیکن بھارت نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بین الاقوامی سرحد پار کر لی اور لاہور، سیالکوٹ اور قصور کے محاذ پر جنگ چھیڑ دی۔ دو تین ہفتے کی جنگ کے بعد جنگ بندی ہوئی۔ دونوں ملکوں میں معاہدۂ تاشقند ہوا جس کے بعد دونوں ملکوں کی افواج نے ایک دوسرے کے ملک میں قبضہ شدہ علاقے چھوڑ دیے۔ بھٹو نے عوام کو بتایا کہ تاشقند میں مستقبلِ کشمیر کے بارے میں جو فیصلہ ہوا ہے، وہ مجھے قبول نہیں۔ بھٹو نے وزارتِ خارجہ چھوڑ دی۔ پوری قوم انتظار کرتی رہی کہ بھٹو صاحب معاہدۂ تاشقند کی حقیقت سے قوم کو آگاہ کریں گے لیکن بلی تھیلے سے باہر نہ آئی۔

ضیاء الحق صاحب کا دور آیا۔ معلوم ہوا کہ ہمیں علم ہی نہ ہو سکا اور کشمیر کے سیاچین گلیشیر کے ایک بڑے حصے پر بھارت نے قبضہ کر لیا۔ ضیاء الحق نے قوم کو بتایا کہ سیاچین پر گھاس کا تنکا بھی نہیں اُگتا۔

پھر مشرف صاحب کا دور آیا۔ آپ نے سوچا کہ مجھے بھی کشمیر کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ چنانچہ کارگل مہم جوئی کا منصوبہ بنایا۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس کارگل مہم جوئی میں دونوں جنگوں (۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء) سے زیادہ فوجی شہید ہو گئے۔

www.paksociety.com

ذیل میں "راولپنڈی سازش کیس" (۱۹۵۱ء) کے اسیر ظفراللہ پوشنی کے ایک انٹرویو سے اقتباسات دیے جا رہے ہیں۔

راولپنڈی سازش "فردِ واحد" یعنی جنرل اکبرخاں کا منصوبہ تھا، جنھوں نے باقی افراد کو اس میں "گھسیٹ" لیا۔ اکبر خاں کشمیر میں ہندوستانی فوج کے خلاف کارروائیوں کے انچارج تھے۔ وہ حکومتی پالیسیوں سے جنھوں نے کشمیر میں فوجی مہم جوئی کو ناکام دے رکھی تھی سخت نالاں تھے۔ یہ بے اطمینانی بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی بابت سوچنے لگے۔ اس ضمن میں نزدیکی رفقا سے، جن میں سازش کیس کے ملزمان کے علاوہ دیگر اور لوگ بھی شامل تھے، اس مسئلے پر بات چیت شروع کر دی۔ اکبرخاں کی زوجہ نسیم جہاں بھی ان کی حمایتی تھیں۔

منصوبہ کیا تھا؟ اس ضمن میں پوشنی صاحب کہتے ہیں: "منصوبہ یہی تھا کہ گورنر جنرل اور وزیراعظم کو گرفتار کر لیا جائے۔ گورنر جنرل حکومت برطرف کر دیتے۔ اس کارروائی کے بعد نئی حکومت، جس کے سربراہ غالباً جنرل اکبرخاں ہی ہوتے، فوج کی نگرانی میں انتخابات کا انعقاد کرواتی۔"

پوشنی صاحب کے مطابق ان دنوں پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی پر حکومت کا بدترین دباؤ تھا، کئی پارٹی راہنماؤں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے۔ یہ بات پیشِ نظر رکھتے ہوئے بیگم نسیم نے کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری سجاد ظہیر سے رابطہ کیا۔ فیض احمد فیض کو بھی، جو اس وقت "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر تھے، منصوبے کے متعلق سے شاملِ گفتگو کیا گیا۔ خیال یہی تھا کہ لیاقت علی خاں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد جو نئی حکومت بنے، اس کی کمیونسٹ پارٹی حمایت کرے اور اسے اخبارات کا تعاون ملے۔

ظفراللہ پوشنی کی جنرل اکبرخاں سے ملاقات میجر اسحاق کے توسط سے ہوئی، جو ان دنوں جنرل اکبرخاں کی بریگیڈ کا حصہ تھے۔ پوشنی صاحب میجر اسحاق کی سرپرستی میں کام کر چکے تھے اور دونوں کے درمیان اچھے روابط تھے۔ ۲۳ رجنوری ۱۹۵۱ء کو جنرل اکبرخاں کے گھر وہ اجلاس ہوا، جسے بعد میں پنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا۔ اس میں ظفراللہ پوشنی بھی شریک تھے۔ ان کے مطابق سات آٹھ گھنٹے کی بحث، مغزماری اور معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد منصوبہ اتفاقِ رائے سے مسترد کر دیا گیا۔ بنیادی سبب مشرقی پاکستان تھا، جہاں تعینات فوج میں انتشار پھیلنے کا خدشہ تھا۔ ان کے بقول "بے شک حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ تھا اور جنرل اکبرخاں ہی نے پیش کیا، تاہم یہ رد کر دیا گیا تھا۔"

"راولپنڈی سازش کیس" میں مجموعی طور پر ۱۵ افراد کو حراست میں لیا گیا۔ سب سے زیادہ مشہور قیدی فیض احمد فیض تھے۔ پوشنی صاحب کہتے ہیں "اسے میری خوش بختی کہیے کہ پسِ زنداں مجھے فیض اور سید سجاد ظہیر جیسے جید اردو دانوں کی صحبت میں وقت گزارنے کا موقع ملا۔ یوں اپنی قومی زبان میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ فیض صاحب اور سید صاحب کے پاس اردو ادب کا کافی ذخیرہ تھا، جس سے میں مستفید ہوا۔"

بھارت کشمیر پر کیوں قابض رہنا چاہتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے تمام اہم دریا کشمیر سے نکلتے ہیں۔ مستقبل میں پانی کی فراہمی کو برقرار رکھنے کے لیے بھارتی حکمران کشمیر پر اپنا قبضہ جاری رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

دوسری بڑی وجہ کشمیر کا جغرافیائی محلِ وقوع ہے۔ اس کی سرحدیں دوسرے ملکوں کے علاوہ چین سے ملتی ہیں۔ چین کو ایشیا میں بھارت اپنا حریف سمجھتا ہے اور امریکا چینیوں کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتا ہے۔ امریکا سے اب بھارت کے اسٹرٹیجک تعلقات ہی نہیں بلکہ فوجی اور سول جوہری معاہدے بھی ہیں۔ یہ وہ پس منظر ہے جس کی وجہ سے بھارت مقبوضہ کشمیر چھوڑنا نہیں چاہتا۔

(اصغر احمد چوہدری)

www.Paksociety.com

معاشیات

اس امر سے قطعی انکار ممکن نہیں کہ ''اللہ کی زمین اور اس میں موجود خزانوں سے فائدہ اٹھانے کا حق ہر اس ذی حیات کو ہے جو حیات مستعار کے ساتھ اس دنیا میں موجود ہے۔'' انسانی زندگی کی بے شمار ضروریات اور لاتعداد خواہشات جبکہ ذرائع آمدن محدود ہیں۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ زندگی کے ان دونوں پہلوؤں میں بہترین ہم آہنگی ہو۔ اس کا واحد حل ضروریات اور خواہشات کی حد مقرر کرنے اور ذرائع آمدن میں اضافہ کرنے سے ہی ممکن ہے۔ نظری طور پر تو یہ بات بہت خوبصورت ہے لیکن عملی طور پر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ حصول دولت، اس کی گردش، تقسیم اور استعمال عدل و انصاف کے ساتھ معاشرے کے تمام طبقات کو یکساں قابل قبول ہو اور لامحدود انسانی خواہشات کو محدود وسائل سے پورا کیا جا سکے۔ اسی مطالعہ و تحقیق کا نام معاشیات Economics ہے۔

فرد کی انفرادی سطح پر بات کریں یا کسی چیز کی اکائی کے حوالے سے بات کریں تو یہ جزیاتی معاشیات Micro Economics کہلائے گی اور اگر حکومت، اداروں، تنظیموں، کمپنیوں یا افراد کی بحیثیت مجموعی بات کریں گے تو یہ کلیاتی معاشیات Macro Economics کہلائے گی۔

پاکستان میں معاشیات کی تعلیم

سوشل سائنسز میں آپ اپنی عملی زندگی کا آغاز ۴ سالہ بی ایس یا ایم ایس سی کے ذریعے کر سکتے ہیں، لیکن آپ کے پروگرام میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ آپ کو پیشہ وارانہ ترقی کے لیے بی ایس یا ایم ایس سی پر ہی اکتفا نہیں کرنا بلکہ پی ایچ ڈی کی طرف جانا ہے، خواہ آپ تدریس کا شعبہ اپنائیں یا کسی دوسرے شعبہ کا انتخاب کریں۔

پاکستان میں معاشیات کی تعلیم ہر سطح اور ہر علاقہ میں بہ آسانی دستیاب ہے۔ مثالی نکتہ نظر تو یہ ہے کہ طالب علم میٹرک یعنی (9-10) کلاس میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرلے اور اسی کے مطابق ایف اے/ ایف ایس سی کے مضامین کا تعین کرے۔

☆ ایف اے/ ایف ایس سی میں معاشیات کا مضمون تقریباً ہر کالج میں دستیاب ہے اور اس کے بعد گریجوایشن کے لیے ۲ راستے ہیں۔

۱۔ بی ایس (معاشیات) ۴ سالہ پروگرام جس کے بعد ایم ایس اور پھر پی ایچ ڈی ممکن ہے۔

۲۔ بی اے/ بی ایس سی ۲ سالہ پروگرام میں معاشیات اختیاری مضمون کے طور پر پڑھیں گے۔ اس صورت میں آپ کو معاشیات میں ایم اے/ ایم ایس سی کرنا ہوگی۔ اس کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی ہو سکے گی۔ یاد رکھیں محض ۲ سالہ بی اے/ بی ایس سی بے فائدہ ہے۔

☆ بی اے/ بی ایس سی اور بی ایس پروگرام میں داخلہ کے لیے ایف اے/ ایف ایس سی میں معاشیات کے مضمون کو نہ صرف ترجیح دی جاتی ہے بلکہ بعض جگہوں پر لازمی ہے۔

☆ آپ بی کام یا بی اے کر کے بھی معاشیات میں ایم اے/ ایم ایس سی کر سکتے ہیں۔

☆ یوں تو ایم اے/ ایم ایس سی میں پڑھائے جانے والے مضامین کی تعداد زیادہ نہیں لیکن ان میں ذیلی شعبوں کی تعداد تقریباً ۱۱ ہے۔

جزیاتی معاشیات Micro Economics اور کلیاتی معاشیات Macro Economics کی بڑی تقسیم کے علاوہ جو بڑے بڑے شعبے (Specialization) آج موجود ہیں، ان میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ مالیاتی معیشت
۲۔ بینک کی معیشت
۳۔ حکومتی معیشت
۴۔ صنعتی یا کاروباری معیشت

۵۔ زرعی معیشت
۶۔ ماحولیاتی معیشت
۷۔ علاقائی معیشت
۸۔ صارفین کی معیشت
۹۔ معاشیات اور قانون
۱۰۔ معاشیات اور مینجمنٹ
۱۱۔ بین الاقوامی تجارت اور مالیات

اخراجات

- بی اے / بی ایس سی کی فیس تقریباً ۳۰ ہزار روپے سالانہ ہے۔
- بی ایس پروگرام کی فیس تقریباً ۳۰ ہزار روپے سالانہ ہے۔
- بی ایس پروگرام (نجی تعلیمی اداروں) کی فیس تقریباً ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ روپے سالانہ ہے۔

کار ملازمت

کسی خاص شعبے کے چند ایک مخصوص کاموں کے علاوہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو تقریباً تمام ماہرین معیشت کو انجام دینے ہوتے ہیں۔

☆ اپنی مہارت کے شعبے میں اقتصادی امور اور اعداد و شمار کا مسلسل مطالعہ۔

☆ اقتصادی تعلقات کے حوالے سے بروقت، مفید مشورے اور راہنمائی۔

☆ سائنسی بنیادوں پر اعداد و شمار کا حصول، تجزیہ اور ایسی رپورٹ کی تیاری جس کے ذریعے اقتصادی صورت حال کے علاوہ مستقبل میں مارکیٹ کے رجحان کی وضاحت ہو سکے۔

☆ اقتصادی مشکلات کے حل کے لیے مفید مشورے، پالیسی سازی اور منصوبہ بندی کی تیاری۔

☆ اقتصادی پالیسی اور مستقبل کے حالات سمجھنے کے لیے اقتصادی راہنمائی اور معیارات سازی۔

☆ قانون ساز اداروں اور قومی معاشی پالیسی کے لیے نفع و نقصان کی بنیاد پر تجاویز کی تیاری۔

☆ طلبہ و طالبات کے تحقیقی مقالوں اور پراجیکٹ کی راہنمائی اور سرپرستی۔

☆ تعلیمی اداروں میں تدریس اور پالیسی ساز اداروں میں تحقیقی مقالے پیش کرنا۔

معاشیات کے شعبے میں آنے کے لیے مطلوبہ شخصی خوبیاں

شخصی خصوصیات

کسی شعبے کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کے ضمن میں شخصی خصوصیات کا کردار سب سے اہم ہے، درست فیصلہ تک پہنچنے کے لیے ان کا واضح فہم و ادراک ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ معاشیات کا شعبہ اپنانے کے لیے درج ذیل خصوصیات ضروری ہیں۔

۱۔ تجسس

مختلف مسائل پر مسلسل غور و فکر اور ان کے حل کی تلاش، حقائق تک رسائی، فکری اور نظری حل کی فراہمی۔

۲۔ روایت پسندی:

اصول پسندی بلکہ کسی قدر اصول پرستی جو ایک نظام کو قائم رکھ سکے اور دی گئی ہدایات پر پوری طرح عمل درآمد کر سکے۔ قاعدے اور ضابطے کا سختی تعین اور نفاذ۔

۳۔ مضبوط قوت فیصلہ:

آپ میں قوت فیصلہ کی موجودگی ضروری ہے۔ ایک ایسی قوت فیصلہ جو ایک جانب زمینی حقائق اور دوسری جانب مستقبل کے امکانات کا درست تعین کر کے فیصلہ کرے اور معاشی طور پر فرد، ادارہ، حکومت اور عوام بہتری محسوس کریں۔

www.Paksociety.com پاک سوسائٹی ڈاٹ کام www.paksociety.com www.Paksociety.com

۴۔ حالات حاضرہ:

حالات حاضرہ میں ایسی علمی دلچسپی ہو افراد اور اداروں کے شب و روز میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں محسوس کرے، آئندہ حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے اور اسکے مطابق معاشی پالیسی کے خدوخال وضع کیے جاسکیں۔

۵۔ رواں زبان:

اوسط درجے سے کچھ بہتر رواں زبان کا استعمال جو پیچیدہ امور کو باسانی دوسروں تک پہنچا سکے۔

۶۔ نظم و ضبط:

اچھا ماہر معیشت بننے کے لیے ضروری ہے کہ ذہن اور عمل دونوں میں ہر لحاظ سے نظم و ضبط پایا جائے اور ذہنی اور فکری یکسوئی اس کی بنیاد ہے۔

اضافی مگر ضروری معلومات

اپنی عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ اگر مندرجہ ذیل اُمور پر توجہ دیں تو آپ کی پیشہ وارانہ مہارت میں اضافہ ہوگا اور پیداواری صلاحیت بھی بڑھے گی۔

۱۔ ریاضی:

اس میں عمومی دسترس کے ساتھ الجبرا، کیلکولس اور شماریات کے اصولوں اور اسکے عملدرآمد پر اچھی مہارت ہونی چاہیے۔

۲۔ انگریزی:

چونکہ آج کے تمام نظام کا انحصار انگریزی پر ہے، اس لیے اردو کے علاوہ انگریزی میں بہتر ابلاغی مہارت ضروری ہے۔ دونوں زبانوں میں تحریر اور تقریر کی بہترین صلاحیت آپ کو معاشیات کے شعبے میں آگے بڑھنے میں مدد دے گی۔

۳۔ حکومتی نظام:

دنیا کا کوئی بھی نظام معیشت حکومتی پالیسی کے ساتھ براہ راست منسلک ہوتا ہے۔ ایک ماہر معیشت اگر حکومتی نظام اور پالیسی، قانونی حدود اور اصول و ضوابط سے واقف نہیں ہوگا تو اسے قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۴۔ کمپیوٹر:

کمپیوٹر آج ہماری زندگی کے تمام تر پہلوؤں میں داخل ہو چکا ہے، معاشیات میں کئی ایک سوفٹ ویئر تیار ہو چکے ہیں۔ ان تمام بنیادی نوعیت کے سوفٹ ویئر کے استعمال میں اچھی مہارت آپ کو بہت فائدہ دے گی۔

ملازمت کے مواقع

اس شعبے میں تعلیم حاصل کرنے والے افراد درج ذیل حیثیتوں میں خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

۱۔ معاشیات کے لیکچرار یا پروفیسر
۲۔ ماہر معیشت
۳۔ معاشی تحقیق کار
۴۔ مشیر برائے اقتصادی امور
۵۔ ماہر ذرائع آمدن
۶۔ پراجیکٹ اکاؤنٹنٹ
۷۔ ماہر اقتصادی ترقی
۸۔ اقوام متحدہ کے مختلف ادارے
۹۔ تھنک ٹینک اور دیگر تحقیقی ادارے
۱۰۔ غیر سرکاری ادارے (این جی اوز)
۱۱۔ ذرائع ابلاغ (ٹی وی چینلز، اخبارات و رسائل)
۱۲۔ سی ایس ایس کے ذریعہ مختلف سرکاری شعبوں میں شمولیت
۱۳۔ دیگر معاشی شعبہ جات میں نمایاں اور ممتاز حیثیت کے طور پر خدمات
۱۴۔ حکومت پاکستان کا اقتصادی امور کا شعبہ جس میں خصوصی طور پر معاشیات میں ایم اے/ ایم ایس سی کی تعلیم کے حامل افراد کو ملازمت دی جاتی ہے

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

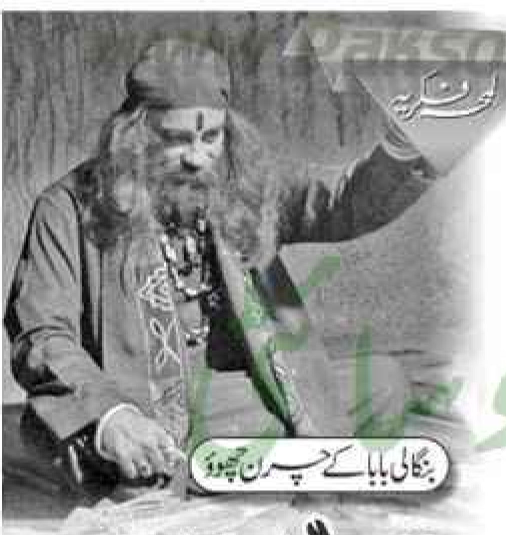

محبوب آپ کے قدموں میں

ان خواتین کے لیے ایک تازیانہ جو فرضی عاملوں کا شکار بن کر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتی ہیں

فرحت نثار

جادو

وہ جو سر چڑھ کر بولے، کالے جادو کے توڑ کے ماہر بنگالی بابا، محبوب آپ کے قدموں میں ——

یہ اور اسی قسم کے اشتہار جمیں اکثر دیواروں پر، اخبارات اور رسائل میں نظر آتے ہیں۔ کئی باباؤں کا دعویٰ ہے کہ ان کے قبضے میں بد روحیں، جن، بھوت وغیرہ کوئی بھی کام کرنے پر قادر ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قرآنی آیات کے ذریعے جھاڑ پھونک کرتے ہیں۔ حقیقت جو بھی ہو یہ بھی ہے کہ "جادو" یا روحانیت کے ذریعے لوگوں کے کام کرنا کاروبار بن چکا۔

یوں تو بد اخلاقی، کسی کا مال کھانا، قطع رحمی کرنا، والدین کی اطاعت نہ کرنا، بے ایمانی، جھوٹ، فرائض میں غفلت وغیرہ سب شیطانی عمل ہیں، مگر دورِ جدید میں مخالفین پر جادو کرنا بہت عام ہو چکا جو قطعاً شیطانی عمل ہے۔ اسلام کی رو سے جادوگر اور جادو کروانے والا، دونوں کافر ہیں۔ اس کے باوجود یہ عمل کاروبار بن چکا۔ جگہ جگہ نام نہاد عاملوں کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ باقاعدہ اخبارات اور رسائل میں اشتہارات دیے جاتے اور دیواروں پر پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔

افسر کو مٹھی میں بند کرنا، کسی ادارے یا گھر میں نفاق ڈلوانا، میاں بیوی میں علیحدگی کرانا، پسند کی شادی کروانا، شادی میں رکاوٹ دور کرانا، عدالتی کیس کا فیصلہ مرضی کے مطابق ہونا، دشمن کا گھر برباد کرنا، کاروبار ختم کرانا —— غرض وہ کون سے شیطانی فعل ہیں جو یہ عامل انجام نہیں دیتے۔ حالانکہ یہ بھی ایسے کام ہیں جنھیں ایک شریف آدمی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

میں طویل عرصہ مختلف اداروں کی سربراہ رہی ہوں۔ شوہر مرحوم سینئر ایڈووکیٹ تھے۔ چنانچہ اپنی ملازمت کے حوالے اور شوہر مرحوم کی وساطت سے عموماً خواتین سے واسطہ رہا۔ خواتین کی اکثریت ہمیشہ مسائل کا شکار دکھائی دی اور وہی عورتیں عاملوں کے آستانوں کا چکر کاٹتی ہیں۔ یہ نام کی مسلمان ہوتی ہیں کہ وسوسے اور شکوک و شبہات

ان پر غالب رہتے ہیں۔ احکامات شریعہ کے مطابق زندگی گزارنے کا دور سے بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ دوسروں کے لیے برا سوچنے اور اذیت دینے میں جواب نہیں رکھتیں۔ منفی سوچوں کی مالک ہوتی ہیں۔ مشترکہ خاندانی نظام میں رہیں تو دیگر افراد خانہ کے لیے غلط منصوبے بناتی اور سب کو آپس میں لڑوائے رکھتی ہیں۔ اپنے اوپر ظلم کی خود ساختہ

www.paksociety.com

کہانیاں گھڑنے میں ماہر ہوتی ہیں۔

گھریلو ذمے داریاں بخوشی قبول کرنے کے بجائے اپنے پر زیادتیوں کا رونا روتی ہیں۔ کبھی خوش دکھائی نہیں دیتیں، نہ ہی دوسروں کو خوش ہونے دیتی ہیں۔ اذیت پسندی ان کا مشغلہ ہے۔ کہیں ملازم ہوں تو اداروں کا سکون برباد کرکے رکھ دیتی ہیں۔ کسی کو چین سے نہیں رہنے دیتیں۔ سمجھوتا کرنا ان کی گھٹی میں نہیں ہوتا۔ اپنے فرائض نبھانے کے بجائے سیاسی سہاروں اور سفارشوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ ادھر زور نہ چلے تو پھر جادو کا حربہ آزمانے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا، فرائض کی بجا آوری کے بجائے انتظامی امور میں مداخلت کرنا، پارٹی بازی، افواہیں پھیلانا، بلیک میلنگ اور غیر اخلاقی گفتگو کرنا، اسلامی اقدار کے منافی لباس پہننا ان کا وتیرہ ہے۔ گھنٹوں ٹیلی فون سے منسلک رہنا، کسی کو اپنا بڑا نہ سمجھنا اور شوہر کو پیٹھ پیچھے برا کہنا ان کی عادت ہے۔

پنجابی کا محاورہ ہے: عورت کی مت اس کے گٹے میں ہوتی ہے، یعنی عورت کم عقل ہوتی ہے۔ گو میں اس بات پر یقین نہیں رکھتی، لیکن یہ سچ ہے کہ عاملوں کے چنگل میں پھنسنے والی عورتیں انتہائی احمق ہوتی ہیں۔ یہ خواتین اپنے گھروں سے متعلق تمام حالات عاملوں سے حرف بہ حرف کہہ ڈالتی ہیں۔ چنانچہ چالاک عامل سب کچھ جان کر جھوٹے فسانے بناتے اور پھر بتاتے ہیں کہ ان پر سخت جادو کیا گیا۔ میں نے کبھی کسی عورت کو عامل کے پاس جا کر یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ دعا کیجیے، میرے گھر میں خیر ہو، اتفاق و برکت جنم لے، رزق حلال آئے۔ چھوٹے بڑوں کا ادب کریں۔ بزرگوں کا سایہ ہم پر قائم رہے۔ ہم غریب بیمار اور دکھی لوگوں کے کام آئیں۔ اپنے ملک کی سلامتی اور خوشحالی کے لیے کچھ کر سکیں۔ ایمان کی سلامتی ہو۔

عاملوں کی متلاشی ۱۰۰ فیصد خواتین منفی مقاصد رکھتی ہیں مثلاً گھر سے ساس سسر چلے جائیں، شوہر والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی مالی یا اخلاقی مدد نہ کرے، شوہر کا کوئی دوست نہ ہو، گھریلو معاملات میں قطعاً کوئی دخل نہ دے، بھابی کی نند کا گھر اجڑ جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ بعض اوقات مرد کا دماغ ماؤف کرنے کے لیے الو کا گوشت کھلایا جاتا ہے۔ ان بے وقوف خواتین کے باعث ایسے کئی المناک واقعات جنم لیتے ہیں جن کی داستان سنتے ہوئے دل لرز اٹھتا ہے۔ یہ خواتین نہ صرف اپنی بلکہ معصوم بیٹیوں کی عزت بھی جھوٹے عاملوں سے تار تار کروا بیٹھتی ہیں۔

میں نے ایک بار حقائق جاننے کے لیے کئی عاملوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنے متعلق جھوٹے سچے دکھ سنائے۔ کسی کو ایسا نہیں پایا کہ وہ میرے بارے میں حقیقت جان پاتا۔ ہاں پریشانیوں سے نجات کے لیے عمل کرنے کی پیشگی فیس ہزاروں روپے ضرور طلب کی گئی۔ کئی سال پہلے ایک واقعہ کسی ہفت روزہ میں پڑھا۔ ۲ بہنیں ایک ہی عامل کے پاس جاتی رہیں تاکہ اولاد ہو سکے۔ ایک بہن کے ہاں بچی پیدا ہوئی، دوسری کے ہاں بیٹا۔ جوان ہونے پر برادری کے بزرگوں نے ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرنا چاہا، مگر دونوں بہنیں اس کے حق میں نہ تھیں۔ تب یہ انکشاف ہوا کہ دونوں بچے ایک ہی عامل کی اولاد ہیں۔

اسی طرح ایک اعلیٰ عہدیدار خاتون کو عامل نے ایسا وقت دیا جب وہ اپنے کمرے میں بالکل اکیلا تھا۔ اس نے خاتون کو دم شدہ پانی پینے کے لیے دیا۔ خاتون نے پانی پی تو لیا، مگر اسے شک گزرا کہ اس میں کوئی چیز ملی ہوئی ہے۔ خاتون خطرہ بھانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی، اپنی گاڑی چلاتے ہوئے گھر پہنچی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ پھر کئی گھنٹوں بعد اسے ہوش آیا، تو اس نے اپنی عزت بچنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

عاملوں کی طرف سے خواتین کو جو تکالیف پہنچتی ہیں، مثلاً دولت اور عزت برباد ہونا، یہ الگ کہانی ہے۔ اصل سزا جو اللہ رب العزت کی طرف سے ملے، وہ بڑی عبرتناک ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جو بیوی بیٹے کو اس کے ماں باپ سے جدا کر دے، اسے بے وقت موت

مرتے دیکھا گیا۔ ایسی خواتین کسی موذی بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد باقی عمر سسک سسک کر گزارتی ہیں۔ بعض اوقات جادو کے عملیات کا اثر الٹا ہو جاتا ہے مثلاً اچانک میاں بیوی میں علیحدگی عمل میں آتی یا بیوی پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ سب رشتے دار اور دوست ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسی کئی خواتین کو ماہر نفسیات کے زیر علاج دیکھا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مصائب سے چھٹکارے کا ایک ہی حل ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے توبہ کرنا، خدا کے بتائے ہوئے رستوں پر چلنا اور ان پر ثابت قدم رہنا۔ کئی خواتین اپنے پر خود ساختہ پریشانیاں طاری کر لیتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ان کی تربیت صحیح نہ ہونا ہے۔ عموماً والدین اپنی بیٹیوں کو یہ باور نہیں کراتے کہ انھوں نے والدین کا گھر چھوڑ کر سسرال جانا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ جو ماں اپنی بیٹی کی تربیت صحیح اسلامی خطوط پر نہ کرے، اسے خانگی امور اور خانہ داری میں طاق نہ کر دے، وہ ماں کہلانے کا حق نہیں رکھتی اور نہ قدموں کے نیچے جنت کہلوانے کی حقدار ہے۔ بیٹی کی ناقص تربیت ہی آگے چل کر پریشانیوں اور مسائل کا سبب بنتی ہے۔

ہونا یہ چاہیے کہ اگر گھر داری کی تربیت میں کوئی کمی ہے، تو عورت اپنی عقل سے گھر چلانا سیکھے۔ کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی تو دوستوں، بزرگوں اور کتابوں، رسالوں سے مدد لے اور کبھی خود ساختہ پریشانیاں اپنے اوپر طاری نہ ہونے دے۔ گلے شکوے کرنا اور اذیت پسندی کو اپنی زندگی سے نکال دے۔ دینی کتب کا مطالعہ کرے اور اپنا گھر مجسموں و غیر ضروری تصاویر سے سجانے کے بجائے قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے لی گئی مسنون دعاؤں سے سجائے۔ خود تلاوت قرآن پاک کو معمول بنائے۔ دوسروں کے لیے اچھا سوچے اور ہو سکے تو ان کو فائدہ پہنچائے۔ یوں اس کی زندگی میں کبھی پریشانیاں نہیں آئیں گی اور نہ ہی کسی عامل کی ضرورت پڑے گی۔

اب ذرا جادو کے اصل حقائق بھی دیکھ لیجیے۔

بے شک جادو برحق ہے۔ یعنی اگر کوئی جادو کرے تو ہو جاتا ہے، کیونکہ نبی پاک ﷺ پر بھی اس کا اثر ثابت ہے۔ جادو کا توڑ کرنے کے لیے سورۃ اخلاص اور سورۃ الناس کا ورد کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ خالصتاً شیطانی عمل ہے، لہٰذا ہر نماز کے بعد شیطان مردود سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگیے۔ چاروں قل شریف کا ورد معمول میں شامل کیجیے۔

اگر کوئی خاتون مختلف مسائل مثلاً جسم میں خلاف معمول گڑبڑ، ماہانہ نظام کی خرابی، میاں بیوی کا آپس میں الجھنا، خوشگوار تعلقات کے بجائے سرد مہری سے پیش آنا، ماں باپ اور بیٹے کے درمیان قطع تعلقی، بے چینی، رزق میں بے برکتی، کاروبار میں نقصان، دماغ کا ماؤف رہنا، زندگی سے اکتانا وغیرہ میں مبتلا ہو تو اسے قطعاً نظرانداز نہ کرے اور اللہ سے لو لگا کر ان کے سدباب کی کوشش کرے۔

ایسے مسائل ضروری نہیں کہ صرف ان خواتین کو پیش آئیں جو ہمہ وقت عاملوں کے اردگرد چکر لگاتی پھرتی ہیں۔ کبھی عام زندگی گزارنے والے اور کسی کو تکلیف نہ دینے والے خاندان کو بھی پیش آسکتی ہیں۔ اسی کو کسی ان دیکھے دشمن کی طرف سے جادو کرنا کہتے ہیں۔ جو نیک انسانوں کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگ انسان کے روپ میں شیطان ہیں جو کسی کو تکلیف پہنچا کر اپنی زندگی داؤ پر لگاتے ہیں۔ کیونکہ بالآخر اس کا انجام تو برا ہی ہوتا ہے۔ ایسی تکالیف سے بچنے کے لیے یہی گزارش ہے کہ قرآن و سنت پر عمل کریں اور عملی طور پر مسلمان بنیں۔ اولاد کی تربیت صحیح اسلامی طور پر کریں۔ اپنے اندر مثبت سوچیں پیدا کریں، منفی سوچوں کو قریب نہ پھٹکنے دیں۔

قریبی رشتے داروں، غریبوں اور ملازمین کو ان کا حق ضرور ادا کریں۔ ملک کے وفادار اور خیر خواہ رہیں۔ اس کی بہتری کے لیے جتنا کچھ کر سکتے ہوں، ضرور کریں۔ ہر حال میں خوش رہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہیں۔ ان شاء اللہ کوئی پریشانی اور جادو آپ پر غالب نہیں آئے گا اور آپ خوش و خرم رہیں گے۔

www.paksociety.com

خوبصورتی سے لکھی گئی تحریریں جنہیں
مشاہدے کی گہرائی نے
اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے

"کوزے کو دریا بند کرنا" سنا بھی ہے،
دیکھا کسی کسی نے ہے۔ حسن اتفاق دیکھیے
کہ اب آپ بھی گواہوں میں شامل ہو رہے ہیں

اردو ڈائجسٹ کا ایک مقبول سلسلہ
سات رنگ ۔۔۔ سات تحریریں

گوشۂ ست رنگ

ثویبہ اسلام صدیقی

www.Paksociety.com

نجران (اصحاب الاخدود کا دیس)

نجران سعودی عرب کے جنوب میں یمن کی سرحد پہ واقع ہے۔ سعودی عرب کے جنوبی منطقہ کا صدر مقام ہے۔ ریاض سے اس کا فاصلہ کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر ہے۔ میرے لیے اس شہر میں باعثِ کشش دو چیزیں تھیں، ایک اصحاب الاخدود کا مقام اور دوسرے یہ کہ یہاں سے ۸ہجری میں عیسائیوں کا وفد مدینہ منورہ آیا تھا۔ اسی وفد کے بارے میں قرآن کریم میں آیات مباہلہ نازل ہوئیں جس سے عیسائی بھاگ گئے اور جزیہ دینا قبول کر لیا تھا۔ میری خواہش تھی اس شہر کو دیکھا جائے جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ میں نے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ شہر نجران کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔

۲۲ستمبر ۲۰۱۱ء کو علی الصباح ہم ابہا ہوائی اڈے پہ اترے تو وہاں کا موسم نہایت سہانا تھا۔ آسمان پہ ہلکے ہلکے بادل اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ دن بڑا یادگار رہا کیونکہ ہم لوگوں نے سارا دن سودا اور جبل اخضر کی دلفریب وادیوں میں گزارا۔ سودا نامی پہاڑ ابہا کا سب سے خوب صورت مقام ہے۔ وہاں سوئٹزرلینڈ کا منظر یاد آجاتا ہے۔ پہاڑوں پہ ہرے بھرے درخت ہیں جو پاکستان جیسے تو نہیں لیکن ہر طرف ہریالی کی وجہ سے خوب صورتی کا سماں ہے۔

۲۳ستمبر کو ہم گیارہ بجے نجران کے لیے نکلے۔ ابہا سے نجران کم و بیش ۲۵۰کلومیٹر دور ہے۔ ہر چند کے دو رویہ سڑک ہے مگر جگہ جگہ مرمت ہو رہی تھی۔ چنانچہ تین ساڑھے تین گھنٹوں میں نجران پہنچے۔ نجران میں ہمارے دوست ذبیح اللہ سڑک پہ ہی ہم لوگوں کے منتظر تھے۔ انھوں نے ہمارے قیام اور کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانا تناول کر کے اصحاب الاخدود کے علاقے کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ نجران بڑا شہر نہیں مگر صفائی ستھرائی

www.paksociety.com

کے اعتبار سے بڑا خوب صورت اور امیر ہے۔

اصحاب الاخدود کا علاقہ نجران سے کوئی آٹھ دس کلومیٹر دور ہوگا۔ اسے چار دیواری کے ساتھ بند کر دیا گیا ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے شام ۳ سے ۶ بجے کا وقت مقرر تھا۔ سورۃ البروج میں اصحاب الاخدود کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے۔ اس علاقے پر بنی حمیر نے صدیوں تک حکومت کی۔ حضرت موسیٰ کے بعد یمن کے علاقے میں یہودیوں کی حکومت رہی۔ حضرت عیسیٰ کے چھ سو سال بعد اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ یہاں کا حاکم ایک جادوگر کا خاص مرید تھا۔ وہ جادوگر کی ہر بات مانتا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ بادشاہ عقیدے کے اعتبار سے یہودی مگر دین سے اتنا دور تھا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کھو بیٹھا اور اپنی پوجا شروع کروا دی۔ اللہ رب العزت ہر دور میں اپنے بندوں کی آزمائش کرتا رہا ہے اور ہر دور میں دین کی تجدید ہوتی رہی ہے۔ ایک دن جادوگر بادشاہ کے پاس گیا اور کہنے لگا، میں اب بوڑھا ہو چکا اور کسی وقت بھی موت آ سکتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ مجھے کوئی ذہین و فطین بچہ مل جائے جسے میں اپنا کالا علم منتقل کر سکوں تاکہ میرے مرنے کے بعد وہ میرا جانشین بن سکے۔

ایک نہایت ذہین لڑکا جادوگر کے حوالے کر دیا گیا۔ لڑکا صبح سویرے جادوگر کے پاس جاتا اور کالا علم سیکھتا۔ راستے میں ایک راہب کا ٹھکانہ تھا۔ ایک دن وہ راہب سے ملا تو اسے اس کی باتیں بڑی اچھی لگیں۔ وہ راہب موحد اور حضرت عیسیٰ کا پیروکار تھا۔ لڑکا کچھ وقت راہب کے پاس گزارنے لگا۔ وہ لڑکے کو عقیدہ توحید کی تعلیم دیتا۔ اس طرح وہ کالا علم سیکھتا رہا اور راہب سے علم ربانی بھی حاصل کرتا رہا۔ کچھ عرصے بعد اسے یقین ہو گیا کہ جادوگر کا علم شیطان کا جبکہ راہب کا راستہ رحمٰن کا راستہ اور یقیناً یہی صراط مستقیم ہے۔ وہ ایک رب کی پرستش کرنے لگا۔

وقت گزرنے کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی عنایات سے لڑکے کی کرامات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے پاس اندھے اور کوڑھی کے مریض آتے، وہ ان کا علاج کرتا اور وہ اللہ کے حکم سے صحت یاب ہو جاتے۔ یوں اس کی شہرت بڑھتی چلی گئی۔ بادشاہ کا ایک خاص درباری آنکھوں کی بیماری میں مبتلا ہو کر اندھا ہو گیا۔ کسی نے اسے لڑکے کے بارے میں بتایا۔ وہ لڑکے کے پاس گیا اور کہا کہ تو میرا اندھا پن دور کر دے تو میں تجھ کو بہت سے تحائف اور سامان دوں گا۔ لڑکے نے کہا کہ شفا میں نے نہیں، اللہ نے دینی ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لے آؤ تو میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں بینائی عطا کر دے۔ بادشاہ کا خاص درباری اللہ پر ایمان لے آیا۔ اللہ نے اسے شفا دی۔ وہ بادشاہ کے پاس گیا تو اس نے پوچھا کہ تیری بینائی کون واپس لایا؟ کہنے لگا "میرا رب۔"

بادشاہ نے کہا "رب تو میں ہوں، میں نے کب تمہاری بینائی درست کی؟"

درباری نے جواب دیا "بادشاہ سلامت آپ نہیں رب العالمین نے درست کی ہے۔" بادشاہ کو شدید غصہ آیا۔ اسے سخت سزا دی، تشدد کیا تاکہ توحید سے انکار کر دے مگر وہ نہ مانا۔ بادشاہ کہتا تھا کہ بتا تُو نے توحید کی یہ بات کہاں سے سیکھی؟ تشدد جب ناقابلِ برداشت ہو گیا تو اس نے لڑکے کے بارے میں بتا دیا۔

بادشاہ نے لڑکے کو دربار میں بلایا اور کہا "اب تمہارا جادو اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ تم نے اندھوں کا علاج کر کے ان کو شفا دینی شروع کر دی۔"

لڑکے نے جواب دیا "میں کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا دینا صرف اللہ کا کام ہے۔"

بادشاہ جواب سن کر آپے سے باہر ہو گیا اور اسے قید کر لیا۔ نہایت ظالمانہ تفتیش کے نتیجے میں توحید کا درس دینے والے راہب کا نام سامنے آ گیا۔ راہب کو بادشاہ نے گرفتار کروایا اور کہا کہ مجھے رب مانو۔ راہب نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اسے آرے کے ساتھ چِروا دیا۔ جس کی آنکھوں میں دوبارہ نورِ خداوندی آ گیا تھا، اس نے بھی اسے رب ماننے سے انکار کر دیا۔ اسے بھی آرے کے ساتھ چِروا دیا۔

بادشاہ نے لڑکے سے کہا کہ تو مجھ کو رب مان لے، اس نے انکار کر دیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے پہاڑ پر لے جاؤ اور آخری مرتبہ پوچھ لو کہ مجھے رب مانتا ہے یا نہیں؟ نہ مانے تو نیچے پھینک دو۔ لڑکے نے دعا کی، پہاڑ لرزنے لگا اور لڑکے کے علاوہ سب نیچے گر کر ہلاک ہو گئے۔ لڑکا صحیح سلامت واپس بادشاہ کے دربار پہنچ گیا۔

میں اس میدان میں کھڑا سامنے ان پہاڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس واقعے سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہوں گے۔ میں چشمِ تصور سے دیکھ رہا تھا کہ بادشاہ کے سپاہی لڑکے کو پہاڑوں کے اوپر لے گئے۔

بادشاہ کو جب معلوم ہوا کہ لڑکا بچ گیا ہے تو اس نے حکم دیا، اسے اب گہرے سمندر میں پھینک آؤ۔ پھینکنے والے سب غرق ہو گئے اور لڑکا پھر بادشاہ کے سامنے آ کھڑا تھا۔ لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ تو اگر مجھے قتل کروانا چاہتا ہے تو سب لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کر، پھر مجھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ لٹکا، میرے ہی ترکش سے ایک تیر نکال اور پھر یہ پڑھ "لڑکے کے رب، اللہ کے نام سے۔" بادشاہ نے ہزاروں کے مجمعے کے سامنے اسی طرح کیا اور تیر چلا دیا۔ لڑکا شہید ہو گیا۔ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو بے ساختہ کہہ اٹھے "ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔"

بادشاہ نے بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر ان میں آگ جلا دی۔ لوگ خود آگ میں کود گئے لیکن کفر کرنے سے انکار کر دیا۔ باقی زندہ بچ جانے والے بھی لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ نے راہِ حق اختیار کرنے والے افراد کو قتل کروا دیا۔ تقریباً ۲۰ ہزار کے قریب انسان اس ظالم کے ہاتھوں مارے گئے۔

بلاشبہ جس علاقے اور جگہ میں یہ واقعہ پیش آیا وہ تاریخی ہے۔ سڑک کنارے ہی نجران کا عجائب گھر تھا۔ اس سے متصل اصحاب الاخدود کے علاقے میں جانے کا دروازہ تھا۔ دروازے پر مختصر اندراج کے بعد ہمیں اندر جانے کا اشارہ ملا۔ سامنے مٹیالے رنگ کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اصحاب الاخدود کا علاقہ ۱۰ مربع کلومیٹر ضرور ہو گا۔ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر میں نے اندازہ لگایا، خندقیں کم از کم ایک کلومیٹر لمبی اور ۳۰۰ میٹر چوڑی ہوں گی۔

میں کھڑا سامنے اس پہاڑ کو دیکھ رہا تھا جو سعودی عرب اور یمن کے درمیان سرحد کا کام کرتا ہے۔ غالباً یہی وہ پہاڑ ہے جس کے اوپر لڑکے کو دھکا دیا گیا۔ ایک بڑا سا دائرہ نما گڑھا نظر آیا جس میں ۱۰۰ افراد بیٹھ کر تماشا دیکھ سکتے تھے۔ غالباً اسی جگہ اعیانِ مملکت اور بادشاہ ان مظلوموں کو شہید ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ تک علاقہ اصحاب الاخدود کو دیکھتے شہدا کو خراجِ تحسین پیش کرتے رہے۔

[illegible]

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.Paksociety.com

کچی مٹی کی سب سے بڑی مسجد

"جینے" افریقی ملک مالی کا ایک چھوٹا مگر تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ اس شہر نے زمانے کے سرد و گرم دیکھے اور متعدد تاریخی واقعات کا گواہ بھی ہے۔ اس شہر کی خاص بات یہاں کی جامع مسجد ہے۔ یہ مٹی کی کچی اینٹوں سے تیار کردہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ قدیم دور میں مٹی کی کچی اینٹیں تیار کرکے انہیں دھوپ میں سکھایا جاتا تھا۔ یہ مسجد انہی اینٹوں سے تیار کی گئی۔ لیپ بھی کچی مٹی کا کیا گیا جس کی وجہ سے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

پرشکوہ مسجد سوڈانی ساحلی (Sudano-sahlian) طرز تعمیر کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس مقام پر پہلی مسجد تیرھویں صدی کے لگ بھگ تعمیر کی گئی لیکن موجودہ تعمیر ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔ ایک جانب تو یہ مسجد جینے میں آباد مختلف قوموں اور برادریوں کا تہذیبی اور ثقافتی مرکز، دوسری طرف یہ براعظم افریقہ کا مشہور ارضی نشان (لینڈ مارک) ہے۔

یونیسکو نے ۱۹۸۸ء میں جینے کو قدیم شہروں کے زمرے میں شامل کرلیا تھا، اسی وقت مسجد کو بھی عالمی ورثے میں جگہ ملی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب اس افریقی ملک کا سلطان، کونبورو (KUNBURU) مسلمان ہوا تو اس نے اپنا محل مسمار کرکے اس کی جگہ یہ مسجد تعمیر کرائی۔

اپریل ۱۸۹۳ء میں فرانسیسی افواج نے جینے پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ مسجد کی خستہ حالت دیکھ کر ۱۹۰۶ء میں فرانسیسی انتظامیہ نے شہر میں مسجد کی تعمیر نو کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ کام ۱۹۰۷ء میں مکمل کرلیا گیا۔

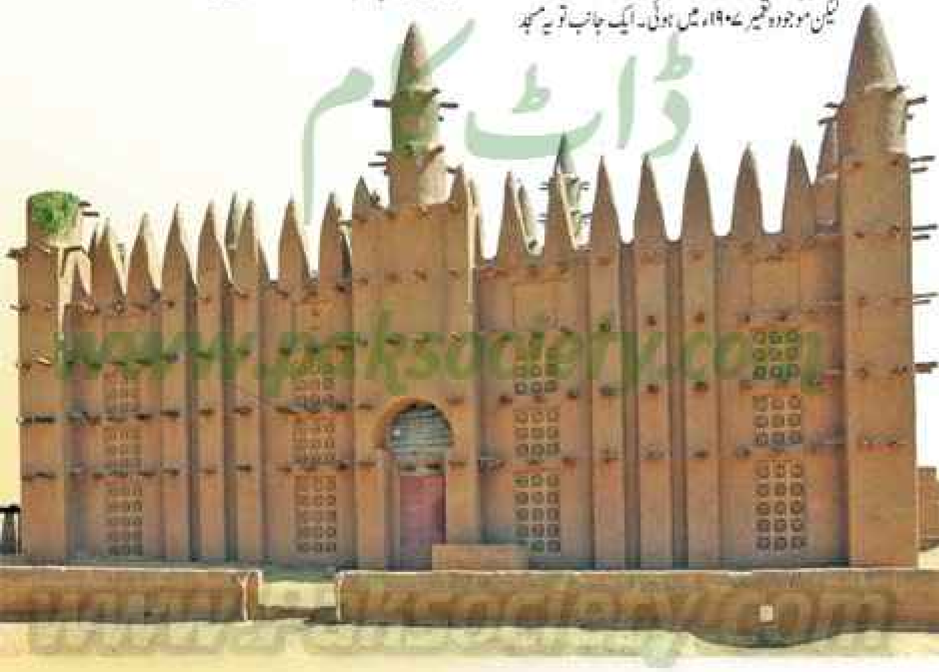

مسجد کی تعمیر اور اینٹیں

مسجد کی دیواروں اور چھتوں میں تاڑ کے درخت کی موٹی اور مضبوط لکڑیاں اور شہتیر لگے۔ ان شہتیروں یا ستونوں کو اس طرح لگایا گیا کہ یہ دیواروں سے باہر کی طرف نکلے ہوئے ہیں۔ یہ شہتیر مسجد کی سالانہ مرمت کے موقع پر چبوترے کا کام بھی کرتے۔ چھت پر مٹی اور چینی کے پائپ بھی نصب ہیں۔ ان کے ذریعے بارش کا پانی باہر نکل جاتا ہے ورنہ یہی پانی مسجد کی دیواروں اور اس کے لیپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جینے کی جامع مسجد چبوترے پر تعمیر کی گئی ہے جو ۷۵×۷۵ میٹر رقبہ رکھتا ہے۔ یہ زمین کی سطح سے ۳ میٹر بلند ہے۔ اس چبوترے تک جانے کے لیے سیڑھیوں کے چھ درجے ہیں، جن کو دل فریب کنگوروں سے سجایا گیا ہے۔ مسجد میں داخل ہونے والا داخلی دروازہ عمارت کی شمالی سمت میں واقع ہے۔ مسجد کی بیرونی دیواریں ایک دوسرے کے متوازی نہیں۔

مسجد کا قبلہ

جینے کی جامع مسجد کا قبلہ مشرق کی طرف واقع ہے۔ اسی سمت خانہ کعبہ واقع ہے۔ قبلے والی دیوار بہت خوبصورت ہے اور اتنی بلند کہ اسے شہر کے کسی بھی حصے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ قبلے والے مقام پر صندوق نما تین بڑے منار ہیں جو اصل دیوار میں ابھرے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر منار کے اوپر کلس بنائے گئے ہیں جن کی نوکوں پر شتر مرغ کے انڈے لگے ہیں۔ مشرقی دیوار تین فٹ موٹی ہے۔ اس کی بیرونی جانب ۱۸ پشتے بنا کر دیواروں کو مضبوطی عطا کی گئی ہے۔ ہر پشتے کے اوپر کنگورے بنائے گئے ہیں جنھیں کنگوروں، کلس اور مخصوص لکڑی کے نقش و نگار سے سجایا گیا ہے۔

نماز کے لیے مخصوص بڑے کمرے کی پیمائش لگ بھگ ۲۶×۵۰ میٹر (۸۵×۱۶۵ فٹ) ہے۔ یہ قبلے کی دیوار کے پیچھے مسجد کے مشرقی نصف پر مشتمل ہے۔ درختوں کے تنوں سے بنائی گئی چھت پر مٹی کا لیپ کیا گیا ہے۔ مسجد کا فرش ریتیلی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ قبلے کی دیوار میں بنائے گئے تینوں مناروں میں محرابیں بھی موجود ہیں۔ امام صاحب سب سے بڑے اور مرکزی منار کی محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں۔

مسجد کی ثقافتی اہمیت

جینے کے لوگ اپنی اس مسجد سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ اس پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تیز اور موسلادھار بارش کا زمانہ آئے تو جینے کے لوگ اس کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ پوری آبادی اپنی جامع مسجد کی سالانہ مرمت کے موقع پر بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ہر سال ایک منفرد اور بے مثال مذہبی تقریب منعقد کی جاتی ہے۔ کھانے پینے کا اہتمام ہوتا ہے اور گانے بجانے کا بھی لیکن اس کا بنیادی مقصد مسجد کو طوفانی بارش اور سیلاب کے باعث پہنچنے والے نقصان کی مرمت کرنا ہے۔ نیز جب خطے میں حبس اور گرمی کی شدید کیفیت پیدا ہو تو دیواروں پر لیپی مٹی بھی چٹختی ہے۔

سالانہ مرمت کی تقریب کا وقت آنے سے پہلے ہی لوگ اس کی تیاری کرتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں زمین میں بڑے بڑے گڑھے بنا کر ان میں مٹی اور گارا جمع کیا جاتا ہے، پھر اس میں پانی ڈال کر مسالہ تیار کرتے ہیں۔ یہ لڑکے مذکورہ مسالے میں کھیلتے ہیں، جس سے گارا اچھی طرح یکجان ہو جاتا ہے۔ پھر علاقے کے مرد مسجد کے بیرونی حصے پر تیار مسالے کی لپائی کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ جینے کی اصل جامع مسجد ماضی میں پورے افریقہ میں اسلامی تعلیمات کا ایک اہم مرکز تھی۔ اس زمانے میں قرآنی تعلیم حاصل کرنے ہزاروں طلبہ جینے کے مدرسوں میں آیا کرتے تھے۔ جینے میں متعدد ایسی تاریخی مساجد موجود ہیں جو جامع مسجد سے زیادہ قدیم ہیں تاہم وہی شہر کی سب سے اہم اور نمایاں علامت ہے اور مالی قوم کی بھی۔

(مرزا ظفر بیگ، روزنامہ ایکسپریس)

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

جگنوؤں اور تتلیوں کا شہر

اوسلو، سمندر کے کنارے آباد قدیم شہر ہے۔ یہ ناروے کا دارالحکومت ہے۔ موسم گرما میں یہاں مقامی خواتین اور لڑکیاں دلکش رنگوں کے فراک اور لانگ اسکرٹس پہنتی ہیں۔ بازار سردیوں میں شام ۶ بجے اور گرمیوں میں ۸ بجے بند ہو جاتے ہیں۔ ریستوران البتہ رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی راتیں بہت ہی طویل ہوتی ہیں۔ اوسلو کا ساحلی شہر کہر اور دھند میں لپٹا طویل راتوں میں جگمگاتا رہتا ہے۔ سمندر میں شاموں کا نظارہ کرتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ایک دن تو ایسا آتا ہے کہ جب سورج ڈوبنا ہی بھول جاتا ہے یا پھر تھکن اتارنے کے لیے ناروے کے ساحل پر ٹھہرتا ہے۔ جی ہاں، ہر سال ایک دن کے لیے سورج ناروچ کے مقام پر ٹھہرا رہتا ہے۔ تب اس کا بڑا سا آتشیں گولا سمندر کے کنارے لگا سال بھر کی تھکن اتارنے کے لیے ستاتا ہے۔ پھر وہیں سے ابھر کر طلوع ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے کہ سورج، مغرب

ڈوبی روشنیاں دھند کی وجہ سے جگنو بن کر چمکتی ہیں۔ یہاں گرمیوں کی شامیں بہت طویل ہوتی ہیں۔ سورج دیر تک آسمان کے کنارے ٹھہرا رہتا ہے۔ اس وقت اکثر ریستورانوں کے باہر مرد وزن کرسیاں بچھا کر طویل میں ڈوب کر وہیں سے نکل آتا ہے۔ یہ ۲۲ جون کا طویل دن ہوتا ہے، جب ناروے میں سورج غروب نہیں ہوتا اور لوگ ناروچ جا کر اس کے ساتھ پکنک مناتے ہیں۔

موسم سرما میں ناروے کی شمالی پہاڑیوں پر رنگ برنگی

روشنیاں آسمان سے منعکس ہو کر بہت خوب صورت نظارہ پیش کرتی ہیں۔ گرمیوں کے دن اتنے طویل ہوتے ہیں کہ رات سکڑ کر دو گھنٹے کی رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی سارا دن سورج چمکتا ہے۔ لوگ خوشی کے باعث چھوٹے بڑے ساحلوں پر قلانچیں بھرتے نظر آتے ہیں۔ کچھ لوگ تو دھوپ سینکتے ہوئے گندمی ہونے کی کوشش میں اپنی کھال تک ''روسٹ'' کر لیتے ہیں۔ ہر معاشرے کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ یہاں کے لوگ دیگر برفانی علاقوں کے لوگوں کی طرح سرخ و سفید اور اونچے لمبے ہیں۔ آنکھوں میں سمندر کی نیلاہٹ اور سبز رنگت ہے، جبکہ بالوں کا رنگ گندمی، سفید اور اخروٹی ہوتا ہے۔ خدا نے انھیں حسن کے ساتھ ساتھ ذہانت سے بھی مالا مال کیا ہے۔ دیگر یورپی اقوام کی نسبت بہت ہمدرد اور امن پسند بھی ہیں۔ نہ تو ہمسایہ ملک جرمنی کی طرح مغرور قوم ہے اور نہ برطانیہ، امریکہ کی طرح دنیا کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔

ملک کا آدھا رقبہ جنگلات اور باغات پر مشتمل ہے۔ اوسلو میں سمندر کی کل شاخوں کی تعداد ۳۴۳ ہے جو دریا اور نہروں کی صورت نظر آتی ہیں۔ جبکہ کل جزائر چالیس ہیں۔ گرمیوں کا درجہ حرارت مثبت ۳۰ درجے سینٹی گریڈ تک جب کہ موسم سرما میں منفی ۲۵ تک چلا جاتا ہے۔

ناروے ایک جمہوری ملک ہے۔ بادشاہ کو قانون بدلنے کا حق ہے لیکن وہ اسے کبھی استعمال نہیں کرتا۔ شاہی محل اوسلو کے مرکز، کارل یوہانسن کے آخری سرے پر واقع ہے۔ ناروے کے اہم تعلیمی، تحقیقی اور صنعتی مراکز جیسے نیشنل میوزیم، نارویجین اوپرا تھیٹر اور نیشنل تھیٹر بھی اوسلو ہی میں ہیں۔ راڈیسن ہوٹل اوسلو کی بلند ترین عمارت ہے۔ یہ شہر کے وسط میں واقع ہے۔

شہر میں نظام آمد و رفت بہت مربوط اور تیز رفتار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ کام پر جانے کے لیے تیز رفتار ذرائع آمد و رفت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ویسے بھی یہاں قوانین آمد و رفت بہت سخت ہیں اور کاریں کھڑی کرنے کا مسئلہ الگ ہے۔ ذرا سی غلطی پر بھاری جرمانے ہوتے ہیں۔ اول تو گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ نصیبوں سے ملتی ہے۔ جو مل جائے تو بھیڑ سے الگ۔ شہر میں جا بجا پھیلی عمارات کی روشنیاں انوکھا منظر پیش کرتی ہیں۔ اسی لیے یہ شہر جگنوؤں اور تتلیوں کا شہر دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہاں زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ کسی کی نگاہ دوسرے پر پڑ جائے تو کوئی شناسائی بھی ظاہر نہیں کرتا۔ چھوٹے شہروں میں ایسی بے رخی نہیں ملتی۔

اوسلو میں پاکستانیوں کی کثیر تعداد رہائش پذیر ہے۔ گرن لان میں پاکستانیوں کی کپڑے اور اشیائے خورونوش کی دکانیں اور ریستوران ہیں۔ کئی پاکستانی بہت کامیاب کاروباری ہیں۔ بعض کا شمار اوسلو کے متمول شہریوں میں ہوتا ہے۔ پاکستانی ریستورانوں میں نارویجین بھی شوق

سے کھاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پاکستانی کھانے نارویجین قوم میں بہت مقبول ہیں، خصوصاً سموسے اور پکوڑے۔ آپ گرن لان چلے جائیں تو پاکستان کی آدھی اداسی تو ختم ہو جاتی ہے۔ ہر جانب پاکستانی لوگ، پاکستانی

لباس اور دکانیں۔ اسی لیے اسے "چھوٹا پاکستان" بھی کہا جاتا ہے۔ اکثر نارویجین بھی پاکستانی اشیائے خورونوش کی دکانوں پر خریداری کرتے نظر آتے ہیں۔

ناروے میں پاکستانیوں کی آمد ستر کی دہائی میں ہوئی تھی۔ اس وقت بیشتر کا تعلق دیہی علاقوں سے تھا۔ ان کے پاس زیادہ تعلیم بھی نہیں تھی۔ اسی لیے یہ لوگ معمولی کام کرتے نظر آتے تھے۔ اب پاکستانیوں کی کافی تعداد پڑھ لکھ گئی ہے۔ اب تو پارلیمنٹ اور سیاست میں بھی کئی پاکستانی مردوخواتین کام کر رہے ہیں۔ ایک پاکستانی خاتون، روبینہ رانا کو تو ناروے کی تاریخی خاتون بھی قرار دیا گیا۔ انہی کے شاعر شوہر جمشید سرور کو نارویجین ادب کا انعام بھی ملا۔

ناروے انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا کی طرح مشہور ملک نہیں، لیکن اس کا شمار یورپ کی متمول، خوب صورت اور پُرامن مملکتوں میں ہوتا ہے۔ اوسلو ہوٹلوں، مراکزِ خریداری، بلند عمارتوں اور تعلیمی اداروں سے جگمگاتا شہر ہے۔ شہر میں کئی تقریبات منعقد ہوتی ہیں جن میں پاکستانیوں کا میلہ اہم ہے۔ نارویجن لوگوں کے علاوہ غیر ملکی بھی اپنی تقریبات کا انعقاد کرتے ہیں۔

ناروے مہنگا ملک ہے۔ یہاں اشیائے خورونوش بہت مہنگی ہیں۔ اس لیے کئی غیرملکی پڑوسی سویڈن سے خریداری کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ خوش حال ملک ہے۔ اس کی وجہ سمندر کی تہ سے برآمد ہونے والا تیل ہے۔ گویا ناروے کی لاٹری نکل آئی۔ ناروے تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی دل کھول کر ملکی ترقی اور عوامی بہبود وخوش حالی پر خرچ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اوسط آمدنی کینیڈا سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں بچوں کی پیدائش پر ماں کو بڑی رقم ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غیرملکی اور خصوصاً پاکستانی صرف یہی کام کرتے اور گھر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ملک میں وظیفہ بیروزگاری بھی دوسرے ممالک کی نسبت زیادہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ناروے جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اوسلو کے شہری گھروں میں ایسے رہتے ہیں جیسے مسافر ہوٹلوں میں۔ شہر کے وسط میں کئی منزلہ عمارتیں ہیں جن میں رہائشی گھر ہیں۔ گھر جدید ترین سہولتوں سے مزین ہیں۔ مکان لکڑی کے بنے ہوتے ہیں۔ انھیں سردیوں میں گرم رکھنا آسان ہے۔ گھروں کی تعمیر میں لکڑی کے علاوہ شیشہ زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

گھر تو سادہ بنائے جاتے ہیں لیکن ان کے اندر باورچی خانہ اور غسل خانہ بے حد دلکش اور جدید ہوتے ہیں۔ گھر کی آرائش میں پھول بہت استعمال ہوتے ہیں اور پردے بھی۔ گھروں کی کھڑکیوں پہ سجاوٹی پردوں کی جھالر اور پھول دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

ناروے میں فلاحی، سماجی اور تفریحی مقاصد کے لیے مختلف تنظیمیں کام کرتی ہیں۔ انھیں حکومت ہر طرح کی مالی اور سماجی معاونت فراہم کرتی ہے۔ یہاں کئی لوگ اپنے مذہب اور تہذیب وثقافت کو اپناتے ہوئے اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ غرض یہ ایسا ملک ہے جہاں ذرائع آمدنی کی فراوانی ہے اور امن وسکون بھی۔

(اوسلو، جگنوؤں اور تتلیوں کا شہر۔ شازیہ عندلیب)

چوتھا رنگ

سری لنکا میں چند دن

میرے سامنے لامحدود وسعتوں والا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ سانپ کی طرح بل کھا کھا کر چلنے والی ہواؤں میں خنکی اور مستی تھی۔ شوریدہ سر لہروں کا زور عروج پر تھا۔ میں سوچنے لگی کہ اگر یہ لہریں کہیں غضب میں آجائیں تو چٹائیوں، بانس، ناریل کے گھاس پھوس اور مٹی گارے سے بننے والی یہ جھونپڑیاں اور ان کے مکین کتنی دیر مزاحمت کریں گے؟

"دھمیلی پییں گی؟" ریستوراں کے سولہ سترہ سالہ لڑکے نے پاس آکر پوچھا۔

"دھمیلی؟" میں نے اسے استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

www.paksociety.com

www.paksociety.com

اس نے آنکھوں اور ہاتھوں سے اشارے سے میری
پشت پر ناریل کے قد آور درختوں سے جھکتے پھل کی طرف
اشارہ کیا۔

"اچھا تو یہاں سری لنکا میں یہ تمبیلی اور بنگلہ دیش
میں ڈاب ہے۔" ہم سے تھوڑے فاصلے پر ایک جرمن
خاندان کی عورت اور لڑکیاں سمندر میں غوطے مارنے،
ریت پر سستانے اور تمبیلی پینے میں جتی ہوئی تھیں۔

پرہ دوتنا روڈ پر ہم زیورات کی ایک دکان میں داخل
ہوئے۔ یہ پانچ مرلے کا گھر تھا جس میں رہائش اور
کاروبار، دونوں جاری تھے۔ برآمدے میں دبلی پتلی عورت
اوبے کے چبوترے پر شطرنج کی گوٹوں جیسی چیزوں اور
پنوں کے ساتھ پون انچ چوڑی لیس بنانے میں مصروف
تھی۔ لیس کا ڈیزائن اور نفاست دونوں دل لبھانے
والے تھے۔ بھاؤ تاؤ کے بعد خرید لیا۔

جب اس عورت نے ملحقہ چھوٹے کمرے میں سری
لنکن کانوں سے نکلنے والے قیمتی پتھروں میں سونے اور
تانبے جیسی دھاتوں کی آمیزش سے ملا کر بنائے گئے
زیورات کے چند نمونے دکھائے تو آنکھیں تو گویا پھٹنے
والی ہوگئیں۔ ایسے سبک اور منفرد کہ جو ہاتھ میں پکڑو، اسی
پر دل مچل جائے۔ اسی ہزار روپے کا سن کر جس نے
دھیرے سے اپنے ہاتھ میں پکڑا فن کا شاہکار دست بند
ڈبے میں رکھ دیا۔ میرے سوال پر خاتون نے بتایا تھا کہ
اس کا شوہر بناتا ہے۔ اللہ ایسے ہنرمند کاریگر کے تو ہاتھ
چومنے چاہئیں۔ عورت میری بات سن کر کھل کھلا کر ہنس
پڑی۔

اب ظہر کی نماز پڑھنی تھی۔ مسجد کے بارے میں
جانکاری ہو چکی تھی کہ کہاں ہے؟ دھوپ کے جوبن کا یہ
عالم تھا کہ اگر پل بھر کے لیے ہوا رکتی تو یوں لگتا جیسے کسی
تنور میں گرے پڑے ہیں۔ چلتے چلتے ہانپنے لگے جب
کہیں مسجد کی صورت نظر آئی۔ اجنبی جگہوں پر سجدوں کے
لیے میں ہمیشہ مری جاتی ہوں۔

بلال کے چمکتے نشان، مینار اور پرشکوہ سفید عمارت
دیکھتے ہی اندر سے اپنائیت کے سوتے ابل پڑے۔ صحن
سے برآمدے میں آئے جس کے ایک طرف پانی سے
لبالب بھرا تالاب تھا۔ یہی وضو کے
لیے جگہ تھی۔ مسجد کے برآمدے
میں نماز پڑھی۔ برآمدے کی بیرونی
دیوار کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں
سے سمندر سے تیر کر آتی ہواؤں نے
لطف دیا اور سر جھکانے کا مزہ آیا۔

اب بھوکے پیٹ کو بھرائی کی ضرورت
تھی۔ رکشے میں بیٹھے۔ کیا مزے کا
رکشا تھا۔ ڈیزائن تو قدرے ہمارے
ہاں جیسا ہی تھا لیکن نشستیں کشادہ اور
آرام دہ۔ چاہے ٹانگیں پسارو چاہے
سمیٹو۔ چھت بھی مضبوط کینوس کی
تھی۔ چینی طرز کے ریستوران میں بیٹھ کر چینی مرغ
چاول اڑائے۔ گوشت تو کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ ذائقہ
ٹھیک ہی تھا۔

اس کے بعد سہ پہر اور شام پرتگیزوں کی یادگاروں
کے ایک پرانے کھنڈر بنے قلعے اور نہایت خوبصورت
شاندار رومن کیتھولک چرچوں کو دیکھنے اور ان میں عبادت

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کرتے لوگوں کو بیٹھے ہیں گزری۔ کہیں رات ڈھلے واپسی ہوئی۔ دامن دل کو کھینچتی ان کرجا گھروں کی رعنائیاں اور زیبائیاں بتاتی تھیں کہ مغربی اقوام کی چوراچکی، ولندیزی، پرتگیزی اور برطانوی قوموں نے ایشیا کے ملکوں کو اگر لوٹا ہے تو کچھ دیا بھی ہے۔

سری لنکا میں چند روزہ قیام سے ہماری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ مذہبی لحاظ سے یہ چار خانوں میں بٹا ہوا ہے: بدھ، ہندو، عیسائی اور مسلمان۔ سرکاری مذہب بدھ مت ہے۔ تامل اور سنہالی اہم زبانیں ہیں تاہم انگریزی ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مسلمان آبادی کا تقریباً بارہ فی صد اور خاصے بااثر ہیں۔ مقامی لوگوں کے لباس بھی مذہبی عقائد کے مطابق ہیں۔ عورتیں عام طور پر اپنی قومی فضائی ادارے کی میزبانوں جیسا ٹخنوں کو چھوتا تنگ سا کسی قدر ساڑھی نما پہناوا پہنتی ہیں۔ عیسائی عورتیں بلاؤز اور سکرٹ۔ ہندو عورتیں ساڑھی اور مسلمان عورتیں شلوار قمیص اور حجاب۔ ہندو عورتوں کی ایک واضح نشانی ان کی بندیا بھی ہے جو بدھ عورت نہیں لگاتی۔

(لنکا میں جو میں نے دیکھا۔ سلمیٰ اعوان)

پانچواں رنگ

افغانستان

دیومالائی سرزمین

ہندوکش کی بلندی سے آمو دریا کی پستی تک اور ہری رود کے کناروں سے پامیر کی چوٹیوں تک پھیلا ہوا ملک افغانستان اپنے طبعی حالات، جغرافیائی خدوخال، موسمی تنوع اور باشندوں کی عادات و اطوار کے باعث دیومالائی حیثیت رکھتا ہے۔

افغانستان نے موجودہ سیاسی وحدت کی شکل ۱۸۳۸ء میں اختیار کی۔ اس سے پہلے وہ دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھا۔ تاہم کابل، قندھار اور ہرات نام کی ولائتیں تاریخ کے مختلف ادوار میں موجود رہی ہیں۔ ان کا رقبہ اور خدوخال حالات و واقعات کے مطابق تبدیل ہوتے رہے۔ انہی ولائتوں میں سے کسی کو افغانستان کا نام بھی دیا گیا۔ تاہم افغانستان کے نام سے باقاعدہ ملک کا قیام ۱۸۳۸ء میں عمل میں آیا۔ لیکن افغانوں کی تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔

افغانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ ساؤل (حضرت طالوت) کی ۳۷ویں پشت سے ایک شخص قیس عبدالرشید نے خالد بن ولید کی دعوت پر مدینہ منورہ میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ قیس عبدالرشید مکہ کی فتح میں حضورؐ کے ہم رکاب رہا۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران اس کی شادی خالد بن ولید کی صاحبزادی سے ہوئی جنھیں ہمراہ لے کر وہ واپس اپنے وطن کوہستان غور چلا آیا جہاں اس نے اپنی زندگی دعوت اسلام کی ترویج و اشاعت میں صرف کی۔ خالد بن ولید کی صاحبزادی سے قیس عبدالرشید کے ۳ بیٹے ہوئے جن کے نام سڑبن، بٹان یا بتنی اور غورغشت رکھے گئے۔ ان تینوں بیٹوں کی نسل افغان یا پٹھان کے نام سے افغانستان اور پاکستان میں موجود ہے۔

افغانوں کی روایات کے مطابق ان کے مورث اعلیٰ کا نام ''عبدالرشید'' خود حضور اکرم ﷺ نے رکھا اور فرمایا تھا کہ ان کی نسل اسلام پر اس قدر مضبوطی سے کاربند ہوگی جس طرح کشتی کا ''بطان'' ہوتا ہے (وہ مضبوط لکڑی

جس سے پختی کا پیدا اختیار کیا جاتا ہے)۔ قیس عبدالرشید اور ان کی اولاد کو بارگاہِ رسالت سے دیا جانے والا یہی نام بعد میں لسانی تغیرات کے باعث پٹھان میں تبدیل ہوگیا۔ لفظ پختون کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ بخت نصر نے جب یروشلم پر قبضہ کرکے اسرائیلی بادشاہت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو بنی اسرائیل کے ۱۲ر قبیلوں کو قیدی بنا کر فارس کی جنوبی سرحد پر کوہستان غور میں جلاوطن کردیا۔ ان قبیلوں میں ایک قبیلہ بنو پخت بھی تھا جس سے تعلق رکھنے والوں کو رفتہ رفتہ پختون کہا جانے لگا۔

اگرچہ تاریخ اسلام، سیرت النبیؐ اور احادیث رسولؐ سے قیس عبدالرشید کے حوالے سے ان روایات کی تصدیق نہیں ہوتی تاہم افغانوں کے ہاں انھیں مسلمات کا درجہ حاصل ہے۔ افغانوں کی جو بھی اصل (Origin) ہو، حقیقت یہ ہے کہ افغان اپنی جرأت، بہادری، آزادروی، راست بازی اور دین اسلام سے سچی اور بے لوث وابستگی کے باعث دنیا کی قوموں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش کے پہاڑی سلسلوں کے درمیان واقع ہے۔ پاکستان کے ساتھ اس کی سرحد کی لمبائی ۲۴۳۰ رکلومیٹر، ایران کے ساتھ ۹۳۶ رکلومیٹر، ترکمانستان، ازبکستان اور تاجکستان کے ساتھ ۱۹۸۰ رکلومیٹر اور عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ صرف ۷۶ رکلومیٹر ہے۔ افغانستان کا دو تہائی رقبہ بلند پہاڑوں پر مشتمل ہے جبکہ شمال اور جنوب مغرب کے میدانوں پر مشتمل علاقے کھیتی باڑی کے قابل ہیں۔ دریائے آمو، دریائے کابل اور دریائے ہلمند کی وادیاں بھی سرسبز و شاداب علاقوں پر مشتمل ہیں۔

پاکستان اور افغانستان سرحد ڈیورنڈ لائن کہلاتی ہے۔ یہ سرحد واخان سے شروع ہوکر ۸۰۰ رمیل تک شمال مغرب کی جانب بڑھتی پھر مغرب کی سمت مڑ جاتی اور مزید ۷۰۰ رمیل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہلمند کی وادی سے ہوتے ہوئے ایرانی سرحد تک جا پہنچتی ہے۔

انتظامی لحاظ سے افغانستان ۳۴ رصوبوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۱۰ر صوبے پاکستان، ۳ر صوبے ایران، ۴ر صوبے ترکمانستان، ۳ر تاجکستان اور ایک صوبہ ازبکستان کی سرحد سے ملحق ہے۔ ایران کی طرف سے شروع کریں تو پاکستان کی سرحد کے ساتھ ملحق صوبے نیمروز، ہلمند، قندھار، زابل، پکتیکا، خوست، جلال آباد، نورستان، کنڑ اور واخان کی پٹی ہیں۔ ایران کے ساتھ نیمروز، فرح اور ہرات کے صوبے ملتے ہیں۔ ترکمانستان کے ساتھ ملنے والے صوبے بادغیس، فاریاب اور جوزجان ہیں۔ مزار شریف ازبکستان کی سرحد پر واقع ہے جبکہ قندوز، تخار اور بدخشاں تاجکستان سے ملحق ہیں۔ ان میں سے ۴ر صوبے مرکزی اہمیت کے حامل ہیں: کابل، قندھار، ہرات اور مزار شریف۔ یہ چاروں صوبے مختلف ممالک کے ناکوں پر واقع ہیں۔ انہیں حاصل کرنے سے کوئی بھی وسیع افغان رقبے پر قابض ہوسکتا ہے۔

کابل ملک کا دارالحکومت ہے جو براستہ جلال آباد، درۂ خیبر پاکستان سے ملا ہوا ہے۔ قندھار افغانستان کا دوسرا اہم تہذیبی، ثقافتی اور تجارتی مرکز ہے جو کابل کو براستہ غزنی کوئٹہ (پاکستان) سے ملانے والی مرکزی شاہراہ پر واقع ہے۔ ہرات ایران کی سرحد پر واقع ہے جہاں سے ایک شاہراہ براستہ مشہد تہران پہنچتی ہے۔ شمالی افغانستان کا اہم ترین شہر مزار شریف ہے۔ ایک کشادہ شاہراہ ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند کو براستہ مزار شریف کابل تک رسائی فراہم کرتی ہے۔ یہ چاروں شہر گولائی میں تعمیر کی گئی سڑک کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

افغان آبادی تقریباً ۲ رکروڑ ۸۵ رلاکھ نفوس پر مشتمل ہے جس میں سے ۹۹ رفیصد مسلمان ہیں۔ نسلی اعتبار سے یہ آبادی ۳ر بڑے نسلی گروہوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ۴۲ رفیصد افغان، ۲۷ رفیصد تاجک، ۹ رفیصد ازبک جبکہ باقی آبادی ہزارہ جات اور دیگر اقوام پر مشتمل ہے۔ افغان زیادہ تر پاکستان سے ملحقہ صوبوں میں تاجک اور ازبک بالترتیب تاجکستان اور ازبکستان سے ملحقہ صوبوں میں آباد ہیں۔ افغانستان کی ۳۵ رفیصد آبادی پشتو بولتی ہے جبکہ ۵۰ رفیصد فارسی/دری زبان بولتے ہیں۔ باقی

www.Paksociety.com

زبانوں کا حصہ تھوڑا تھوڑا ہے۔ اسلام ان مختلف نسلی، لسانی اور علاقائی اکائیوں کے مابین ایک ایسا مضبوط رشتہ اخوت استوار کرتا ہے جس نے انھیں ملت اسلامیہ کا بازوئے شمشیرزن بنا دیا ہے۔

ہر دور میں حملہ آور غاصب قوتوں نے افغانوں کے مابین نسلی و لسانی نفرت کے بیج بو کر ان کا اتحاد پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی تاکہ ان پر فیصلہ کن وار کیا جائے لیکن افغانوں کے ان تمام نسلی گروہوں نے تعصبات کو کبھی اسلامی اور ملی حمیت پر غالب آنے کا موقع نہ دیا۔ انگریزوں نے افغانستان پر تین مرتبہ چڑھائی کی اور اپنی بدنام زمانہ پالیسی "تقسیم کرو اور حکومت کرو" (Divide and Rule) کا بھرپور استعمال کیا لیکن افغان مسلمانوں کے بے مثال اتحاد کے سامنے انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۲۰ ویں صدی کے آخر میں روس نے بھی یہی حربہ اختیار کیا لیکن آخرکار شکست فاش اس کا مقدر بنی۔ اب امریکہ بھی اپنی پیش رو جارح قوتوں کے نقش قدم پر چل کر ازبکوں اور تاجکوں کو افغانوں سے لڑانے اور ملک کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک کر خود اپنی جان چھڑانے کی کوششوں میں مصروف ہے لیکن انجام کار اسے بھی برطانیہ اور روس کی طرح عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑے گا جو اب نوشتہ دیوار ہے۔

(محمد سلیم گردیزی)

آدم خور شیروں کا مسکن

اس میں کوئی شک نہیں کہ سندربن کے جنگلات میں رات گزارنے کے لیے فولاد کا جگر چاہیے۔ جب ہم نے اسے دیکھا تو اس کا جاہ و جلال دیکھ کر آنکھیں خوف اور حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دریائے منگل کے مشرق میں واقع سندربن کا بنگلہ دیشی حصہ اس مغربی علاقے کے مقابلے میں جو ہندوستان میں واقع ہے، زیادہ گنجان، سرسبز اور گھنے جنگلات پر مشتمل ہے۔ اس کے اندر لپسا پانڈی کے قریب مندرات موجود ہیں جن میں شیر ٹیک کا مشہور مندر بھی شامل ہے۔ اس کے مشرقی کنارے پر چاندی پائی نامی گاؤں واقع ہے۔ راقم ایک شام کھلنا سے براہ راست منگلہ پورٹ چاندی پائی گاؤں پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ گاؤں کے چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے بچھائے گئے ہیں تاکہ کوئی شیر گاؤں میں داخل ہو کر حملہ نہ کر دے۔

یہ سندربن کا ابتدائی علاقہ ہے۔ ہم نے وہاں تین دن قیام کیا۔ ایک رات چاندی پائی گاؤں سے ۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک درخت کا انتخاب کر کے مچان تیار کی۔ یہاں شیر کے شکار پر پابندی ہے، تاہم تصویر اتارنے کی اجازت ہے۔ لیکن یہ کام بھی شکار سے کم خطرناک نہیں۔ سندربن میں رات کے وقت شیروں کی آواز بڑے سے بڑے بہادر کو بھی خوف زدہ کر دیتی ہے۔ ہم نے کرائے پر ایک لانچ حاصل کی۔ میرے ساتھ مقامی دوست تھے۔ لیکن رات کی تاریکی میں کوئی مچان پر رکنے کو تیار نہ ہوا۔ سندربن میں آدم خور شیروں سے انسانی زندگی کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ کوئی فرد شیر کا نوالہ بن جائے تو محکمہ جنگلات لواحقین کو مقررہ معاوضہ یعنی دو سو ٹکا ادا کرتا ہے۔

خدا خدا کر کے صبح کے چھ بجے ہم مچان سے اتر کر گاؤں پہنچے۔ سندربن کے جنگلات میں بعض مقامات پر

سُنتِ نبوی ﷺ میں شفا ہے
سرکہ بہترین سالن ہے۔ اے اللہ تو سرکہ میں برکت ڈال کہ یہ مجھ سے پہلے نبیوں ﷺ کا سالن تھا اور وہ گھر غریب نہ ہوگا جس میں سرکہ موجود ہے۔ (ابن ماجہ)
T.M.
Doctor's
Unpasteurized, Unfiltered & Living
Natural
APPLE CIDER VINEGAR
With Mother
100% Pure
انتہائی خالص اور پاک صاف
WONDERFUL DRUG OF YESTERDAY & TODAY
کھٹاس بڑھانے کیلئے تیزاب یا ترش اشیاء سے پاک بغیر کسی مصنوعی خوشبو اور رنگ کی آمیزش کے صاف ستھرے پھلوں سے تیار کردہ
انتہائی خالص اور پاک صاف انگوری سرکہ بھی دستیاب ہے
شوگر کے مریضوں کے لیے قدرتی سرکہ جامن دستیاب ہے
بہترین قدرتی اینٹی آکسیڈنٹ اور اینٹی کینسر اجزا کے ساتھ
وزن کم کرتا، پیٹ اور کولہوں کی فالتو چربی تحلیل کر کے سمارٹ بناتا ہے۔
کولیسٹرول کم کر کے بلڈ پریشر، امراض دل اور فالج سے بچاؤ میں معاون ہے۔
شوگر کنٹرول کرنے میں مدد کرتا ہے۔
نظام انہضام کی اصلاح کرتا ہے۔
ناخنوں کو خوبصورت اور مضبوط بناتا ہے۔
Osteoporosis اور جوڑوں کے درد میں کمی کرتا ہے۔
جگر اور پتہ کے امراض میں فائدہ مند ہے۔
خالص یا بموزن پانی ملا کر جسم کے کھلے حصوں پر لگانے سے مچھر نہیں کاٹتا
ملک بھر سے ڈسٹری بیوٹرز درکار ہیں
اسٹاکسٹ حضرات اس نمبر پر رابطہ کریں
0321-4435960
0423-5761796
طاہر جاوید
ڈاکٹر اصغر علی
(ایم بی بی ایس)
0321-9785644
0321-8823321
62-P

دن کے وقت بھی گھپ اندھیرا ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم لوگ انتہائی حفاظتی انتظامات کے ساتھ چلتے تھے۔ بندوقیں تیار رکھتے جو مقامی گاؤں والوں کی تھیں۔ میرے پاس ۳۷۵ میگنم رائفل تھی۔ میں نے راجستھان اور مدھیہ پردیش (بھارت) کے جنگلات میں بھی وقت گزارا لیکن جو بات سندر بن کی ہے وہ کہیں اور نہیں۔

ایک دن لانچ پر دریائے ملانچہ کی طرف جا رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی چیخ پکار سنائی دی۔ لانچ رکوائی تو دیکھا، چھ سات افراد ایک انسانی لاش کے گرد جمع تھے جسے آدم خور شیر نے بری طرح چیر پھاڑ دیا تھا۔ ہم نے وہاں تین دن تک مچان پر شیر کا انتظار کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ شیر کے ہاتھوں شکار ہونے والوں میں زیادہ تر شہد جمع کرنے اور مچھلی پکڑنے والے شامل ہوتے تھے۔ کبھی کبھی تو لانچ پر بیٹھے آدمیوں کو بھی شیر اچک کر ہلاک کر دیتے۔

(سندر بن کے جنگلات۔ تہور صدیقی ایڈووکیٹ)

ساتواں رنگ

شاہکار تخلیق کرنے والوں کا ملک، اُردن

شام، عراق، سعودی عرب اور اسرائیل کے درمیان گھرا ہوا، ۳۵۶۳۷ مربع میل کا چھوٹا سا کہساری تما ملک اردن انتہائی جغرافیائی اور قدیم تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر اسرائیل اور اردن کے درمیان سرحد فاصل ہے۔ اردن کوئی الگ ملک نہیں تھا بلکہ یہ خطۂ زمین دریا کی نسبت سے ''ورائے اردن'' یا Transjordan کہلاتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے اسے فلسطین کے ساتھ ترکوں سے چھین کر اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ بعدازاں اپنے زیرِ نگیں اسے عبداللہ بن حسین کی ماتحتی میں دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ''بے مثال وفاداری'' کی بنا پر انگریزوں نے اپنی سرپرستی موقوف کر دی اور ۱۹۴۶ء میں عبداللہ کو بطور بادشاہ تخت نشین کر دیا جو ۱۹۵۱ء میں قتل ہوئے۔ ان کے بیٹے شہزادہ طلال نے زمامِ اقتدار سنبھالی لیکن ''ذہنی مریض'' قرار دیے جانے کے باعث اگلے سال ہی انھیں معزول کر کے ان کے بیٹے حسین کو سلطنت سونپ دی گئی۔ انھوں نے ۴۶ برس کی ہنگامہ خیز حکومت کے بعد ۱۹۹۹ء میں سرطان کے مرض میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ موت سے چند روز پہلے انھوں نے ۳۴ برس سے اپنے وفادار ولی عہد بھائی شہزادہ حسن کو اچانک عہدے سے معزول کر کے حکومت اپنے فرزند عبداللہ ثانی کے سپرد کر دی جو فوج میں افسر تھے۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔

اردن کی میری مختصر سی سیاحت ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۲ء چار بار ہوئی۔ دو تین مرتبہ میں نے اپنے بھتیجے نثار آرائیں کے پاس عمان میں قیام کیا۔ وہ عالیہ ایئرلائن میں ایک اعلیٰ عہدے پر متمکن تھے۔ سبکدوشی کے بعد اب وہیں مقیم ہیں۔ ان کی معیت میں اس مختصر ملک کی چند روزہ سیر بہت دلچسپ رہی۔

مشرقِ وسطیٰ کے دوسرے ممالک کی طرح اردن بھی ازمنۂ قدیم میں مختلف خداؤں اور صنم پرستی کے دور سے گزرتا اشوری، بابل اور ایرانی سلطنتوں کا حصہ رہا۔ یونانی بھی اس پر قابض رہے۔ ۳۲۰ ق م میں یہ خطۂ زمین عربی زبان بولنے والے نبطیوں کے زیرِ اقتدار آ گیا۔ پہلی صدی عیسوی میں یہ رومیوں کی عربی مقبوضات کا حصہ تھا۔ حتیٰ کہ ظہورِ اسلام کے بعد ۶۳۶-۶۳۳ء کے درمیان ۱۳-۱۲ ہجری میں اسے عربوں نے فتح کر کے مشرف بہ

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

اسلام کیا۔ خلافت ترکیہ کا اقتدار یہاں سولہویں صدی عیسوی میں قائم ہوا۔

اُردن کا دارالحکومت عمان پہاڑی اور نشیبی زمین کا حسین امتزاج ہے۔ دراصل یہ شہر وادی زرقا میں آباد ہے کہ اس کا ایک حصہ پہاڑی علاقے میں بلندی پر ہے اور دوسرا نیچے وادی میں۔ سڑک پر چلتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم شہر کی فصیل کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ نیچے پرانا شہر آباد ہے اور ایک طرف جدید آبادی۔ پتھروں سے تعمیر نئی عمارتیں کشادہ اور خوبصورت ہیں۔ مجھے یہ شہر تصنع سے بے نیاز، بے تکلف اور بہت ہی بھلا لگا۔ گھومنے پھرنے میں کوئی اجنبیت اور پتے ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

عمان کے شمال میں ساٹھ ستر کلومیٹر دور کلاسی کے دور سے متعلق آثار سے معمور جرش کا خوبصورت قصبہ ہے۔ جرش کا دورِ عروج غالباً رومی دورِ سلطنت میں رہا۔ انھوں نے یہاں اپنے طرز کی تعمیرات کیں جن میں ایک محراب اور ایک مدرج تماشاگاہ اپنے زینوں کے ساتھ اب بھی محفوظ ہے۔ چونکہ یہ عام شاہراہ سے ہٹ کر ہے، اسی لیے زمانے کی دست برد سے کافی حد تک محفوظ رہی۔ ورنہ اتنی مدت میں لوگ اپنی تعمیرات کے لیے اینٹیں پتھر اکھاڑ کر لے جاتے۔ پرانی تہذیبوں کے شائق لوگوں کے لیے یہ بہترین سیرگاہ اور نمونۂ عبرت ہے۔

کلہاڑی نما نقشہ

شمال سے جنوب کی طرف عقبہ جاتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ ہم تاریخی قلعے ''کرک'' کی زیارت سے محروم رہتے، جس نے قوموں کے عروج و زوال کے نجانے کتنے دورِ پرآشوب دیکھے تھے۔ پانچ ہزار سال قدیم تجارتی شاہراہ پر واقع یہ قلعہ کئی فتوحات اور ناکامیوں کا امین ہے۔ سطح سمندر سے ۳۴۰۰ فٹ کی بلندی پر بیت المقدس کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا۔ مٹی سے بنا یہ نہایت مضبوط قلعہ کم و بیش پچاس برس تک صلیبی عیسائیوں کے قبضے میں رہا، حتیٰ کہ ۱۱۸۹ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے اُن سے چھین لیا۔

خلیج عقبہ کی طرف آگے بڑھتے ہوئے عمان سے تقریباً ۱۱۵ میل کے فاصلے پر ''بطرہ'' کا عجیب و غریب شہر دیکھا جس کے پہلو میں سرسبز و زرخیز وادی موسیٰ اور چشمے ہیں۔ وادی میں سے گزرتے ہوئے ایک چشمے میں نصب ٹیوب ویل سے خنک پانی پینے کے لیے ہم نے پانی کو میٹھا اور خوش ذائقہ پایا۔

بطرہ فنِ سنگ تراشی، شہری منصوبہ بندی، انجینئرنگ اور انسانی عزم و استقلال کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ یہ شہر پہاڑوں کے اندر تراش کر بنائے ہوئے گھروں، محلات اور گلیوں پر مشتمل ہے۔ باہر سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ اندر پورا شہر آباد ہے۔ عام پہاڑ کی طرح صرف اونچی نیچی

www.Paksociety.com

سرخ رنگ کے پتھر کی چٹانیں دکھائی دیتی ہیں۔ قریب پہنچ کر ایک غار سی نظر آتی ہے۔ اس میں داخل ہو جائیں تو معلوم ہوتا ہے یہ ایک تنگ سی گلی یا شہر میں داخلے کے لیے شارع عام ہے۔ دونوں طرف نہایت بلند و بالا چٹانیں ہیں کہ سورج کی شعاعیں سطح زمین تک نہیں پہنچ پاتیں اور آدمی نیم تاریکی میں آگے قدم رکھتا جاتا ہے۔

گردن اٹھا کر عمودی طور پر دیکھیں تو دور کہیں نیلے آسمان کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور سورج کی سنہری کرنیں چٹانوں کی چوٹیوں پر رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں کہیں اچانک دائیں یا بائیں کوئی راستہ مڑ جاتا ہے گویا ہم بھول بھلیوں میں کھو گئے ہوں۔ گلیوں کے دونوں طرف پہاڑ سے تراشے ہوئے دروازے ہیں، جو یا تو رہائشی مکانات تھے، یا ان کے اندر کسی کا مدفن ہوگا۔ مزید اندر جا کر سامنے یکایک ایک کشادہ میدان آ جاتا ہے جو چاروں طرف سے بلند و بالا چٹانوں میں محصور ہے۔ میدان کی چاروں اطراف میں چٹانوں کی دیواروں سے تراشے وسیع و عریض دالان، مکانات اور دیگر عمارات ہیں۔ ان کی چھتیں بھی اسی طرح تراش کر نکالی گئی ہیں۔ کوئی عمارت پتھر کی سلوں یا کسی دوسرے مواد سے تعمیر نہیں کی گئی۔ نہ ہی دیواریں تراش کر چھتیں الگ سے ڈالی گئیں بلکہ تمام کا تمام ڈھانچہ ایک ہی چٹان سے تراشا گیا۔

دالانوں کی اندرونی تراش خراش کی صفائی اور ہنرمندی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ پتھر کی دیواریں ریشم کی طرح ہموار اور صاف ہیں اور کونے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے۔ تمام عمارات حیرت انگیز حد تک متناسب ہیں۔ بیس پچیس فٹ بلند چھتیں بھی اسی طرح صاف اور چمکدار ہیں۔ نقش و نگار کی پوری نزاکت سے تراشے ہوئے "معبودوں" کے بت نفیس ہنرمندی کا مظہر ہیں۔ بعض عمارتیں چٹان کی بلندی کے مطابق دو تین منزلہ ہیں۔ ان انسانوں کی جدوجہد، دست ہنرمند اور قوت ارادی قابل ستائش ہے جنھوں نے ڈھائی تین ہزار سال قبل جدید مشینوں، اوزاروں اور دیگر سہولتوں کے بغیر ایسے عظیم شاہکار تخلیق کیے۔

بطور مرکز تھا اور یہی قوم ثمود کا دارالحکومت اور قوم عاد کا مسکن تھا۔ عاد زبردست، طاقتور اور ملک گیر اور جسمانی لحاظ سے نہایت قد آور و قوی ہیکل لوگ تھے۔ حضرت ہودؑ اسی قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے۔ قرآن پاک میں اس قوم کا ذکر آتا ہے۔ آیات الٰہی سے انکار، اپنے انبیا سے حجت و استہزا اور کبر و غرور میں وہ اتنے بڑھے کہ تباہی ان کا مقدر ہو گئی۔ آج دنیا میں ان کا کوئی نام لیوا نہیں، صرف چند کھنڈرات کے نشانات عبرت کے لیے موجود ہیں۔

اردن کی موجودہ ملکہ رانیہ عبداللہ اندرون و بیرون ممالک جانی پہچانی شخصیت ہیں حالانکہ اس وقت ان کی عمر ۴۱ برس لیکن ان کے اندر اپنے ملک کی خدمت کرنے کا

جذبہ جوان اور توانا ہے۔ اپنے ملک میں بچوں کے لیے اعلیٰ معیاری تعلیم کے لیے وہ ہر دم کوشاں جبکہ بیرون ملک عالمگیر سطح پر بامقصد تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے سرگرم ہیں۔

تجارتی شاہراہ عام پر واقع اور پہاڑوں کے اندر محفوظ ہونے کے باعث بہت کم حملہ آوروں کی نگاہیں اس پر پڑتی بلکہ شہر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا۔ اس لیے نبطی خود محفوظ رہتے ہوئے، آنے جانے والے قافلوں سے محصول وصول کرتے اور اپنی سلطنت وسیع کرتے ہوئے دمشق تک جا پہنچے۔

اسی شہر کا قدیم نام "رقیم" تھا جہاں اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا۔ قرآن کریم میں ہے "کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار اور "رقیم" والے ہماری نشانیوں میں کچھ تعجب کی چیز تھے۔ (سورۃ الکہف آیت ۹)

(انبیا کی سرزمین اردن۔ ابوالاقبال ق۔ س۔ مسلم)

یہ نومبر کے وسط کی بات ہے، راقم چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں یہ تذکرہ ہونے لگا کہ شمالی علاقہ جات میں وقتاً فوقتاً حملے کرنے اور عموماً بے گناہ پاکستانیوں کو نشانہ بنانے والی امریکی ڈرونیں تباہ کیوں نہیں کی جاتی؟ تب مختلف نظریے سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ وہ ''اسٹیلتھ'' مواد سے تیار ہونے کے باعث پاکستانی ریڈاروں پر نہیں آتی، اپنی حکومت انھیں پاکستانی حدود میں آنے کی اجازت دیتی ہے اور یہ کہ سی۔آئی۔اے چوری چھپے ڈرونوں سے میزائل گراتی ہے۔

اس بحث کے ٹھیک بیس دن بعد ۴ دسمبر کو ایرانی حکومت نے یہ اعلان کر کے دنیا بھر کے عسکری و عوامی حلقوں میں ہلچل مچا دی کہ ایرانی ماہرین نے امریکہ کی جدید ترین ڈرون، آر۔کیو۔۱۷۰ سینٹینل (RQ-170 Sentinel) اڑتے ہوئے اتار لی۔ ایرانی سائنس دانوں کی یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ خصوصاً امریکی اور اسرائیلی یہ جان کر ششدر رہ گئے۔ وہ تو ایرانی ایٹمی تنصیبات پر بمباری کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے لیکن ایرانی ماہرین نے جدید امریکی ڈرون گرا کر ثابت کر دیا کہ وہ غافل نہیں بیٹھے اور ان کا دفاع خوب مضبوط ہے۔

شروع میں امریکی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ ڈرون ایرانی علاقے میں گر کر تباہ ہو گئی۔ لیکن جب ایرانیوں نے ٹی۔وی پر صحیح سالم ڈرون دکھائی، تو امریکی حکومت چوکڑی بھول گئی۔ ساتھ ہی امریکی و یورپی عسکری حلقوں میں یہ بحث و مباحثہ ہونے لگا کہ ایرانیوں نے آخر اسے اتارا کیسے؟ اس ضمن میں اب تک جو تفصیل سامنے آئی ہے، اس کا جوہر پیش خدمت ہے۔

سینٹینل دنیا کی جدید ترین ڈرون ہے۔ اس کی تیاری میں ایسا خصوصی مواد استعمال ہوتا ہے جو ریڈار میں نظر نہیں آتا۔ اسی لیے صرف طاقتور ریڈار ہی اسے پکڑ سکتے ہیں۔ پھر یہ ''۵۰ ہزار فٹ'' کی بلندی پر پرواز کرتی ہے۔ یہ امر بھی ۸۵ فٹ لمبی اور ۶ فٹ چوڑی سینٹینل کو ریڈار سے محفوظ رکھتا ہے۔ پورے ساز و سامان سمیت اس ڈرون کی مالیت ۶۰ لاکھ ڈالر (۵۲ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے) ہے۔

امریکی ڈرون اتارنے کے لیے ایرانی ماہرین کو تین بنیادی کام کرنے پڑے (۱) سینٹینل کی شناخت (۲) اس میں مواصلاتی سیارے (سیٹلائٹ) کے سگنل جام کرنا اور (۳) حقیقی سگنل کی جگہ اپنا جعلی سگنل ڈالنا تاکہ ڈرون کے بھی اندرونی نظام ایرانیوں کے مطیع ہو جائیں۔

امریکی کئی ماہ سے سینٹینل ڈرونوں کے ذریعے ایرانی ایٹمی تنصیبات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دراصل انھیں شک ہے کہ ایرانی مختلف شہروں مثلاً قم یا مشہد میں زیرِ زمین عمارتیں بنا کر وہاں ایٹم بم بنانے کے قابل یورینیم افزودہ کر رہے ہیں۔

فوجی یا سول مواصلاتی سیاروں کے ذریعے ان تنصیبات پر مسلسل نظر رکھنا ممکن نہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ چند منٹ رکنے کے بعد آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جبکہ ڈرون کے معاملے میں یہ ممکن ہے کہ اسے گھنٹوں ۵۰ ہزار فٹ اوپر رکھا جائے۔ یوں ایک مشکوک جگہ لوگوں کی آمد و رفت پر مسلسل نظر رکھ کر خاصی حد تک یہ پتا چلایا جا سکتا ہے کہ وہاں کس قسم کا کام ہو رہا ہے۔

امریکیوں نے سینٹینل میں طاقتور وڈیو کیمرا ہی نصب نہیں کیا، بلکہ انتہائی قوت والا ایسا ریسیور بھی لگایا جو مشکوک جگہ ہواؤں کے دوش پر ہونے والی پیغام رسانی پکڑ سکتا ہے۔ یہی نہیں، ڈرون میں ایسے حساس سینسر نصب ہیں جو کسی ایٹمی مقام سے خارج ہونے والی تابکار اور کیمیائی مادوں کی تلچھٹ فوراً پکڑ لیتے ہیں۔ انہی خصوصیات کے باعث امریکہ نے سینٹینل سے متعلق معلومات بڑی خفیہ رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ اس کا حدود اربعہ بھی ایرانی ماہرین ڈرون پکڑنے کے بعد دنیا والوں کے سامنے لائے۔

ایرانیوں نے کشمار نامی ایرانی قصبے کے نزدیک امریکی ڈرون کا شکار کیا جو افغان ایران سرحد سے ۱۴۰ میل دور ہے۔ امریکی اور اسرائیلی سائنس دانوں کو سب سے زیادہ اچنبھا یہ تھا کہ ایرانی سائنس دانوں نے ڈرون کا پتا

www.Paksociety.com

کیسے چلایا؟ دراصل یہی کٹھن ترین مرحلہ تھا۔ آخر کسی ایرانی غدار نے انھیں بتا دیا کہ حکومت ایران نے حال ہی میں روس سے جدید ترین ریڈار نظام "اوتو بازہ" (Avtobaza) خریدا ہے۔ چنانچہ امریکیوں کا تجسس دور ہو گیا۔

دراصل کنٹرول سینٹر سے لائیو وڈیو بذریعہ مواصلاتی سیارہ امریکہ پہنچ رہی تھی۔ یہی برقی سگنل اوتو بازہ کے جدید ترین ریسیور میں پکڑے گئے۔ گویا برقی سگنلوں نے ڈرون کو پکڑوا دیا۔ ماہرین کے مطابق شناخت کے بعد اگلا مرحلہ ڈرون اور مواصلاتی سیارے کے مابین جی۔پی۔ایس سگنلوں کا رابطہ توڑنا تھا۔

برقی (الیکٹرونک) فن جنگ میں طاق، ایرانی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے جی۔پی۔ایس سگنل نظام میں موجود ایک تکنیکی خامی (Vulnerability) سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ پہلے اس خامی کی مدد سے کنٹرول سینٹر کا امریکی فوجی مواصلاتی سیارے سے رابطہ توڑا گیا۔ پھر ایرانی ماہرین نے امریکی کی جگہ ایرانی سگنل ڈرون میں بھر دیا۔ یوں ایرانی امریکی ڈرون کو دھوکا دینے میں کامیاب رہے۔ بعد ازاں انھوں نے ڈرون ایسے ایرانی علاقے میں اتار لی جو افغانستان میں اس کے مستقر جیسا طول بلد و عرض بلد رکھتا تھا۔

امریکی ماہرین یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جی پی ایس سگنل نظام میں کوئی خامی ہو سکتی ہے، تاہم وہ یہ نہیں مانتے کہ اُسے ایرانی ماہرین نے دریافت کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یقیناً ایران میں برقی فن جنگ کے روسی یا چینی ماہرین موجود تھے۔ انہی کی مدد کے باعث ایرانیوں کو کامیابی ملی۔ حالانکہ ایرانی ماہرین ۲۰۰۶ء میں اپنی صلاحیتوں کا شاندار مظاہرہ کر چکے ہیں۔

۲۰۰۶ء میں لبنان پر حملہ آور ہونے سے قبل اسرائیلی فوج نے لبنانی فضاؤں میں ڈرونیں اور خصوصی طیارے بھجوا دیے تھے۔ ان اڑن مشینوں میں ہر قسم کی برقی پیغام رسانی کرنے والے آلات مثلاً ریڈیو، موبائل، وائرلیس وغیرہ جام کرنے والے آلے (جامر) نصب تھے۔ لہٰذا اسرائیلیوں کو یقین ہو گیا کہ مختلف علاقوں میں موجود حزب اللہ کے گوریلوں کا آپس میں رابطہ منقطع ہو چکا۔ وہ پھر مزے سے دندناتے لبنان میں داخل ہو گئے۔

لیکن اسرائیلی جہاں پہنچتے، گوریلوں کے ہتھیار ان کا استقبال کرتے اور راہ روک لیتے۔ یہ اس امر کی نشانی تھی کہ ان کی پیغام رسانی نہ صرف بحال ہے، بلکہ وہ اسرائیلی فوج کی نقل و حرکت سے بھی خوب واقف ہیں۔ اس حقیقت نے اسرائیلی حکومت کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ لبنان میں برقی فن جنگ (Electronic Warfare) کے ایرانی ماہرین موجود تھے۔ انھوں نے کمیونیکیشن جام کرنے سے روکنے والے آلات (اینٹی جامروں) کی مدد سے اسرائیلی برقی حملہ ناکام بنا دیا۔ چنانچہ حزب اللہ کے گوریلوں کا باہمی رابطہ برقرار رہا۔

واضح رہے، اس جنگ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ چونکہ دنیا کی طاقتور ترین فوج میں سے ایک، اسرائیلی فوج حزب اللہ کے مٹھی بھر گوریلوں کو شکست دینے میں ناکام رہی، لہٰذا اس کی پسپائی کو ہار ہی سمجھا گیا۔ اس کی ناکامی میں ایرانی ماہرین کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ پہلی جنگ تھی جو یہ جدید عسکری نظریہ سامنے لائی کہ برقی فن جنگ میں طاق ماہرین رکھنے والی ایک چھوٹی قوت بھی بڑی طاقت کو شکست دے سکتی ہے۔

امریکی ماہرین کے اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ فوجی مواصلاتی سیارے اور ڈرون کے مابین سگنل کا سارا نظام رمزی (Encrypted) ہوتا ہے۔ مزید براں یہ سارا نظام امریکی آلات و مشینوں پر امریکی پروگراموں (سافٹ ویئروں) کے ذریعے ہی چلتا ہے۔ نیز امریکی فوجی مستقر میں بیٹھے ڈرون چلانے والوں کو ذرا سا بھی احساس ہو جائے کہ ان کی اڑن مشین خطرے میں ہے، تو وہ سگنل کا رمز فوراً بدل دیتے ہیں۔ امریکی ماہرین کے نزدیک ایسی صورت حال میں کوئی ایرانی جوہر قابل ہوگا جو رمزی کوڈ توڑنے میں ناکام رہا۔

بعض امریکی ماہرین کا خیال ہے کہ جیسے ہی ڈرون شناخت ہوئی، برقی آلات جام کرنے والے آلات سے لیس ایرانی طیارے اس کے اوپر پہنچ گئے۔ انھوں نے پھر ڈرون پر مختلف قسم کی فریکوئنسیوں کی بمباری کر دی۔ چنانچہ کوئی نہ کوئی ڈرون کے سگنل نظام کی فریکوئنسی سے میل کھا گئی اور یوں ایرانی اُسے قابو کرنے میں کامیاب رہے۔

یہ بہرحال حقیقت ہے کہ ایرانیوں نے سینٹینل جیسی بیش قیمت ڈرون صحیح سالم زمین پر اتار لی۔ انھوں نے اُسے کیونکر قابو کیا، یہ ابھی راز کی بات ہے۔ واضح رہے، سینٹینل کے سگنل کا رابطہ جیسے ہی امریکی مستقر سے منقطع ہو، اس میں خودکار (آٹو) پائلٹ نظام حرکت میں آ جاتا ہے۔ وہ پھر اُسے افغان مستقر لے جا اتارتا ہے۔ چونکہ ایرانیوں نے یہ خودکار نظام متحرک نہیں ہونے دیا، یہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ ڈرون پر برقی کنٹرول حاصل کر چکے تھے۔

سینٹینل کی قدر و قیمت

بعض امریکی ماہرین عسکریات نے یہ کہہ کر حادثے کی اہمیت کم کرنا چاہی کہ محض ایک ڈرون گرانے سے انھوں نے کوئی پہاڑ نہیں ڈھا لیا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے سے امریکیوں کو بڑا دھچکا لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ ترین سطح پر یہ منصوبہ بنا کہ طیارے یا کمانڈو بھیج کر ڈرون تباہ کر دی جائے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اسے ترک کرنا پڑا کہ یوں ایران سے کھلم کھلا جنگ شروع ہو جائے گی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یوں سمجھیے، بہ شکل سینٹینل ایرانیوں کے ہاتھ ہما آ گیا۔ وجہ یہ ہے کہ اس ڈرون کا ہر پرزہ سائنس و ٹیکنالوجی کا جدید ترین شاہکار ہے۔ اس کے سینسر، کیمرے، ریڈار، انجن، کیمیائی مادے جن سے وہ تیار ہوئی، برقی آلات...... غرض ہر شے ایسی ٹیکنالوجی کی اختراع ہے جو ابھی روسی اور چینی بھی ایجاد نہیں کر سکے۔ یوں ایرانیوں کے ہاتھ ایسا امریکی خزانہ لگ گیا جسے وہ من پسند شرائط پر روس یا چین کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں۔

دراصل روس اور چین کے ماہرین کسی بھی شے کی ہو بہو نقل تیار کرنے میں ماہر ہیں۔ سائنسی اصطلاح میں یہ عمل "ریورس انجینئرنگ" کہلاتا ہے۔ امریکی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ روسی اور چینی سینٹینل کی نقل نہیں بنا سکتے، تاہم وہ اس کے ہائی ٹیک آلات کے راز ضرور جان لیں گے۔

مثال کے طور پر سینٹینل کے سینسر اور ریڈار ان کی توجہ کا مرکز بنے گا۔ اسی جدید ریڈار کی بدولت ڈرون وسیع علاقہ نظروں میں رکھتی ہے۔ پھر اس کی اسٹیلتھ ٹیکنالوجی قابل توجہ ہے۔ امریکیوں نے ریڈار سے پوشیدہ رکھنے والی یہی ٹیکنالوجی اپنی پانچویں نسل کے (جدید) طیاروں میں بھی استعمال کی ہے۔ چنانچہ اس ٹیکنالوجی کی سن گن لے کر روسی و چینی امریکیوں کے طیارے مار گرانے کی ترکیب تیار کر سکتے ہیں۔

اسی طرح روسی اور چینی ڈرون کا انجن بھی بغور دیکھیں گے۔ یہ انجن طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کم ایندھن پینے والا ہے۔ چنانچہ اس کی بدولت سینٹینل پانچ ۱۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی اور ۵۰ ہزار فٹ کی بلندی پر جا پہنچتی ہے۔ مزید براں وہ کئی گھنٹے نہیں کئی دن تک فضا میں رہ سکتی ہے کیونکہ اس کا انجن بہت کم تیل پیتا ہے۔

آخر میں ایک دھماکا خیز انکشاف اسرائیلی اخبارات نے کیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سینٹینل کے کمپیوٹر میں ایرانی ایٹمی تنصیبات کے وہ نشانے موجود تھے جن پر اسرائیلی و امریکی حملہ آور طیاروں نے حملہ کرنا تھا۔ چونکہ یہ معلومات اب ایرانیوں کو مل چکی، لہٰذا اسرائیل اور امریکہ مجبور ہو گئے کہ وہ ایرانی ایٹم بم ختم کرنے والا اپنا منصوبہ ازسرنو تیار کریں۔

اس واقعے سے امریکیوں نے یہ سبق دیکھا کہ کسی بھی دشمن کو کمزور نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے زیادہ جدید ڈرون بنانے کا پروگرام بنایا ہے۔ دوسری طرف ایرانی مزید ہوشیار ہو گئے۔ انھیں پتا چل گیا کہ امریکی بڑی چالاکی سے ان پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ اب اگر امریکی پرندہ بھی ان کی حدود میں آیا، تو وہ اُسے مار گرائیں گے...... آخر انھیں اپنی قومی سلامتی اور عزت عزیز ہے۔ وہ ہماری طرح......

www.paksociety.com

۱۱ اقدامات اپنا کر بُری عادات سے چھٹکارا پائیے

ہم سب صحت مند، توانا اور خوشگوار زندگی گزارنا چاہتے ہیں لیکن ایسی عادات بھی اپنائے رکھتے ہیں جو ہمیں اس مثالی زندگی سے دور لے جاتی ہیں۔ عادت بدلنا بہت مشکل ترین مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔
ذیل میں دیئے گئے ۱۱ اصول ہماری راہنمائی کرتے ہیں کہ بری عادت سے کیسے نجات حاصل کی جائے

۱) تسلیم کرنا

بُری عادت سے نجات کا سب سے پہلا مرحلہ اسے بُرائی کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے۔ جب تک ہم خود کو یہ یقین نہیں دلاتے کہ فلاں عمل ہماری عادت بن چکا اور ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے، اس سے نجات ممکن نہیں ہوتی۔

۲) اکٹھا کرنا

بعض اوقات دو عادات آپس میں جڑی ہوتی ہیں۔ اس صورت میں ان دونوں کو ایک ہی وقت میں ختم کرنے کی کوشش اکثر سودمند ثابت ہوتی ہے۔ جیسے بہت زیادہ ٹی۔وی دیکھنا اور ساتھ ساتھ معمول کی خوراک کے علاوہ بے تحاشا کھاتے رہنا۔

۳) پُرعزم ہونا

صرف حقائق جاننا کافی نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم جانتے ہیں کہ تلی ہوئی اشیا کا بہت زیادہ استعمال دل کی بیماریوں کا باعث بنتا ہے، تو ہم میں سے اکثر ان حقائق کے باوجود اپنی عادت پہ قائم رہتے ہیں۔ بہتر زندگی کے امکانات کے لیے شدید خواہش اور عزم بہت ضروری ہے۔ خود کو ذہن نشین کروائیں کہ نئے طرزِ عمل سے چھٹکارا پانے کی صورت میں زندگی کی کتنی مسرتیں آپ کی منتظر ہوں گی۔ اس سوچ سے آپ میں حوصلہ اور ہمت پیدا ہوگی۔

۴) ہجوم کا حصہ نہ بنیں

بُری عادت سے چمٹے رہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی اس عادت کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم بڑی تعداد میں لوگوں کو فاسٹ فوڈ کا دیوانہ دیکھتے ہیں تو ہم بھی ان میں جا شامل ہوتے ہیں۔ اس مرحلے پر آپ کو یہ سوچنا ہے کہ یہ عادت آپ کے لیے نقصان دہ ہے اور آپ نے اپنی زندگی کو خود بہتر بنانا ہے نہ کہ ہجوم کا حصہ بنے رہنا ہے۔

ایسے لوگوں کے ساتھ کم وقت گزاریں جن کی عادات آپ کو ناپسند ہوں اور ان کے ساتھ زیادہ جن میں ایسی اچھی عادات ہوں جو آپ پسند کرتے ہوں۔

۵) خود کو عزت دیجیے

ذہن میں رکھیے کہ آپ میں اگر چند بُری عادات ہیں تو ساتھ ساتھ بے شمار اچھی عادات بھی آپ کی شخصیت کا حصہ ہوں گی۔ اس ذہنی رویے کے ساتھ آپ بُری عادت کا زیادہ اچھی طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔

۶) منصوبہ بندی کیجیے

ایک مرتبہ جب آپ درست ذہنی رویہ اختیار کر لیں تو اگلا مرحلہ اپنے طریقہ کار کی منصوبہ بندی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کب اپنی کوشش شروع کریں گے اور اپنی کارکردگی کا جائزہ کیسے لیں گے۔

۷) عمل کیجیے

ابھی تک ہم نے ذہنی رویوں کی بات کی ہے جو بُری عادت کے حصار سے نکلنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ایک اہم چیز عمل کے لیے نکل پڑنا ہے یعنی صرف سوچتے رہنا مسئلہ کا حل نہیں بلکہ ارادہ کیجیے اور اس پر عمل شروع کر دیں۔

۸) تبادلہ کیجیے

بُری عادت ختم کرنے کا سب سے آسان طریقہ اس کو کسی اچھی عادت سے بدل لینا ہے۔ جیسے رات کے کھانے کے بعد ٹی۔وی دیکھتے رہنے کی عادت کو چہل قدمی کی عادت سے بدلا جا سکتا ہے۔ یاد رکھیے، تمام عادات بُری نہیں بلکہ غیر صحت مند عادتیں بُری ہوتی ہیں۔

۹) ساتھ ملائیے

کاروباری دُنیا کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ ایک ہی مقصد کے لیے کوشش کرنے والے افراد ان لوگوں کی نسبت زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو فرداً فرداً مصروف عمل ہوں۔ بُری عادت سے چھٹکارے کے لیے اچھا دوست تلاش کیجیے جو آپ کی کوشش میں آپ کا معاون بنے۔ آپ کو یاد دہانی کرواتا رہے یا تعریف سے آپ کا حوصلہ بڑھائے۔

۱۰) انعام دیجیے

اگر آپ کی کوشش کامیاب ہو رہی ہے تو خود کو انعام دیجیے۔ یہ انعام کسی ایسی نئی عادت کے آغاز کی شکل میں نہیں ہونا چاہیے جو آپ کے لیے نقصان دہ ہو۔ جیسے فاسٹ فوڈ کھانے کی عادت سے نجات کی صورت میں خود کو ایک دن کے لیے فاسٹ فوڈ کی عیاشی کا تحفہ نہ دیجیے۔

۱۱) معاف کرنا / درگزر کرنا

جب آپ ناکام ہو رہے ہوں تو خود کو مجرم نہ سمجھیں اور خود کو ڈانٹ اور ملامت نہیں۔ اگلے دن نئے سرے سے اپنی کوشش کا آغاز کریں اور پوری دیانت داری سے بُری عادت کو شکست دینے کی کوشش کریں۔ ماضی کی غلطیاں تاریخ کا حصہ ہوتی ہیں، ان سے سیکھیں اور آگے بڑھیں۔ جو لوگ بُری عادت سے نجات کے لیے پُرعزم ہوں، وہ چھوٹی چھوٹی وقتی ناکامیوں سے نہیں گھبراتے۔

www.Paksociety.com

چین کے سب سے اونچے برفانی پہاڑ
کی سیاحت پر نکلے ایک امریکی استاد کی
دل ہلا دینے والی کہانی

ال ملشین کا
گمشدہ مُسافر

اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور وہ مدد سے میلوں دور تھا
پراڈوالا نو قصبے میں مقیم اس کے بیٹے کی چھٹی حس بتا رہی تھی
کہ باپ کسی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہے

ہادی حسین

www.Paksociety.com

سین

آہ سٹن جب چھوٹا سا تھا، تو اسے باغات، ساحل سمندر، پہاڑوں وغیرہ پر پیدل چلتے ہوئے فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے کا چسکا پڑ گیا۔ خصوصاً پہاڑی مقامات کی خوبصورتی نے سین کا دل موہ لیا۔ چنانچہ وہ جوان ہوا، تو اس نے اپنے وطن، امریکہ اور یورپ کے کئی پہاڑوں کی پیدل چلتے ہوئے سیر کر ڈالی۔ بعدازاں اس نے یونیورسٹی میں اپنی ہم جماعت، میگن سے شادی کر لی اور ان کے ہاں ایک فرزند، تولد ہوا۔ دونوں نے جرمن زبان سیکھی اور پھر یونیورسٹی آف مسوری میں پڑھانے لگے۔

پچھلے سال ماہ دسمبر میں ۴۵ سالہ ریان نے فیصلہ کیا کہ اہل خانہ کے ساتھ موسم سرما کی چھٹیاں اسپین میں گزاری جائیں۔ میاں بیوی نے بارہ سالہ آدیان کو ساتھ لیا اور جنوبی اسپین پہنچ گئے جہاں کئی پہاڑی سلسلے واقع ہیں۔ پہلے دو تین دن تو وہ غرناطہ میں ہسپانوی کھانوں سے لطف اندوز ہوئے۔ نیز اسلامی فن تعمیر کے عجائب دیکھے۔ پھر سین نے فیصلہ کیا کہ وہ تنہا ال ملشین کی سیر کرنے جائے گا۔ سیرا نویدہ نامی پہاڑی سلسلے میں واقع ال ملشین اسپین کا سب سے اونچا پہاڑ ہے جس کی بلندی ۳۴۷۸ میٹر (۱۱،۱۴۳ فٹ) ہے۔ جب موسم صاف ہو، تو اس پہاڑ کی چوٹی سے بحیرہ روم کے پار مراکشی سرزمین نظر آتی ہے۔

چوتھے دن وہ ال ملشین کے دامن میں آباد قصبے، پراڑوالو پہنچ گئے۔ اس علاقے میں سیر و تفریح کرنے آنے والے سیاحوں کا مرکز وہی قصبہ تھا۔ انھوں نے مضافات میں اپنا خیمہ لگایا تاکہ جنگل کے قدرتی مناظر سے محظوظ ہو سکیں۔ پہاڑ پر چڑھنے والے راستوں پہ برف جمی تھی اور وہ نمایاں و سیدھے تھے۔ کوئی بھی صحت مند آدمی معقول رفتار سے چلتا چار گھنٹوں میں چوٹی پر پہنچ سکتا تھا۔ اگلی صبح چمک دار سورج نمودار ہوا اور اس نے اپنی سنہری کرنیں چہار جانب بکھیریں، تو سین اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

جب رات کی تاریکی چھا گئی اور وہ نہیں پلٹا، تو سین کی بیوی اور بیٹا پریشان ہو گئے۔ آدیان بار بار ماں سے یہی سوال کرنے لگا ''ابو کب آئیں گے؟ وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟''

میگن اسے تسلی دیتی ''پیارے! وہ جلد آئیں گے۔'' ماضی میں بھی کئی بار اس کا شوہر اپنی مہمات سے فارغ ہو کر رات گئے گھر پہنچتا تھا۔ لیکن اس بار تمام حدیں پار ہو گئیں۔ چنانچہ جب رات کے گیارہ بجے، تو متوحش میگن نے بیٹے کو ہمراہ لیا اور پراڑوالو پہنچ گئی۔ وہ کسی مددگار کی تلاش میں تھی۔ لیکن رات بارہ بجے اس مقام پر اسے کون ملتا؟ سبھی لحاف اوڑھ کر اپنے بستروں میں دبک چکے تھے۔ دور چیر الفس کے مقام پر بھی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

آخر میگن کو ایک ہوٹل میں روشنی نظر آئی۔ وہاں استقبالیہ کلرک نے اس کا استقبال کیا۔ تاہم میگن کو ہسپانوی اور اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ لہٰذا وہ اپنا مدعا اسے نہ سمجھا سکی۔ اب مجبوراً اسے صبح ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ میگن یاد کرتے ہوئے بتاتی ہے ''صورت حال نے آدیان کو بہت فکرمند کر دیا۔ دراصل لڑکے کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ اس کے ابو کسی مشکل میں گرفتار ہو چکے۔''

☆☆☆

دوپہر تک سین ال ملشین کی چوٹی کے قریب پہنچ گیا۔ تاہم جب راستہ خطرناک حد تک پھسلواں اور بھربھری برف پیروں تلے کچلانے لگی، تو وہ رک گیا۔ سین دس پندرہ منٹ وہاں رکا اور اردگرد کے نظارے دیکھے۔ اسی دوران اچانک بادلوں نے چوٹی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گو سین نے اوپر تلے کئی گرم کپڑے پہن رکھے تھے، مگر اسے ٹھنڈ لگنے لگی۔ چنانچہ اس نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

برا ہو بادلوں کا کہ انھوں نے پہاڑ کے پورے بالائی حصے کو گھیر لیا تھا۔ لہٰذا دھند کی وجہ سے بمشکل پانچ فٹ دور کا منظر ہی صاف نظر آتا۔ چونکہ سین پہلی بار ال ملشین پر چڑھا تھا لہٰذا دھند میں اترتے ہوئے وہ راستہ کھو بیٹھا۔ اسے اس بات کا احساس شام کو ہوا جب تاریکی چھانے لگی

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

تھی۔ اسی اثنا میں ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں سین پانی میں شرابور ہوگیا۔

سین خاصی اترائی پر آچکا تھا، لیکن اب اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ کس طرف جائے۔ غلط سمت کا سفر اسے موت کے منہ میں بھی لے جاسکتا تھا۔ آخر رب کائنات سین پر مہربان ہوا اور اسے ایک جگہ پتھروں سے بنی کوٹھڑی نظر آئی۔ بطور جائے پناہ یہ غنیمت تھی۔ چنانچہ وہ اس میں داخل ہوگیا۔ سین نے پھر فیصلہ کیا کہ رات کوٹھڑی ہی میں گزاری جائے۔ صبح راستے کا تعین کرنا آسان ہوگا۔

کوٹھڑی تاریک اور سیلن زدہ تھی، مگر اسے ایک میز، چوبی نشست اور فوم کا ایک میلا کچیلا گدا ملا جسے وہ بطور بستر استعمال کرسکتا تھا۔ سین نے اپنے بیگ سے چاکلیٹ نکال کر کھائی اور پھر پرانے گدے پر ہو کے لیٹ گیا۔ تاہم نیند کوسوں دور تھی۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ بیوی اور بیٹا میری گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔ تاہم اسے یہ ڈھارس تھی کہ وہ خیریت سے ہے اور اگلی صبح باحفاظت ان کے پاس پہنچ جائے گا۔

آنکھ کب لگی، سین کو کچھ نہیں پتا، مگر وہ صبح چھ بجے روشنی ہوتے ہی اٹھ گیا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ پہاڑ کی دوسری سمت پہنچ جائے۔ دراصل وہاں پہاڑ زیادہ ترچھا تھا۔ سین کو یقین تھا کہ وہاں پہنچ کر وہ زیادہ تیزی سے نیچے اتر جائے گا۔

سین مناسب رفتار سے چلتے ہوئے پہاڑ کی مینڈ پر جا پہنچا۔ اچانک اس پر نئی آفت ٹوٹی اور تیز برفانی طوفان نے اسے آلیا۔ اس نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی بہت کوشش کی لیکن زوردار ہواؤں نے پھر اسے نیچے دھکیل دیا۔ وہ ہوا کے زور پر چلتا خاصی دور نکل گیا۔ جب طوفان تھما، تو اس نے خود کو چاروں طرف سے برف میں گھرے پایا۔ سین کو کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، تاہم اس امر سے واقف تھا کہ اسے نیچے جانا ہے۔

پہاڑ کا یہ حصہ بھی خاصا ڈھلوانی تھا۔ اس پر قدم رکھنے سے قبل سین نے برف کا جائزہ لیا۔ وہ بظاہر سخت اور چکنی نظر آئی۔ تب سین کو افسوس ہوا کہ وہ کریموز یا برفانی کلہاڑی اپنے ساتھ نہیں لایا۔ (کریموز جوتے تلے لگنے والے چھری نما آلات ہیں جن کے ذریعے پھسلنا آسان ہوجاتا ہے)۔ فی الوقت اس کے پاس لے دے کر سہارا دینے والی چھڑیاں تھیں۔

سین نے احتیاط سے منجمد سطح پر ایک قدم رکھا تاکہ اس کی سختی کا اندازہ لگا سکے۔ برف نے چھ سے تو اس کا کئی کلو وزن سہا، پھر یکایک ڈھے گئی۔ سین کا جو پاؤں رپٹا، تو وہ نیچے آرہا اور دور تک ڈھلوان پر لڑھکتا چلا گیا۔ راستے میں وہ کئی جگہ چٹانوں کے ابھرے کناروں اور پتھر جیسی برف سے ٹکرایا اور سدھ بدھ کھو بیٹھا۔

آخرکار کئی سو میٹر نیچے گرنے کے بعد سین ایک جگہ ٹھہر گیا۔ خاصی دیر تو اوسان بحال ہونے میں لگ گئے۔

پھر وہ اٹھ بیٹھا اور اپنی جسمانی حالت کا جائزہ لیا۔ اس کا سر ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ دائیں ٹانگ ڈھانپنے والا زیر جامہ جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اور گھٹنے سے رسنے والا خون صاف نظر آتا تھا۔ سیمن نے فکرمندی سے زخم کو بغور دیکھا۔ کسی نوکیلی چٹان نے گھٹنے پر اچھا خاصا بڑا گھاؤ ڈال دیا تھا۔ اس نے دائیں ٹانگ کو حرکت دی، تو درد کی ایک ٹیس پورے بدن میں پھیل گئی۔ سیمن نے ماتھے پر ہاتھ مار کر سوچا کہ یہ کیا مصیبت آگئی! لیکن وہ برف پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی پوری ہمت سمیٹی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

سیمن نے قدم بڑھایا، تو پھر دائیں ٹانگ میں درد کی اتنی شدید لہر اٹھی کہ وہ یک لخت نیچے گر گیا۔ اب خوف اس پر چھا گیا۔ وہ مدد سے کئی کلومیٹر دور تھا اور یقیناً اب مزید سیاح کئی ہفتوں تک وہاں نہیں آنے والے تھے۔ سیمن پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور وہ سر پکڑے برف پہ بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں یہی سوال چکر کھانے لگا کہ وہ اتنی شدید دھند میں مزید کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر کھڑا ہوا اور چلنے کی کوشش کی لیکن زخمی ٹانگ ساتھ نہ دے پائی۔ الٹا جب گھٹنے پر زور پڑا، تو گھاؤ سے خون ابل کر سفید برف پر سرخ گل کاریاں بنا گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ گھسٹتے ہوئے سفر کا آغاز کرے۔ یہ سفر سست اور خاصا اذیت ناک تھا۔ گھسٹتے گھسٹتے اچانک اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس کی سہارا چھڑیاں اونچی نیچی ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ انھیں بطور بیساکھی برتا جائے۔ وہ چھڑیوں کی مدد سے کھڑا ہوا، انھیں درست کیا اور ان کی مدد سے چند قدم چلا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ زخمی ٹانگ اوپر کیے ان عارضی بیساکھیوں کی مدد سے ایک ٹانگ کے سہارے چل سکتا ہے۔ یوں اترائی کی رفتار کچھ تیز ہوئی اور تکلیف میں بھی کمی آئی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد سیمن کو آخرکار ایک راستہ نظر آگیا۔ وہ پہاڑ سے اترتے ہوئے نیچے واقع جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ سیمن نے سکون کا سانس لیا، کیونکہ اسے راہ بھائی دے گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ راستہ کسی نہ کسی انسانی بستی تک لے جائے گا۔ تاہم طوفان کے باعث راستے پر برفانی تودے گرے پڑے تھے۔ انھیں پار کرتے ہوئے سیمن کو بہت وقت ہوئی اور ٹانگ کا درد بڑھ گیا۔ اسی دوران دن تمام ہوا اور ماحول پر تاریکی چھا گئی۔ تاہم سیمن نے پشتارے سے ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی میں سفر جاری رکھا۔ کبھی کبھی وہ رک کر چاکلیٹ کا ایک لقمہ کھاتا یا بوتل سے گھونٹ بھر لیتا۔

☆☆☆

سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی میگن جاگ اٹھی۔ وہ رات گئے تک جاگتے شوہر کا انتظار کرتی رہی، مگر اس کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ اب جاگنے پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ جب دن چڑھا، تو وہ آدیان کو لیے دوبارہ قصبے پہنچی۔ خوش قسمتی سے انھیں جلد پولیس گاڑی مل گئی۔ میگن نے ہسپانوی سفری لغت استعمال کر کے سپاہیوں کو بتایا کہ اس کا محبوب شوہر لاپتا ہو گیا تھا اور اب تک نہیں پلٹا۔

سپاہی اسے پولیس چوکی لے گئے۔ وہاں انچارج نے مقامی ایمرجنسی سینٹر کو حادثے سے مطلع کیا۔ فوراً ہی افسر اعلیٰ ڈرومن سانتوش کی سرکردگی میں ۱۶ رکنی جماعت سیمن کا کھوج لگانے روانہ ہوگئی۔

www.paksociety.com

میرے شوہر کو مستقل مزاجی، دلیری اور ہمت نے موت کے منہ میں جانے سے بچایا

سین کو گئے ۲۴ گھنٹے ہو چکے تھے اور اس دوران موسم نے پوری کروٹ بدل لی۔ بالائی پہاڑ پر گہرے سفید بادل چھا گئے اور ۹۷ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا چلنے لگی۔ نتیجتاً لفٹیں بند کردی گئیں۔ ماہ دسمبر میں چھوٹے بڑے برفانی طوفان آتے رہتے تھے لیکن کبھی کبھی وہ جان لیوا ثابت ہوتے۔

۲۰۰۶ء میں ۳ برطانوی سیاح چوٹی پر پہنچے ہی تھے کہ اچانک ایک برفانی طوفان نے انھیں جادبوچا۔ وہ برف میں دب کر ہلاک ہوگئے۔ سانتوش اور اس کے ساتھی برف گاڑی میں بیٹھے لفٹوں تک پہنچے۔ وہاں سے انھیں پیدل پہاڑ کی بلندی پر جانا تھا۔ اوپر چڑھتے ہوئے سانتوش کو خیال آیا ''اگر گمشدہ آدمی برفانی طوفان میں پھنس چکا، تو یقیناً اس کی جان خطرے میں ہے۔''

☆☆☆

پولیس نے تسلی تشفی دے کر گمین اور آدیان کو واپس بھیج دیا۔ اس دوران قصبے میں یہ خبر پھیل گئی کہ ایک امریکی سیاح ال ملشین پر لاپتا ہوگیا۔ تب ایک قصباتی ہوٹل کے مالک نے گمین کو پیش کش کی کہ وہ اس کے ہاں مفت قیام کرلے۔ گمین نے رضامندی ظاہر کی کیونکہ یوں وہ کھوجی جماعت سے رابطے میں رہتی۔

گمین پھر بیٹے کے ہمراہ خیمے پہنچی اور وہاں سے کچھ سامان لیے ہوٹل کے کمرے میں چلی آئی۔ ماں نے پوری کوشش کی کسی طرح آدیان کا دھیان بٹا سکے۔ انھوں نے مقامی کیفے میں عصرانہ کھایا۔ پھر گمین اسے کمپیوٹر گیمز کھلانے ایک مرکز لے گئی۔ شام ہوئی، تو گمین دوبارہ چند مددگاروں کے ساتھ خیمے گئی تاکہ بھاری سامان بھی لے آئے۔ اس نے پھر سین کے نام ایک نوٹ لکھ کر بتایا کہ وہ کہاں ہے اور اسے قریبی درخت سے چپکا واپس آگئی۔

رات گئے جب سین واپس نہ آیا تو گمین کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ بیٹے کے سامنے تو مضبوط بنی رہی، لیکن اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ خصوصاً وہ جب بھی آدیان کو دیکھتی، آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے اور نکل جانے کو بے تاب ہوجاتے۔ رات کو جب کھوجی جماعت تنہا واپس آئی، تو اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ میگن بتاتی ہے ''میں کوئی مذہبی عورت نہیں۔ لیکن اس رات میں رب کائنات کے حضور گھٹنوں کے بل جھک کر دیر تک یہی دعائیں مانگتی رہی کہ سین بحفاظت و عافیت گھر پلٹ آئے۔''

دوسری رات پہلی سے بھی زیادہ طویل اور اذیت ناک معلوم ہوئی۔ میگن کا کہنا ہے ''میں اس رات صحیح طرح نہیں سو سکی۔ بار بار میری نگاہوں کے سامنے یہ منظر آتا رہا کہ سین زخمی ہوکر زمین پر گرا پڑا ہے اور برف آہستہ آہستہ اسے زندہ دفن کر رہی ہے۔'' آخر ماں نے خوفزدہ اور متوحش بیٹے کو آغوش میں لیا اور سونے لیٹ گئی۔

☆☆☆

سین ایک صحت مند، خوداعتماد اور بہادر انسان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے گھسیٹ گھسیٹ کر ساری رات سفر جاری رکھا۔ بس جب نیند ستاتی، تو وہ کچھ عرصہ کھڑے ہو یا بیٹھ کر اونگھ لیتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اگر وہ ضرورت سے زیادہ برف پہ بیٹھا، تو اس کے اعضا میں خون جم سکتا تھا۔ خون جماؤ کی یہ حالت متعلقہ عضو کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔

رات کے کسی پہر راستہ آخر ایک گردآلود سڑک تک پہنچ کر ختم ہوگیا۔ سین کی ہمت بندھی اور وہ مزید تیزی سے بیساکھیاں چلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد لکڑیوں سے بنی ایک رکاوٹ سامنے آگئی۔ اس پر یہ بورڈ نصب تھا ''رک جائیے۔ آگے پل ٹوٹ چکا۔ یہ سڑک یہیں ختم ہوتی ہے۔''

بورڈ پڑھ کر سین کو دھچکا لگا اور وہ مایوسی کے عالم میں وہیں بیٹھ گیا۔ اب اچانک اس پہ شدید سردی نے حملہ کر دیا اور وہ کانپنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ مزید کچھ عرصہ بیٹھا، تو اس کا پورا جسم اکڑ جائے گا۔ چنانچہ وہ پوری جسمانی طاقت مجتمع کر کے دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔

آخر پروردگار عالم کو سین پر رحم آ گیا۔ اس سڑک کے نزدیک ہی ایک کیفے واقع تھا۔ یہ ایک بوڑھے جوڑے کی ملکیت تھا۔ بوڑھا جوڑا الگ تھلگ رہنے کا شائق تھا۔ بطور مشغلہ انھوں نے کیفے بھی کھول لیا جہاں اکا دکا سیاح آ جاتے۔ یہ کیفے درختوں کی اوٹ میں تھا اور پھر بوڑھا جوڑا جلد سونے کا عادی تھا۔ لیکن سین کی خوش قسمتی کہ اس رات ان کے مہمان آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ جیسے ہی کھڑا ہوا، کیفے کی کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی اسے نظر آ گئی۔ وہ مسرت سے نہال ہو کر اندھیرے سے روشنی کی سمت بڑھ گیا۔

سین نے دروازے پر دستک دی، تو اندر سے آنے والی آوازوں کا شور تھم گیا۔ پھر دروازے پہ ایک بوڑھا نمودار ہوا اور اسے ہسپانوی میں کچھ بولتے ہوئے اشاروں سے بتانے لگا کہ کیفے کا وقت ختم ہو چکا، اب اپنا راستہ ناپو۔ لیکن جب اس نے سین کی حالت زار اور پھر زخمی ٹانگ دیکھی، تو سمجھ گیا کہ یہ کوئی بھٹکا سیاح ہے۔ وہ پھر اسے اندر لے گیا اور اسے کافی پلائی۔

بوڑھی عورت کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی تھی۔ اس نے سین سے دریافت کیا ''کیا تم وہی امریکی ہو جو ال ملشین پر کھو گیا ہے؟ ہم نے ٹی۔وی پہ اس کی خبر سنی ہے۔''

سین مسکرانے کی سعی کرتے ہوئے بولا ''میرا خیال ہے، بلکہ یقین ہے کہ میں وہی امریکی ہوں۔''

☆☆☆

جیسے ہی فون کی گھنٹی بجی، میگن اور آدیان کے کمرے میں طویل عرصے سے چھائی خاموشی کافور ہو گئی۔ یہ پولیس افسر کا فون تھا۔ افسر نے میگن کو خوش خبری سنائی کہ اس کا خاوند مل گیا ہے۔ وہ خیر و عافیت سے ہے تاہم اسے چوٹیں آئی ہیں۔ لہٰذا اس کو غرناطہ کے اسپتال بھجوایا گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی ماں بیٹا خوشی کے مارے رقص کرتے کمرے سے باہر نکل آئے۔ وہ سبھی کو یہ فرحت بخش نوید سنانا چاہتے تھے کہ سین زندہ ہے۔ اس وقت رات کے ۱۱ بجے تھے۔

اگلی صبح وہ بھی غرناطہ پہنچ گئے۔ میگن نے بستر پر شوہر کو دیکھا تو بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ پھر ہچکیاں لے کر روتے ہوئے بولی ''ہمیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ تم مر چکے۔''

ماں بیٹے کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سین خاصا زخمی ہے۔ اس کا گھٹنا ہی زخمی نہیں ہوا، بلکہ ران کی ایک رگ بھی پھٹ گئی تھی۔ چنانچہ اس کے دو آپریشن ہوئے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اسے صحت یاب ہونے میں سات آٹھ ماہ لگ جائیں گے۔

۲ ہفتے بعد جب سین اسپتال سے رخصت ہوا، تو پورے خاندان نے مقامی ریستوران میں پیزا کھا کر اس کا جشن صحت منایا۔ وہ پھر امریکہ سدھارے اور معمول کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ۴ ماہ بعد سین کی حالت اچھی خاصی سنبھل گئی۔ لہٰذا سین نے فیصلہ کیا کہ اس بار وہ تنہا سپین جائے گا تاکہ ال ملشین کی چوٹی پر پہنچنے کا خواب پورا کر سکے۔

سین کی ٹانگ پوری طرح تندرست نہیں ہوئی تھی، لیکن اس نے چھوٹی دھاتی بیساکھی باندھ کر خود کو چلنے پھرنے کے قابل بنا لیا۔ وہ موسم بہار میں اسپین پہنچا اور تمام مشکلات کے باوجود چوٹی سر کرنے میں کامیاب رہا۔ وہ بتاتا ہے ''جب میں نے چوٹی پر کھڑے ہو کر بحیرۂ روم اور پرے واقع براعظم دیکھا تو یہ ایک یادگار نظارہ تھا۔ لیکن تبھی مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ بظاہر جس پہاڑ پر چڑھنا آسان ہو، وہ کبھی کبھی نہایت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

اس کی بیگم میگن کہتی ہے ''دراصل میرے شوہر کو مستقل مزاجی، دلیری اور ہمت نے موت کے منہ میں جانے سے بچایا۔ اگر وہ ہمت ہار دیتے اور زخمی ٹانگ کے ساتھ سفر جاری نہ رکھتے، تو شاید ہمیں نہایت خوفناک خبر سننی پڑتی۔ لیکن جب بھی ان کے بارے میں سوچوں، مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم خوش قسمت تھے۔ گو سین اور ہم بڑے کٹھن حالات سے گزرے، لیکن آخر میں خوشگوار انجام ہی سے ہمارا پالا پڑا۔''

www.Paksociety.com

طنز و مزاح

ڈپٹی صاحب کی پالیسی

ایک پولیس افسر کے شوخ قلم سے اندرون خانہ راز افشا کرنے والا پُر اثر شہ پارہ

ذوالفقار احمد چیمہ

چند سال پہلے جس ضلع میں میری تعیناتی ہوئی، اس کے ہمسایہ ضلع سے بڑی دلچسپ خبریں آتی۔ اس ضلع سے کئی دانش مند حضرات ملنے آتے تو کہا کرتے کہ اب اس کا نام رشوت نگر رکھ دینا چاہیے کیونکہ ہر سرکاری اور غیر سرکاری دفتر میں رشوت کا راج ہے۔ دونوں اہم ترین محکموں یعنی پولیس اور محکمہ مال کے سربراہ ڈی۔ایس۔پی اور ڈی۔ڈی۔او۔آر۔ عوامی خدمت کے بجائے رشوت خوری اور لوٹ مار میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے اور اس میدان میں ایک دوسرے کو مات دینے میں کوشاں رہتے۔

ڈی۔ایس۔پی، ڈی۔ڈی۔او۔آر کو کرپشن کا بحرالکاہل اور وہ ڈی۔ایس۔پی کو رشوت کا کوہ ہمالیہ قرار دیتا۔ عوامی حلقوں میں ہر دو افسران اپنی "اوصاف حمیدہ" کے باعث یکساں بدنام تھے۔ یہ کہانی تو سب کو معلوم تھی کہ اپنے کرتوتوں کے باعث جب بھی دونوں افسروں میں سے کسی کا تبادلہ ہوتا تو ان کے با اثر کفیل (اسمبلیوں کے معزز رکن) حرکت میں آجاتے اور اوپر جا کر یہ "اصل حقائق" بتاتے "افسر موصوف ہمارے ساتھ بہت تعاون کر رہا ہے۔ اسی لیے ہمارے مخالفین اس کے خلاف ہیں اور ایک دو صحافیوں کو پیسے دے کر خواہ مخواہ اس کے خلاف خبریں لگوا رہے ہیں۔" اس "وزنی دلیل" کے بعد تبادلہ منسوخ ہو جاتا۔ ڈی۔ایس۔پی کو عام لوگ ڈپٹی اور اس کے ماتحت کو ڈپٹی صاحب کے نام سے یاد کرتے۔ لیکن ایک بار جب ڈپٹی صاحب کے گناہوں اور لوگوں کی آہوں نے عوامی جذبات میں آگ لگا دی (جس سے ایک تھانہ بھی جل گیا) تو موصوف کا تبادلہ کر دیا گیا۔ "کفیل" ان دنوں دبئی گیا ہوا تھا، اس لیے تبادلہ نہ رک سکا۔ اس کی واپسی پر ڈپٹی صاحب نے اس سے بالمشافہ ملاقات کی، اپنی علانیہ اور خفیہ خدمات گنوائیں جس پر کفیل

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

نے اوپر بات کر کے ڈپٹی صاحب کی نئی تحصیل میں تعیناتی کرا دی۔

نئے دفتر میں ڈپٹی ایک روز ملاقاتیوں سے گپ شپ کے دوران سابقہ تحصیل سے اپنے تبادلے کو ملکی سلامتی کے خلاف سازش اور موجودہ تعیناتی کو حکومت کا صحیح اور بروقت اقدام قرار دیتے ہوئے کہنے لگا ''اگر حاسدین مجھے ایک جگہ سے تبدیل کروائیں تو حکومت ''میرٹ'' پر مجھے دوسری جگہ لگا دیتی ہے۔ یعنی ایک جگہ ڈوبتا ہوں تو سورج کی طرح دوسری جگہ اُبھر آتا ہوں۔ کچھ ایسے ہی موقع کے لیے ڈاکٹر اقبال صاحب فرماتے ہیں کہ ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے۔''

حاضرین میں مقامی کالج کے اُردو کے اُستاد بزمی صاحب بھی موجود تھے۔ وہ ۳ ماہ قبل اپنے گھر ہونے والی چوری کا پرچہ درج کروانے نئی درخواست لیے نئے افسر سے ملنے آئے تھے۔ کہنے لگے ''حضور! علامہ اقبال نے تو یہ شعر اہلِ ایمان کے بارے میں کہا تھا۔''

ڈپٹی صاحب غصے سے بولے ''دیکھو مسٹر! انچارج بزمِ ادب! تم کوئی ڈاکٹر صاحب کے کمپوڈر لگے ہوئے تھے کہ تمھیں وہ دل کی ساری باتیں بتا دیتے، آپ لوگوں میں دوسروں پر شک کرنے کی بہت بُری عادت ہے۔ دیکھو اگر ترقی کرنی ہے تو اس عادت پر قابو پائیں اور افسروں سے تعاون کیا کریں۔'' بزمی صاحب سہم کر خاموش ہوگئے۔

مختلف آسامیوں سے ''ماہانہ'' اکٹھے کرنے کے لیے ڈپٹی صاحب کا بڑا منظم نظام تھا۔ ایک ''کلیکٹر'' دوسروں کے فرائض اور سرگرمیوں سے بےخبر ہوتا۔ تھانے داروں سے ماہانے اور نذرانے اکٹھے کرنے کی ذمے داری ریڈر کرم دین کے سپرد تھی، جسے وہ چھڑی اور گاجر کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے بڑے مؤثر طریقے سے نبھا رہا تھا۔ صاحب کے گھریلو اخراجات اور ثقافتی ضروریات کے علاوہ متعلقہ تھانے میں جرائم کی شرح تو پیش نظر رکھتے ہوئے کرم دین ماہانے کی رقم میں ترمیم و اضافہ کرتا رہتا مگر وہ تھانے داروں کو یہ تاکید کرنا کبھی نہ بھولتا ''دیکھو ادائی میں تاخیر صاحب کو سخت ناپسند ہے۔ وہ تاخیری حربے کو تخریبی کارروائی سے کم نہیں سمجھتے۔''

ماہِ رمضان کے پہلے روز جمعۃ المبارک تھا۔ کرم دین محلے کی جامع مسجد میں رمضان کی فضیلت اور گناہوں سے مغفرت کے متعلق مولانا صاحب کی تقریر سن کر بڑا متاثر ہوا۔ دوسرے ہی روز وہ صبح ہی صبح ڈپٹی صاحب کے کمرے میں گیا اور بولا ''سر جی! رمضان کا مقدس مہینا شروع ہوگیا ہے۔ مولانا صاحب کی تقریر سن کر ڈر سا آنے لگا ہے۔ سر جی! رمضان میں جناب کی پالیسی کیا ہوگی؟''

''کیا مطلب؟'' ڈپٹی نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جناب! میں ''منتھلی'' وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس مہینے میں ناغہ ہوگا یا جناب پالیسی کے بارے میں بعد میں بتائیں گے؟''

ڈپٹی ذرا پریشان سا ہوا مگر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا ''دیکھو کرم دین، مولوی شریف آدمی ہے۔ ہم عید شب برأت پر اس کی مدد بھی کرتے ہیں مگر پولیس اور امن و امان کے مسائل بڑے پیچیدہ جبکہ نکاح اور جنازے کے مسئلے بہت سادہ ہیں۔ مولوی صاحب کا شعبہ بڑا محدود ہے اور امن و امان کا دائرہ کار بڑا وسیع اور کٹھن جس کی مشکلات کا اندازہ مولوی صاحب کو نہیں ہوسکتا۔ یہ اس کا کام نہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ دل کا اپنا کام ہے، گردے کا اپنا۔ تم نے پالیسی کے متعلق پوچھا ہے تو یاد رکھو! کسی بھی محکمے کی ترقی کے لیے پالیسیوں کا تسلسل بہت ضروری ہے۔ تسلسل ٹوٹنے سے ادارے ٹوٹ جاتے اور ناغے تو محکمے کے لیے زہر قاتل ہوتے ہیں۔ سمجھ گئے نا؟''

کرم دین نے پھر رمضان کا لفظ منہ سے نکالا تو جواب ملا ''دیکھو اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ اس بار حج کا بھی ارادہ ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ آر پچھلے سال حج کر آیا، اب محفلوں میں ہم پر طنز کرتا ہے۔ اس لیے ہمارا جانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ تسلسل کسی صورت نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ لہٰذا سابقہ

www.paksociety.com

پالیسی جاری رکھوا جاؤ شاباش محنت کرو بلکہ رمضان میں اور محنت کرو اور حج کے انتظامات بھی شروع کر دو۔"

ڈپٹی صاحب نے حج کا قصد کیا تو کرم دین کو ہدایات جاری کر دی گئیں۔ اس نے مالی معاملات سنبھالنے کے لیے "کنسورشیم" کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ شرکاء میں کچھ بڑے تھانوں کے انچارج، کچھ مالدار پارٹیاں (جن کے کیس ابھی زیر تفتیش تھے) اور کچھ معطل تھانیدار، جن کی انکوائریاں ڈپٹی صاحب کے پاس تھیں، شامل تھے۔ اب ذمے داریاں تقسیم ہو گئیں۔ ڈپٹی اور بیگم ڈپٹی کے لیے بزنس کلاس کے ٹکٹ لینے کی ذمے داری ایس ایچ او صاحبان کو ملی۔ حرم شریف کے قریب پانچ ستارہ (فائیو سٹار) ہوٹل میں قیام و طعام، دھوکا دہی میں ملوث ایک پراپرٹی ڈیلر نے اپنے ذمے لے لیا۔ زیارات کے لیے ٹرانسپورٹ کے انتظام کی ذمے داری ایک بڑے قبضہ گروپ کے ملزمان کے سپرد کر دی گئی۔

بوقت روانگی ہوائی اڈے پر تھانیداروں اور ملزمان و مشتبہ گان کا ہجوم ہار لیے کھڑا تھا۔ ڈپٹی و بیگم ڈپٹی کو ہاروں سے لاد کر رخصت کیا گیا۔ سعودی عرب میں بھی ان کے پہنچنے کی اطلاع بھجوا دی گئی تھی لہٰذا کچھ لوگ وہاں بھی گاڑیاں لے کر ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ ہر روز صاحب اور بیگم صاحب کو سیر کرانے لے جاتے۔ میزبان روحانی نظاروں کا ذکر کرتے اور مہمان بازاروں اور سناروں کی بابت پوچھتے۔ دونوں مقدس شہروں میں ان کی توجہ زیارات کی نسبت زیورات پر زیادہ مرکوز رہی۔

حج کے مراحل طے کرنے کے بعد الوداعی ملاقاتیں ہوئیں۔ میزبانوں اور مہربانوں نے حسب روایت کھجوروں کے پیکٹ اور آب زم زم کے ڈبے ساتھ لے جانے کے لیے پیش کیے مگر حاجی اور حاجن دونوں غیر مطمئن نظر آئے۔ بالآخر پیمانہ ہوس چھلک اٹھا اور ڈپٹی صاحب بول پڑے "دیکھیے، واپسی پر دوست اور رشتے دار مبارک باد دینے آئیں گے۔ مجھے اپنی حیثیت کے مطابق تحفے بھی دینے ہوں گے۔ صرف پانی کی بوتلوں سے تو انہیں مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔"

ڈپٹی صاحب نے پھر عالمانہ رنگ میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ بال جبرائیل نکال کر پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب ایک دوست حج کے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب کے لیے بطور تحفہ صرف آب زم زم کی بوتلیں لے گیا تو ان جیسی شخصیت نے بھی برا منایا۔ ناراض ہو کر شعر لکھا کہ کیا حرم کا تحفہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں؟ کیا خوبصورت شعر اور آج کے موقع محل کے بھی مطابق ہے۔"

میزبان سمجھ دار تھے اور مالدار بھی۔ شعر کی ڈپٹیانہ تشریح کے فوراً بعد بڑے بازاروں اور مہنگے سناروں کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب وہاں سے خریدے گئے ڈبوں اور پیکٹوں کی ادائی ہوئی، تب جا کر ڈپٹی صاحب کے حج کی ادائی مکمل ہوئی۔ واپسی کے بارے میں کرم دین کو پھر ہدایات جاری کی گئیں۔ اس نے وضاحت چاہتے ہوئے فون پر پوچھا "جناب! ایک ایک ہار فی تھانیدار کافی ہوگا؟ نیز یہ بھی فرما دیں کہ ہار پھولوں کے ہوں یا نوٹوں کے؟"

فون پر ڈپٹی نے جھڑکتے ہوئے کہا "دیکھو کرم دین! بے وقوفوں والی بات نہ کرو۔ ہم کوئی جیل سے چھوٹ کر نہیں آ رہے جو گلے میں پھول ڈال دو گے۔ ۲، ۳ دن میں مرجھا جانے والے ہار پہنانا حاجیوں کی ہی نہیں، حج کی بھی توہین ہے۔"

فون کٹ گیا مگر ایک منٹ بعد کرم دین کے فون پر پھر گھنٹی بجی۔ سعودی عرب سے کال تھی۔ تاکیداً یاد دہانی کرائی گئی "کرم دین یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ اب ۵ ہزار والے نوٹ بھی آ چکے۔ وہ مضبوط اور کڑک دار ہوتے ہیں، اس لیے ہار ان سے زیادہ اچھے بنتے ہیں۔"

کرم دین نے کہا "تعمیل ہوگی جناب۔"

"اور بعد از حج پالیسی کے بارے میں بھی کچھ پوچھنا ہے؟"

"میں سمجھ گیا جناب، سابقہ پالیسی جاری رہے گی۔"

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

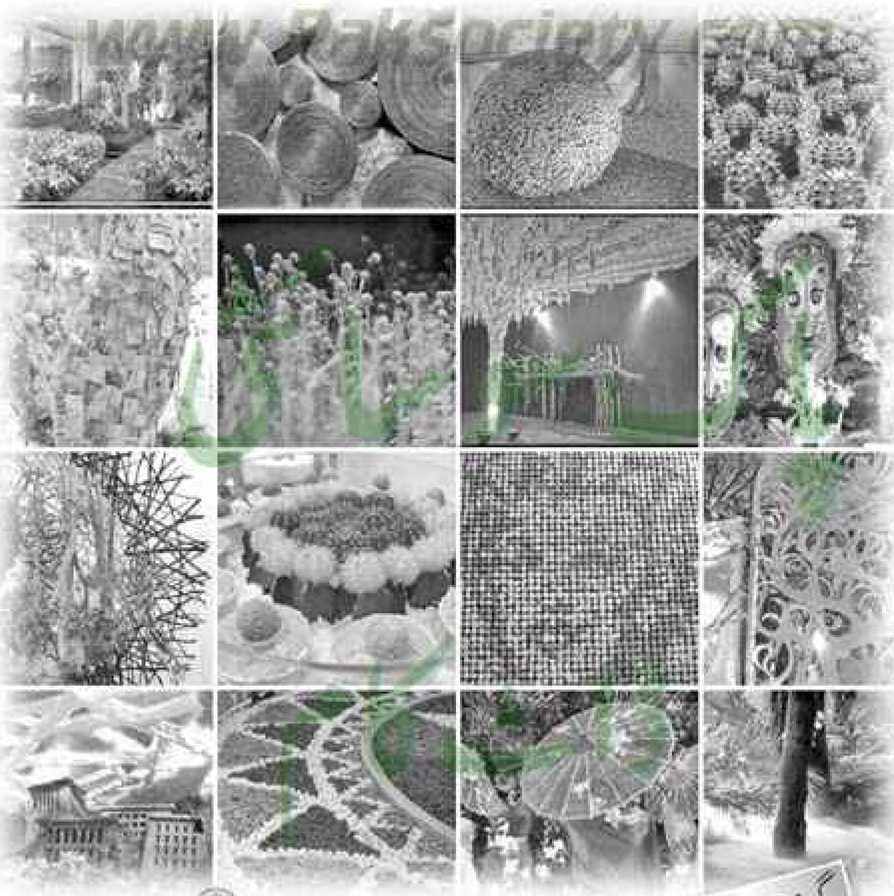

گوشۂ حیرت

مرزا ظفر بیگ، عبدالقادر حسن، ڈاکٹر خالد آفتاب

www.paksociety.com

دیس بدیس کی رعنائیاں

مختلف ممالک میں جنم لینے والے دلچسپ و عجیب واقعات
جو اپنے اندر حیرت، خوب صورتی اور جاذبیت سموئے ہوئے ہیں

www.paksociety.com

مرتب: آسمی فاطمہ

سونگ کران: پانی پھینکنے کا منفرد تہوار

www.paksociety.com

سنسکرت میں سونگ کران کے لفظی معنی ''فلکیاتی راستہ'' ہیں۔ تھائی لینڈ میں نئے سال کا یہ تہوار ہر سال اپریل کی ۱۳ر سے ۱۵ر تاریخ تک منایا جاتا ہے۔ جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں نئے سال کے متعدد کیلنڈر رائج ہیں، سونگ کران کی ان کے ساتھ اتفاقی وابستگی ہے۔ اس تہوار کی اصل تاریخ مقامی فلکیاتی حساب کے اعتبار سے رکھی جاتی تھی لیکن اب اس کی تاریخ شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے مقرر کر دی گئی۔ تھائی لینڈ میں سونگ کران کا تہوار سال کے گرم ترین دنوں اور خشک موسم کے آخر میں آتا ہے۔

سونگ کران کے بارے میں خیال ہے کہ یہ ہندوستان کے قدیم تہوار ہولی سے لیا گیا ہے جس میں لوگ ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں۔ لیکن تھائی لینڈ والوں نے اپنے تہوار میں رنگوں کی جگہ پانی کو دے دی۔ اس تہوار کو خطے میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اب نہ صرف یہ قومی سطح پر منایا جاتا ہے، بلکہ تھائی لینڈ کے آس پاس کے ملکوں میں بھی رواج پا گیا۔ تاہم، سونگ کران کی اصل تقریبات اب بھی تھائی لینڈ کے شمالی شہر چیانگ مائی (Chiang Mai) میں منائی جاتی ہیں جہاں یہ ۶ر روز بلکہ زیادہ دن تک جاری رہتی ہیں۔ یہ تہوار اب غیر ملکیوں، سیاحوں کو بھی اپنی جانب راغب کر چکا، جو بڑی دلچسپی سے اسے دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے آتے ہیں۔

سونگ کران کی سب سے اہم اور نمایاں تقریب کا مرکز محور پانی ہے۔ تہوار منانے والے ایک دوسرے پر خوب پانی پھینکتے اور ایک دوسرے کو مکمل طور پر بھگو دیتے ہیں۔ اس موقع پر تھائی لوگ گلیوں اور سڑکوں پر پانی کے ڈبے اور پانی کے پستول (واٹر گنز) لیے گھومتے ہیں۔ دن کے آغاز سے ہی بڑے، بوڑھے، جوان اور بچے سڑکوں

کے دونوں طرف پانی کے ''ہتھیاروں'' کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی پیدل چلنے والے یا گاڑیوں میں سوار لوگوں کو گزرتے دیکھیں تو ان پر پانی کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ یہ منظر بڑا پر لطف ہوتا ہے، بھگوئے جانے پر

www.paksociety.com

نہ تو کوئی برا مانتا اور نہ کوئی جھگڑا کرتا ہے بلکہ سب ایک دوسرے کو بھیگا کر خوش دلی سے ہاتھ ہلا دیتے ہیں۔

قدیم تھائی روایات کے مطابق پانی ایک پاک چیز ہے جو ہر گندگی، غلاظت اور گناہ دھو ڈالتا ہے۔ گویا سب ایک دوسرے کو پاک و صاف کرنے کے عمل میں اجتماعی طور پر شریک ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ پانی کا اس انداز سے چھڑکاؤ ہمیشہ سے تہوار کی نمایاں سرگرمی نہیں رہی۔ یہ روایتی طور پر ایک ایسا تہوار تھا جس میں بزرگوں اور بڑوں کی خدمت میں حاضری بنیادی وصف تھا۔

زمانہ قدیم میں تمام چھوٹے اپنے بڑوں کی خدمت میں پورے ادب و احترام سے حاضری دیتے اور انھیں تعظیم پیش کرتے۔ ان میں گھر کے ارکان، دوست اور پڑوسی سب شامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہم اسے بزرگوں کے احترام کا تہوار کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بعد ازاں اس تہوار میں پانی کی شمولیت کے باعث بزرگوں کے لیے مسائل پیدا ہوگئے، کیونکہ عموماً یہ لوگ پانی کی بوچھاڑ سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس سے پریشان ہوجاتے ہیں۔

سونگ کران منانے والے پہلے تو ایک دوسرے پر پانی پھینک کر ہلا گلا کرتے ہیں۔ اس کے بعد نسبتاً سنجیدہ تقریب شروع ہوتی ہے جس میں سبھی افراد پورے ادب و احترام کے ساتھ بدھ مذہب کی خانقاہوں یعنی واٹ (WAT) میں حاضری دیتے ہیں۔ وہاں یہ عبادت کرتے اور پورے خلوص کے ساتھ بھکشوؤں کو کھانا وغیرہ بھی کھلاتے ہیں۔ اس طرح یہ تارک الدنیا بھکشوؤں کی دعائیں لیتے ہیں۔

تھائی لوگ عام برکت اور خوش حالی کے لیے اپنے گھروں میں گوتم بدھ کی تصویریں اور مجسمے رکھتے ہیں۔ تہوار کے دن تصویروں اور مجسموں کو بڑی عقیدت اور پورے احترام کے ساتھ دھویا اور صاف کیا جاتا اور ان پر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ تھائی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ گوتم بدھ کے مجسموں اور تصویروں کی صفائی سے انھیں برکت ملتی ہے۔ تب نیا سال خوش قسمتی کے دروازے کھول سکتا ہے جس کے بعد ان کی زندگیوں میں خوش حالی آ جائے گی۔

یہ پانی کا تہوار کیسے بنا؟ اس کے پس پردہ کہانی یہ ہے کہ جب لوگ گوتم بدھ کے مجسموں کو خانقاہوں میں غسل دیتے تو گرنے والے پانی کو تبرک کے طور پر اپنے جسم، چہرے اور ہاتھوں پر ملتے اور دوسروں پر بھی ڈالتے۔ اس پانی کے حصول کے لیے ہونے والی چھینا جھپٹی نے اب یہ شکل اختیار کرلی ہے۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ آج کل یہ تقریب کسی مذہبی اور روحانی تقریب کے بجائے پانی پھینکنے کا تہوار بن کر رہ گیا ہے۔ اس میں وہ روح باقی نہیں رہی جس کے تحت لوگ مقدس پانی سے نہ صرف اپنی ظاہری صفائی کرتے بلکہ خود کو باطنی آلودگی سے بھی پاک کرلیتے۔ مذہبی کے بجائے اب یہ تفریحی تہوار ہے۔

(★)

ڈی سی، ایس پی، سیشن جج اور سول سرجن

برطانوی دور کے یہ چار ستون تھے جن پر تاج برطانیہ فخر کرتا اور قائم تھا۔ کسی بھی ضلع میں یہ چار افسر سرکاری اور عوامی مفادات، دونوں کی حفاظت کرتے۔ عام آدمی کو عموماً انصاف ملتا کیونکہ کوئی بھی افسر کسی مقامی معتبر شخص کا رشتہ دار نہیں ہوا کرتا تھا۔ برطانوی قانون ہی اس کا رشتے دار اور راہنما تھا۔

ڈپٹی کمشنر جسے ڈی۔ سی یا دیسی زبان میں صاحب ضلع کہا جاتا تھا، ضلعی بادشاہ ہوتا۔ وہ ضلع کے ہر محکمے کا سربراہ تھا۔ ڈی۔ سی ضلع کا وہ واحد افسر تھا جو معمولی شخص کی بات سنتا۔ اس کا دفتر اور عدالت سب کے لیے کھلی رہتی تھی اور یہ غریب نواز افسر اصولی طور پر خاص افراد نہیں عوام کا صاحب ضلع ہوتا۔ وہ مکمل با اختیار ہوتا جو

www.paksociety.com

داور سی کر سکتا تھا۔

دوسرا افسر ایس۔ پی یعنی پولیس کپتان تھا۔ یہ افسر تھانیداروں کے ذریعے ضلع بھر میں قانون کی عملداری اور امن و امان کا ضامن ہوتا۔ ایک زمانہ تھا جب قتل کی واردات کی تفتیش کے لیے ایس۔ پی خود لازماً جاتا تھا۔ کسی تھانے دار کی مجال نہیں تھی کہ وہ ایس۔ پی کے رعب سے بے نیاز ہو جائے۔ ایس۔ پی تو اس حد تک قانون کی عملداری کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ مشہور ہے، ایک ایس۔ پی کے پاس ہمیشہ ایک آری ہوتی۔ راستے میں جہاں اسے کوئی تانگہ زیادہ سواریاں بٹھائے دکھائی دیتا، وہ اسے روک کر اس کے بمبو آری سے کاٹ دیتا۔ کوچوان کے لیے یہ سزا بہت کافی تھی اور یوں بے زبان گھوڑے کی بھی داد رسی ہو جاتی۔ پولیس کپتان تاجِ برطانیہ کی وفاداری میں مسلسل سرگرم رہتے اور فی الواقع جان کی پروا نہیں کرتے تھے۔

کسی سرکاری ملازم کی درست شکایت اس کے لیے خوف کا باعث نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی بارسوخ شخص کسی ڈی۔ سی یا ایس۔ پی کے پاس کوئی شکایت یا کسی رعایت کے لیے جاتا تو اسے متعلقہ افسر کو قائل کرنا پڑتا یا پھر خود قائل ہونا پڑتا۔ کسی کی معتبر اور بارسوخ حیثیت کا احترام ضرور کیا جاتا مگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جاتا۔

ان دو انتظامی افسروں کے بعد عدلیہ تھی۔

ضلع کا سیشن جج انصاف کا پہاڑ بن کر عدالت میں بیٹھتا جو عموماً انگریز ہوتا۔ ضلع کے دورے کرتا اور لوگوں کی سہولت کے لیے ڈاک بنگلوں میں عدالت لگاتا۔ بعض اوقات سیشن جج بھیس بدل کر جائے واردات پر بھی پہنچ جاتے تاکہ مقدمے کی حقیقت معلوم کر سکیں۔

ہندوستان میں جدید طبی سہولتیں نہیں تھیں، اس لیے ہر ضلع کا انگریز سول سرجن ڈاکٹری طبی سہولتیں فراہم کرتا۔ مختصر یہ کہ برطانوی ہند میں یہ چار افسر ہر ضلع میں حکومت کی نمائندگی کرتے۔

(★)

بچے ہمارے عہد کے

ماسٹر صاحب کا اسکول میں پہلا دن تھا۔ انھوں نے بچوں کو ڈراتے ہوئے کہا ”اگر کسی نے ہوم ورک نہیں کیا تو میں اس کے والدین کو سکول بلاؤں گا۔ اگر کسی نے کلاس میں شور مچایا تو میں اس کی چھٹی بند کر دوں گا اور اگر کوئی ٹیسٹ میں فیل ہو گیا تو میں اسے ۲ دن تک کلاس میں بیٹھنے نہیں دوں گا۔“

ایک بچے نے پوچھا ”ماسٹر صاحب! مستقل طور پہ اسکول سے نکالے جانے کا جرم کیا ہوگا؟“

(بلال ایوب، فیصل آباد)

نوروز کا تہوار

دُنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہو جس میں کوئی جشن یا تہوار نہ منایا جاتا ہو۔ ہمارا برادر ملک، اسلامی جمہوریہ ایران، بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ وہاں بھی مختلف النوع جشن منائے جاتے ہیں۔ ان جشنوں میں ایک اہم جشن نوروز یا عیدِ نوروز ہے۔ ایران کے اسلامی انقلاب سے پہلے تو ایران میں عیدِ نوروز کو عیدین سے بھی زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ انقلابِ اسلامی کے بعد

www.paksociety.com

وہ ۳۳ ہزار فٹ بلندی سے گر کر بھی زندہ رہی

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق ایک سرب لڑکی ویسنا وولویک (Vensa Vulovic) نے پیراشوٹ کے بغیر سب سے زیادہ بلندی ۱۰،۱۶۰ ر میٹر (۳۳،۳۳۳ ر فٹ) سے گر کر زندہ بچ جانے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ وہ ایک پرواز میں اپنے فرائض ادا کر رہی تھی۔ طیارہ میں نصب بم پھٹنے سے تمام ۲۸ ر مسافر اور جہاز کا عملہ ہلاک ہو گیا۔ تاہم وہ نیچے گرنے کی وجہ سے بچ گئی اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور کمر کا نچلا حصہ بھی مفلوج اور بے حس ہو گیا۔ ۲۷ ر روز تک وہ سکتے میں رہی۔ اس کی صحت یابی میں ۱۷ ر ماہ لگے۔ اس کے بعد لڑکی نے مزید ۲۰ ر سال تک یوگوسلاویہ کے فضائی ادارے میں خدمات انجام دیں۔

عیدین کو اگرچہ بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی لیکن عید نوروز کی روایت بدستور استوار ہے۔

نوروز سے مراد ہے ایرانی تقویم یا سال خورشیدی (سال شمسی) یا موسم بہار کا پہلا دن۔ عید نوروز ایران میں ہزاروں سال سے منائی جا رہی ہے۔ نوروز (۲۱ ر مارچ) کی آمد سے پہلے ہی تمام ایرانی، امیر ہوں یا غریب اور دنیا میں کہیں بھی ہوں، اپنی بساط سے بڑھ کر اس قومی جشن کو شایان شان طریقے سے منانے کی تیاریوں میں لگ جاتے ہیں۔

نوروز وہ دن ہے جب دنیا کو نئی زندگی ملتی ہے اور سارا زمانہ (اور اس میں جو کچھ بھی ہے) نیا روپ دھار لیتا ہے۔ سال نو کا آغاز ہوتے ہی دنیا کی تمام موجودات میں نئی روح دوڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں نئے سال کے پہلے دن کو نوروز کہتے ہیں۔ وہ اس روز سے لے کر ۱۳ ر روز تک جشن بہار مناتے اور ۱۴ ویں روز سے تازہ دم ہو کر پورے جوش و خروش سے کاروبار حیات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ماضی میں عید نوروز کے دن تمام ایرانی صبح سویرے اٹھتے، غسل کرتے، تین بار شہد چاٹتے، پورے گھر میں ہرن کی دھونی دیتے، عزیزوں اور رشتے داروں سے ملاتے اور قریبی آتش کدے جاتے۔ ساسانی دور میں جو کہ اسلامی دور سے پہلے ایرانی تاریخ کا آخری دور تھا، ایران کے قومی جشنوں میں یہ خاص اہمیت و حیثیت کا حامل تھا۔ اس دور کے ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ یہ وہ روز ہے جب اہورامزدا (خدائے خدایگان) نے دنیا کو پیدا کیا، جب ایرانی بادشاہ جمشید نے بدی کی قوتوں پر فتح پائی اور اس کو دیوتاؤں نے آسمان کی سیر کرائی۔ اس دور میں ایرانی عوام اور شاہی دربار میں عید نوروز بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی۔ پہلوی دور میں بھی جشن نوروز گزشتہ ادوار کی نسبت بدرجہا زیادہ شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا رہا۔

(ح)

ایک بڑا سیارچہ زمین کے قریب

۴۰۰ ر میٹر چوڑا سیارچہ نومبر (۲۰۱۱ء) کے آخری عشرے میں زمین کے قریب سے گزرا۔ یہ فاصلہ زمین اور چاند کے درمیانی فاصلے سے بھی کم تھا۔ جب زمین سے اس کا فاصلہ ۳ لاکھ ۲۵ ہزار کلومیٹر تھا۔ اگرچہ انسانی آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر تھی تاہم یہ پچھلے ۲۰۰ ر سال میں زمین کے اتنے قریب سے گزرنے والا پہلا سیارچہ ہے۔

نئی سوچ — نیا نقطۂ نگاہ

مغربی ممالک اور تہذیب و تمدن پر اندھا دھند تنقید کرنے والوں کے لیے سوال اٹھاتی اور جواب دیتی زوردار تحریر

کیا مغرب کو برا بھلا کہنے کی روایت بدلنے کا وقت آچکا؟

مغرب.... اب بدل رہا ہے

ہم ہمیشہ مغرب کے منفی پہلوؤں کے متعلق بات کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مغربی ممالک ترقی کے جس مقام پر ہیں، اس کے پیچھے صدیوں کی محنت، حکمت عملی، جدوجہد پیہم اور دوراندیشی کارفرما ہے۔ مغرب ہم سے ٹیکنالوجی و عمل ہی نہیں بلکہ کردار و اخلاقیات میں بھی بہت آگے ہے۔ مجھے ذاتی طور پر مغرب میں رہنے اور کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ مغربی عوام کے متعلق ہمارے ملک میں جو رائے قائم ہے، وہ پرانی (Outdated) ہوچکی۔ یہ رائے اس تجربے کی بنیاد پر قائم کی گئی جو ہمارے بزرگوں کو دورِ غلامی میں حاصل ہوا تھا۔ لیکن مغرب پچھلی نصف صدی میں دوسرے ملکوں پر کیے گئے قبضے چھوڑ کر اپنا محور و مرکز بدل چکا۔ وہ اب بھی طاقت کا مرکز ہے مگر مغرب نے گزشتہ چند دہائیوں میں علمی و عملی کاوشوں کی بدولت کئی صدیوں کا فاصلہ طے کرلیا ہے۔

موضوع آگے بڑھانے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ طے کرلیا جائے کہ مغربی ممالک سے کیا مراد ہے؟ مغربی ممالک سے مراد عموماً وہ ملک ہیں جن کے مقامی آبادکار، سفید فام باشندے ہیں۔ سفید فام اقوام نے پچھلی تین صدیوں میں علم و عمل میں دوسری اقوام پر برتری حاصل کرلی ہے۔ ان اقوام نے نئے براعظم دریافت کیے، مقامی آبادکاروں کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیچھے دھکیل دیا اور ان کی زمینوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ یہی حربے انھوں نے باقی دنیا پر بھی آزمائے اور پوری دنیا پر قبضہ جما لیا۔ ان کا سب سے بڑا حریف ترک عثمانی سلطنت تھی جس کا راج عرب پر قائم تھا۔ ترک آئے دن یورپ پر چڑھائی کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سفید فام اقوام نے اپنی ایجادات، سازشوں اور ذہانت سے فائدہ اٹھا کر سلطنت عثمانیہ کا چراغ گل کردیا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زوال کے اس سفر میں ترکوں کا اپنا ہاتھ زیادہ تھا۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ معاشرہ کفر پر رہ سکتا ہے لیکن اس میں عدل و انصاف ناپید ہوجائے، تو وہ باقی نہیں رہتا۔ اس قول کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ میں سفید فام ممالک کی نسبت لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانی عام تھی۔ ترکوں نے تو آبادیت کی بھلائی کی طرف قطعاً توجہ نہیں کی بلکہ ان کے مظالم کی داستانیں آج بھی عربوں کی زبانوں پر ہیں۔ اسی سے بغاوت کی خاطر عربوں نے ایک غیر مسلم لارنس آف عریبیہ کی سرپرستی قبول کرلی۔ ترکوں کی نسبت مغربی ممالک نے لوٹی ہوئی دولت اپنے ممالک و اقوام کی ترقی کے لیے استعمال کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وہ دور ہے جب سائنس کے ساتھ ساتھ فلسفہ، آرٹ، ڈراما، موسیقی غرض ہر شعبے میں مغرب نے تیزی سے ترقی کی۔ اس دور میں یورپی ممالک میں علم میں آگے نکلنے کے لیے ایک مسابقت جاری تھی۔ جرمن قوم غیر معمولی طور پر اپنی ذہانت کا پرچم مبالغے کی حد تک بلند کیے ہوئے تھی۔ اگر ہٹلر انہیں خوابوں کی جنت کی سیر نہ کرواتا تو بلاشبہ وہ سپر پاور کا درجہ حاصل کرلیتے۔

جنگ عظیم اول و دوم کے دور میں ہی مغربی ممالک میں انسانی حقوق پانے کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ خواتین نے بہتر زندگی کے لیے کوشش شروع کردی۔ نوآبادیاتی ممالک میں بھی اصلاحات متعارف کروائی گئیں۔ ہندوستان میں انگریزوں نے ہی سب سے پہلے ستی جیسی کریہہ رسم کا خاتمہ کیا۔ مغل حکمران حتی الامکان ہندوؤں کی ناراضی مول لینے سے بچتے رہے تھے۔ سفید فام افراد نے مقامی ہندوستانی آبادی کو نقصانات پہنچائے مگر فائدے بھی بہت دیے۔ بہرحال تاریخ کا فیصلہ درست سمجھنا چاہیے کہ وہ کیسے حکمران تھے کیونکہ یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔

ذہنی کشادگی

میں نے انگلستان میں جتنا بھی وقت گزارا، اس نے مجھ پر ان اقوام کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ذہنی کشادگی ان اقوام کا خاصہ ہے۔ جہاں تک ممکن

ہو، وہ قانون کی بالادستی قائم رکھتے ہیں اور اس کا بہترین ثبوت ان کی سیاسی، سماجی اور زندگی میں قانون کی عمل داری ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی قوم کے مہذب ہونے کا پیمانہ ان کی ٹریفک ہے۔ ہر موٹر چلانے والا دوسروں کے حقوق کا خیال کرتا ہے۔ مسکرا کر راستہ دینا، لال بتی پر رکنا اور رفتار کو قابو میں رکھنا تو عام بات ہے۔

ان کے مقابلے میں پاکستان تو کیا مشرق بعید جیسے دولت مند ممالک کی ٹریفک بھی بدتر ہے۔ آہستہ آہستہ مغربی اقوام کو احساس ہو چلا ہے کہ معدنی وسائل کا بے تحاشا استعمال نہ صرف انہیں جلد نیست و نابود کر دے گا بلکہ ماحولیاتی آلودگی ہماری زمین کو بھی بنجر بنا دے گی۔ چنانچہ وہاں ایک عام شہری بھی اپنی ذمے داری سمجھتے ہوئے کوشش کرتا ہے کہ وہ آلودگی نہ پھیلائے۔ حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ موٹر کے بجائے سائیکل پر سفر کیا جائے۔ اگر موٹر کا استعمال ضروری ہے تو کسی اور کو بھی شامل سفر کر لیا جائے چاہے وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔ یہی ذہنی کشادگی ان سے ترقی کے زینے طے کروا رہی ہے۔

بے مروت گورے..... قصۂ پارینہ

ہمارے ہاں یہ تاثر ہے کہ گورے بے مروت یا بے حس ہوتے ہیں۔ یہ یا تو افسانہ ہے یا قصۂ پارینہ بن چکا۔ اجنبیوں کو سرِ راہ مسکرا کر دیکھنا معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ کو کسی بھی مدد کی ضرورت ہے تو ہر کوئی بڑھ چڑھ کر آپ کی مدد کرنا چاہے گا۔ دکان دار آپ کو ہر قسم کی آزادی دیتے اور آپ کا مکمل دھیان رکھتے ہیں۔ کاؤنٹر ہو یا لاری اڈا ہر کوئی صبر سے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ وہ دھکم پیل اور بدتمیزی دیکھنے کو نہیں ملتی جو ترقی پذیر ممالک کی قسمت بن چکی۔

لازمی تعلیم۔ خلاف ورزی پر والدین کو سزا

ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان اقوام نے اپنی عوام کی فلاح و بہبود کا بھی خیال رکھا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں "رفیق اخبار" کے مدیر مولوی محبوب عالم نے یورپ کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے بطور خاص کتب خانوں اور لازمی تعلیم کا ذکر کیا۔ اس دور سے ہی تمام اطفال کے لیے بنیادی تعلیم لازمی ہے۔ اس کی خلاف ورزی کی صورت میں والدین کو سزا بھی ملتی ہے۔ لیکن یورپ و امریکہ میں مقیم پاکستانی والدین بھی اپنی کوتاہی سے باز نہیں آتے۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق پاکستانی بچے تمام اقلیتوں سے کم قابلیت رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیمی کارکردگی بھی سب سے پست ہے۔ سدباب کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ان کے لیے خصوصی رقوم مختص کی گئیں تاکہ ان کی تعلیم و تربیت کو بہتر بنایا جا سکے۔

مسلم معاشرے کی مثالی تصویر

مساوات کسی بھی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ مساوات پر قائم معاشرہ ہی مثالی ہے۔ مغربی معاشروں میں ہر کسی کو بلاتخصیص رنگ و نسل یا عہدہ انصاف فراہم کیا جاتا ہے۔ جسٹس (جج) کے اختیارات دیکھ کر خلافت راشدہ کا زمانہ یاد آجاتا ہے جب ایک عام آدمی بھی خلیفہ سے سوال کرنے کی جرأت رکھتا تھا۔

ایک ٹی۔وی شو کے دوران ایک عام آدمی نے برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کو ٹوک دیا۔ اس کی دلیل درست تھی۔ وزیراعظم نے نا صرف اپنی غلطی پر معذرت کی بلکہ اپنی معلومات بڑھانے کا وعدہ کیا۔ آج کے مسلمان سربراہان مملکت تو کیا کسی کونسلر سے بھی اس جمہوریت کا مظاہرہ یا توقع نہیں کی جا سکتی۔ انصاف کی فراہمی اور امن و امان کی اچھی صورت حال کے علاوہ اقلیتوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ انھیں ہر طرح کی سہولیات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ملازمت میں خاص کوٹے دیے جاتے ہیں۔ زبانوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی زبانوں میں چھپی کتابیں ان کے اکثریتی علاقوں میں بکثرت ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ لکھ پڑھ نہیں سکتے انہیں

بلا معاوضہ لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ ان کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی البتہ اس بات کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی قسم کے مذہبی اختلافات پنپ نہ پائیں۔ ایک مسلم معاشرے کی اس سے اچھی تصویر کیا ہو سکتی ہے؟ فرق صرف یہ ہے کہ یہ معاشرہ مسلمان اکثریت نہیں رکھتا نہ ہی اس کا سربراہ خلیفہ ہے۔ اس پہ غور کرنے اور اپنا معاشرہ سدھارنے کی ضرورت ہے کہ اصل فلاحی معاشرہ اسلامی ملکوں میں ہونا چاہیے جس کی لوگ مثالیں دیں۔

فلاحی ریاست

فلاحی ریاست کا پہلا تصور اسلام نے ہی پیش کیا تھا لیکن آج بہت کم مسلم ممالک کی حکومتیں اس پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی جگہ شہنشاہیت اور مطلق العنانی نے لے لی جبکہ یورپ کے بیشتر ممالک فلاحی ریاست ہیں۔ بچوں کو بلاامتیاز پیدائش سے ہی رقم ملنے لگتی ہے۔ اگر باپ چھوڑ کر چلا گیا، تو ماں کو بھی خرچہ ملتا ہے۔ گھر بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ معذور حضرات کے لیے ہر قسم کی سہولیات موجود ہیں۔ ان کے لیے کار پارکنگ میں مخصوص جگہ ہے۔ بیت الخلاء خاص بنے ہوئے ہیں۔ انھیں ملازمت فراہم کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اگر وہ نوکری نہیں کر سکتے تو ان کی تمام ضروریات حکومت پوری کرتی ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والے کو بھی جملہ ضروریات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ بیشتر نووارد آبادکاروں نے ان سہولیات کو اپنے فائدے کے لیے غلط طریقے سے استعمال کیا۔ ان میں پاکستانی بھی شامل ہیں۔ اسی لیے قانون سے ایسے سقم نکالے جا رہے ہیں جن کی مدد لے کر دھوکا دہی کی جا سکے۔ لیکن اچھے قوانین کی پاسداری اور عمل داری قابل تحسین ہے۔

اب ہو جائے کچھ مغربی عوام کی بات۔ ان کا شعور ابھی زندہ ہے اور وہ ناحق بات پر کھڑے ہونے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ عموماً وہ مساوات کے قائل ہوتے اور درگزر سے بھی کام لیتے ہیں۔ ہر قوم قطار بنا کر نظم و ضبط سے کرتے ہیں۔ ہماری طرح کی نفسانفسی کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہمارے عوام خدا پر یقین رکھنے کے باوجود ایک عجیب بے چینی کا شکار رہتے ہیں۔ کبھی شادی بیاہ ہو یا کوئی اور موقع، کھانے تک پہ دھکم پیل کا وہ سماں نظر آتا ہے کہ میدان حشر کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

تعلیم یافتہ افراد میں شعور کی کمی ہے۔ اس کی وجہ شاید ہمارے ملک میں سیاسی و معاشی استحکام کا نہ ہونا ہے۔ اس نے خاص و عام کے دل و دماغ میں بے یقینی بھر دی ہے۔ کیا پتا کل کیا ہو جائے؟ ہر کسی کے اعصاب پر یہی خوف سوار رہتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بدعنوانی بھی عروج پر ہے۔ جلد از جلد سب کچھ سمیٹ لو، پتا نہیں کل یہ بھی ملے یا نہ ملے۔ مغربی معاشروں میں اس قسم کی بے چینی کا کوئی وجود نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بے دھڑک ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرتے اور تمی مہمات میں بھی شریک ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان کے صدر چھٹی پہ بھی جاتے ہیں تو ہماری طرح بھاگ جانے، استعفا دینے کی افواہیں گرم نہیں ہوتیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود کیا وجہ ہے کہ مغربی دنیا سے نفرت خصوصاً ہر اسلامی ملک میں پائی جاتی ہے۔ اس کی اہم وجہ ان کے ماضی کا رویہ ہے جو انھوں نے نوآبادیاتی ممالک میں روا رکھا۔ اگرچہ انھوں نے ان ممالک کی ترقی کے لیے کوششیں بھی کیں لیکن بہرحال اپنے مفادات کو سرفہرست رکھا۔ آج بھی ان ممالک کی پالیسیوں میں سامراجیت اور ملکی مفادات سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

لیکن ملکی مفادات کے لیے کام کرنا کوئی برا نہیں، یہ تو عین عبادت ہے۔ ہمیں بھی قرآن، اسلام وطن کو اولیت دینے کا حکم دیتا ہے۔ ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی فلاح و بہبود پیش نظر رکھ کر ہر معاملہ طے کرے۔ ہمیں سنت نبویؐ سے پتا چلتا ہے کہ آنحضورؐ نے بھی معاہدے کرتے ہوئے معاملہ فہمی اور دوراندیشی سے کام لیا۔ مغربی

ماہرین میں دوراندیشی ایک وصف ہے جس سے ہم بے بہرہ ہیں۔ وہ آنے والی ایک پوری صدی کی پیش بندی کرتے اور قرائن سے اندازہ لگا لیتے ہیں آگے کیا ہوگا۔ وہ جذبات سے نہیں ہوش سے کام لیتے ہیں۔

تاہم یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی عقلیت و مفاد پرستی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ انسانیت تک پیچھے چھوڑ دی جاتی ہے۔ اپنے مفاد کے لیے وہ عوام کے جذبات کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اس کی ایک وجہ سامراجیت پسند ہونا بھی ہے۔ سامراجیت خود غرضی سکھاتی ہے۔ بڑی مغربی کمپنیاں اپنے فائدے کے لیے غریب ممالک کو ہر طرح سے نا صرف استعمال کرتی بلکہ بدعنوانی اور طوائف الملوکیت کا بھی سبب بنتی ہیں۔ یہی کاروباری ادارے سیاسی جماعتوں کو رقوم فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ سیاسی جماعتیں ان کے مفادات کو ہر طرح تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ اسی لیے ہمیں اپنی پسماندگی کے پیچھے سفید اقوام کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

عوام سے زیادہ خواص اس کھیل میں شامل ہیں۔ نیز آہستہ آہستہ مغربی عوام کو سامراجیت کے نقصانات معلوم ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں "کاروبار برائے اخلاق" کا چرچا عام ہو رہا ہے۔ ان میں سویڈن کی کمپنی آئیکیا (Ikea) اور برطانیہ کا سپر سٹور ٹیسکو (Tesco) شامل ہیں۔ مطلب یہ کہ مغربی باشندے ماحولیاتی آلودگی کم کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ فلاحی (Philanthropic) کاروبار کو فروغ دینے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ایسا کاروبار جس میں ہر کسی کو فائدہ ہو۔ مثلاً کسی غریب ملک سے مصنوعات خریدی جائیں اور وہاں کام کرنے والوں کو ان کا جائز حق دینے کے ساتھ ساتھ دیگر سہولیات بھی بہم کی جائیں اور پوری کوشش کی جائے کہ ان کا استحصال نہ ہو۔ پھر مغربی موجدوں کی دریافت و ایجادات سے کسی کو انکار نہیں۔ انھوں نے بنی نوع انسانیت کی بھلائی کے لیے بہت محنت کی ہے۔ اس کی مثالیں پولیو و کوڑھ کا خاتمہ، دل کے امراض کا علاج، پیوندکاری وغیرہ ہیں۔

مغرب کے مقابلے میں ہم پاکستانی ایک ابھرتی ہوئی قوم ہیں جس نے ابھی عملی، علمی، روحانی، ذہنی اور نظریاتی سفر کا آغاز کیا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس سیکھنے کے لیے مغرب کی مثال موجود ہے۔ اپنے موجودہ مقام تک پہنچنے کے لیے انھوں نے نا صرف عرصہ طے کیا بلکہ بے شمار غلطیاں بھی کیں۔ ہمارے پاس نادر موقع ہے کہ ہم ان سے علم حاصل کر کے وقت بچائیں غلطیاں دہرانے سے پرہیز کریں۔ ان کی تقلید میں اپنی ثقافت سے منہ موڑنا ترقی نہیں بلکہ ذہنی کشادگی کی علامت ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد ہی اپنی ذات سے بالاتر ہو کر سوچنے کی قوت رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر ہم بھی مغربی اقوام کی طرح اچھی باتوں، مثالوں اور اصولوں پہ عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیں تو بہت جلد ہمیں بھی قابلِ رشک قوم سمجھا جائے گا۔

ہمارے لیے اس صورت حال میں سبق یہ ہے کہ ہم مغرب کی تین صدیوں کی جدوجہد سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی خوبیاں کھلے دل سے اپنائیں اور غلطیوں سے سبق سیکھیں۔ قوم ہو یا فرد جب تک ہم اپنی خامیوں کا اعتراف نہیں کرتے، ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اگر ہم میں حرص نہ ہو تو کوئی مائی کا لال ہمیں خرید نہیں سکتا۔ اگر ہم انفرادی فائدے کے بجائے اجتماعی فائدے کے لیے کام کریں تو ہم بہت جلد مغرب سے اپنی مرضی منوا سکتے ہیں۔ شاید کبھی ان سے آگے بھی نکل سکیں۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری وفاداری اپنے رب، رسول سے بھی نہیں اور اپنے ایمان سے بھی نہیں۔ وقتی فائدے کا حصول اور فوری کامیابی کسی بھی قیمت پر اگر زندگی کا مقصد بن جائے تو کسی بڑی سوچ، کامیابی کی توقع کیونکر پوری ہو سکتی ہے؟

مغرب کو برا کہنے کی روایت اب بدلنی اور اپنی کمزوریوں پہ نظر جانی چاہیے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ساری دنیا ہماری کمزوریاں جانتی ہے لیکن ہم ہی نہیں مانتے۔

www.paksociety.com

آنکھیں توجہ چاہتی ہیں!

- کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
- کیا آپ پریشان ہیں کہ لیزر والا اپریشن کروالوں یا صرف شیشہ ہی لگوالوں؟
- کالا موتیا کیا ہے اور کیا اس کا علاج ہوسکتا ہے؟
- آنکھ کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟
- بچوں کو عینک کیوں لگتی ہے؟ کیا عینک اتر سکتی ہے؟ لیزر سے عینک اتارنے کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آرہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ لیزر نقصان دہ ہوتی ہے؟
- آپ نے اپریشن کروالیا اب آپ کو کیا احتیاطیں کرنی چاہئیں؟

اپنے سوالوں کے جواب جاننے کے لئے مندرجہ ذیل Website کا مطالعہ کریں

www.drasifkhokhar.com

آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق اردو زبان کی واحد ویب سائٹ

ڈاکٹر آصف کھوکھر
آئی سرجن

ایم بی بی ایس (پنجاب) ایم سی پی ایس (آئی) ایم اے (علوم اسلامیہ)

انچارج شعبہ امراض چشم ثریا عظیم ہسپتال لاہور

آئی سرجن لاہور میڈی کیئر انسٹیٹیوٹ آف اوفتھلمالوجی لاہور

Free Helpline

اپنے سوالوں کے جواب پوچھیے

Cell: 0333-4102266

Email: drasifkhokhar@hotmail.com

اپریشن لاہور میڈی کیئر جیسے جدید ترین آئی ہسپتال میں کیے جاتے ہیں

Vitreoretinal Surgery
- آنکھ کے پردے کے اکھڑ جانے (Retinal Detachment) کا آپریشن
- آنکھ کے اندر خون جمع ہو جانے (Vitreous Hemorrhage) کا آپریشن
- Macula کو پہنچنے والے نقصان کے علاج کیلئے ہونے والے آپریشن

Phaco Surgery
- بغیر ٹیکے اور بغیر ٹانکے سفید موتیا کا علاج
- قریب اور دور کی نظر بیک وقت ٹھیک کرنے والا Multifocal لینز

Laser Surgery
- ذیابیطس اور دیگر بیماریوں سے Retina کو پہنچنے والے نقصان کا بذریعہ لیزر علاج
- Excimer لیزر کے ذریعے Epi-LASIK آپریشن کی مدد سے عینک سے نجات
- کالا موتیا کا Argon - Yag اور Diode لیزر کی مدد سے علاج
- سفید موتیا کے آپریشن کے بعد بننے والی جھلی کا بذریعہ Yag لیزر علاج

Corneal grafting surgery
- مرنے والوں کی عطیہ شدہ آنکھیں لگوا کر قرنیہ کی پیوندکاری

148- آصف بلاک، مین بلیوارڈ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور فون 042-37495073

www.paksociety.com

www.paksociety.com

طنز و مزاح

آؤ ہاتھ سینک کر تاپ لو

مزاح کی انگیٹھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اردو کے نامور کالم نگار
نصر اللہ خان مرحوم
کے کالموں کی چٹ پٹی جھلکیاں

محمود عزیز

www.paksociety.com

اُردو کے مزاحیہ کالم نگاروں میں

جناب نصراللہ خاں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے نصف صدی سے زیادہ کالم نگاری کی اور ریکارڈ ۱۴ ہزار سے زیادہ کالم لکھے۔ ان میں ۱۰ ہزار کالم تو روزنامہ ''حریت'' ہی میں شائع ہوئے۔ حریت کے بند ہونے کے بعد ''روزنامہ جنگ'' میں لکھنے لگے۔ اس کے علاوہ ہفت روزہ تکبیر میں ''نصراللہ خاں کا کالم'' کے نام سے لکھتے رہے۔ ''حریت'' اور ''جنگ'' میں ان کے کالم کا نام ''آداب عرض'' تھا۔ پروفیسر سحر انصاری نے اپنی ایک تحریر ''نصراللہ خاں اور مزاح'' میں اردو کالم نگاری کے متعلق لکھا ہے:

''پاکستان میں اخبارات کا ایک جزو ایسے کالم بھی ہیں جن میں تہذیبی، ادبی، سیاسی، علمی غرض ہر شعبہ فکر و حیات پر ہلکے پھلکے انداز میں اظہار خیال کیا جائے۔ اسے عرف عام میں کالم نویسی کہا جاتا ہے۔ ابتداً جب چراغ حسن حسرت اور مولانا عبدالمجید سالک کے کالموں کا چرچا تھا تو یہ حضرات قلمی نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ پھر جب یہ اندازہ ہوا کہ کالم نویسی ذریعہ عزت بنتی جارہی ہے تو وہ سارے نام جو سندباد جہازی، شیخ دریا، عنقا، ناما فرنولیس اور بت شکن وغیرہ کے پردہ میں چھپے ہوئے تھے، اصلی ادبی ناموں کے ساتھ اجاگر ہونے لگے۔''

جدید مزاحیہ کالم نویسی کو ابن انشاء، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، نصراللہ خاں، شوکت تھانوی، طفیل احمد جمالی وغیرہ نے بطور خاص نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ نصراللہ خاں ان کم یاب مزاح نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے مزاح کو مزاج کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے لفظی کرتب، تحریف، پیروڈی، لطیفہ گوئی اور پھکڑپن سے اپنی تحریر کو اس طرح محفوظ رکھا کہ رشک آتا ہے۔''

سیاسی موسم

نصراللہ خاں صاحب باتوں کے بادشاہ تھے۔ بات سے بات ایسے نکالتے جیسے ہم اور آپ مکھن سے بال یا دودھ میں سے مکھن نکالتے ہیں۔ مثلاً یہ کالم دیکھیے:

''موسمیات کے ماہرین نے اب تک یہ نہ ہوا کہ جو موسم یہ چاہتے، ملک میں رائج کرادیتے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو جلوسوں کے وقت پولیس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ نہ کہیں لاٹھی چلتی اور نہ کہیں آنسو گیس اور گولیوں کی ضرورت پڑتی۔ ایسے موقع پر محکمہ موسمیات بس یہ اعلان کر دیتا کہ جلسے، جلوس اور ہڑتالیں نہیں ہوں گی۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی ایسا کرے گی تو ہم اولے برسادیں گے، لو چلا دیں گے۔ ایسی صورت میں پھر اخباروں میں کچھ اس طرح کی خبریں شائع ہوتیں:

''آج حزب اختلاف اور سرکاری پارٹی میں نشتر پارک میں بڑی زور کی جھڑپ ہوئی۔ سرکاری پارٹی کے کچھ عناصر نے حزب اختلاف کے اجلاس پر اولے برسائے تو جماعت اسلامی نے سخت گرمی دکھائی۔ جمعیت علمائے پاکستان نے لو چلا دی۔ پیپلز گارڈ سیلاب لے آئے۔ سردار شوکت حیات خاں کی پارٹی نے جھکڑ چھوڑا۔ پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے بذریعہ آلات تنبیہ عوام پر قابو پالیا۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ جو تماشائی سیلاب سے تباہ ہوئے ہیں یا جنھیں سیاسی لو لگی ہے یا جو سردار شوکت حیات کے جھکڑ کی نذر ہوگئے، ان سب کو حوصلہ افزائی کے ضمن میں (شاباشی) انعامات یعنی کنسولیشن پرائز دیے جائیں گے۔''

مہنگائی کی دہائی

جالبی صاحب لکھتے ہیں: شوخی، چہل، مزاح اور بے باکی ان کے کالموں کا ایسا وصف ہے کہ پڑھنے والا ان کے طلسم میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ نصراللہ خاں صاحب کے قلم کی سچائی، فقروں کی گرمی، زبان و بیان کے حسن، مزاح کی شگفتگی اور طنز کی حدت نے یقیناً عام آدمی کے شعور میں اضافہ کیا ہے۔ خاں صاحب کی ندرت خیال کے مزید چند نمونے دیکھیے:

''کل ایک صاحب کو ہم نے بازار میں اس طرح

ہاتھ تاپتے دیکھا کہ اپنے دونوں کھلے ہاتھ دکان دار کی طرف بڑھا کر پوچھا "میاں میاں۔ آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے؟" جب دکاندار نے بھاؤ بتایا تو انھوں نے ہاتھ تاپ کر اپنے دونوں ہاتھ واپس کیے اور پھر پوچھا "ہلدی اور دھنیے اور گرم مسالے کا کیا بھاؤ ہے؟"

جب دکاندار نے بھاؤ بتایا تو انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھر اپنے منہ کی طرف بڑھا دیے۔ ہم نے پوچھا، یہ سب کیا ہے؟ بولے "غریب آدمی ہوں۔ گھر میں آگ نہیں، سو اس طرح مہنگائی کی انگیٹھی سے تاپ لیتا ہوں۔"

پہلے زمانے میں ہم جیب میں پیسے اور کاندھے پر خالی تھیلا ڈال کر بازار جایا کرتے تھے۔ اب یہ حال کہ تھیلے میں نوٹ بھر کر لے جاتے اور سامان رومال میں باندھ کر لاتے ہیں۔

بھینسوں کی درخواست

نصراللہ خاں کے تخیل کی زرخیزی اور جولانی قابلِ داد ہے۔ وہ چرند، پرند، انسان، حیوان، زندہ اور مردہ سب پر لکھ سکتے ہیں اور کس قادرالکلامی سے۔ ذیل کے کالم سے بخوبی اس کا اندازہ ہوتا ہے:

"کراچی شہر کی بھینسوں کی درخواست بنام جناب روئیداد خاں، چیف کمشنر، کراچی

حضورِ عالی:

"قادر بخش یہ کہتا ہے کہ سرکار والا ہمیں شہر بدر اس قصور پر کر رہے ہیں کہ ہم شہر میں گندگی پھیلاتی ہیں۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو سرکار والا! اکیلی میونسپل کارپوریشن کراچی کی سب بھینسوں کے مجموعے کے برابر ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بھینسوں کے ساتھ ساتھ کارپوریشن کو بھی ہانک دیا جائے۔"

بھینسوں کی اس آہ و زاری پر نصراللہ خاں شہریوں کی غفلتوں کا موازنہ بھینسوں کے اخلاق و آداب سے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"بھینسیں پان نہیں کھاتی، سڑکوں اور عمارتوں کی پیک سے تجریدی آرٹ کے نمونوں کی نمائش نہیں کرتی۔ دیواروں پر گالی گلوچ نہیں لکھتی۔ لاؤڈ اسپیکر پر شور نہیں مچاتی، فرقہ وارانہ فساد نہیں کراتی۔ بھوری اور کالی بھینسیں سب برابر ہیں۔"

(افلاطون کی کنیزیں، کراچی کی بھینسیں)

سرکار کے شعار

اہم اداروں کی تباہ حالی اور انحطاط پذیری کا مطالعہ بھی ان کے کالموں کا اہم موضوع ہے۔ "موٹوز" (شعار) کے عنوان سے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"جب سید ذوالفقار علی بخاری مرحوم نے کلام پاک سے ریڈیو پاکستان کے لیے یہ شعار نکالا! "قولو للناس حسنا"۔ تو پاکستان کے تمام محکموں کے افسروں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی قرآن مجید سے اپنے لیے اپنی کارکردگی کے مطابق شعار نکال لیں۔ لیکن اس سلسلے میں بڑی دشواری پیش آئی کیونکہ جب وہ محکموں کی کارکردگی پر نظر ڈالتے تو سخت پریشان ہوتے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نظر نہ آتا۔" چنانچہ یہ کام خود کالم نویس یعنی نصراللہ خاں نے کیا۔ مختلف محکموں کے لیے ان کے تجویز کردہ شعار ملاحظہ فرمایئے:

محکمہ پولیس	انی کنت من الظلمین
محکمہ اطلاعات	واللہ اعلم بالصواب
محکمہ خوراک	وفی السماء رزقکم
میونسپل کارپوریشن	لاحول ولاقوۃ الاباللہ
وزارتِ خارجہ	سیروفی الارض،
	کلوواشربو
ملک کے نام نہاد لیڈر	غیرالمضوب
	علیھم الضالین

پولیس کا ہے فرض......

دریا کو کوزے میں بند کرنے کے علاوہ صاف گوئی اور بے باکی کا یہ انداز بھی دیکھیے۔ محکمہ پولیس کے متعلق

علامہ اقبالؒ کی ناقدری

علم و ادب دوست ہونے کے ناتے شاعروں اور ادیبوں سے انھیں قدرتی طور پر دلچسپی تھی۔ چنانچہ شاعروں اور ادیبوں کی خبرگیری کرتے اور حاصل شدہ معلومات سے قارئین کو بہرہ ور فرماتے۔ اقبال شناس ہونے کے سبب ان کی اقبال ناشناسوں پر کڑی نظر تھی۔ علامہؒ کی ناقدری پر تلملا اٹھتے اور شکوہ کرتے:

''جن لوگوں نے علامہ اقبالؒ کے جنازے میں شرکت نہیں کی تھی اور جنھوں نے دور سے بھی علامہ کو نہیں دیکھا تھا، وہ اب علامہ کے دیرینہ نیازمند بن گئے۔ جو دیرینہ نیازمند تھے مثلاً صوفی تبسم صاحب تو یار لوگ انھیں اقبال کے کلینک کا کمپاؤنڈر بتاتے ہیں۔ ایک بزرگ تو بڑی دیدہ دلیری سے یہ فرماتے ہیں کہ علامہ کی خودی کا پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ حکیموں کے علاج سے کم ہوا نہ ڈاکٹروں کے نسخوں سے گیا اور اسی بیماری میں وہ رحلت کر گئے۔''

ایک کالم میں لکھتے ہیں:

ہماری پولیس مجرموں کی حفاظت کرتی ہے۔ لیکن پولیس اور مجرم میں صرف یونیفارم یعنی وردی کا فرق ہے۔ اسی فرق سے پولیس اور مجرم پہچانے جاتے ہیں۔ پولیس کا کام لاٹھی چلانا، گولیاں برسانا، آنسو گیس پھینکنا اور گالیاں دینا ہے۔ اسی کام کی پولیس تنخواہ پاتی اور سلیوٹ کرتی ہے۔

ھذا من فضل شیطان

نصراللہ صاحب کا قول ہے:

''جب میں نے کالم نویسی اختیار کی تو مجھے اپنے دکھ اور آنسو کو ہنسی میں سمیٹ کر اوروں کو بھی ہنسانا آ گیا۔''

خاں صاحب کا جذبہ قابل قدر اور اعلیٰ انسانی قدروں کا حامل ہے۔ ذیل میں خاں صاحب کا ایک اور کالم پیش ہے۔ اس میں شیطان دھاڑیں مار مار کر رو اور انسان ہنس رہا ہے۔

''شہر کی سب سے بڑی ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک بہت بڑے بنگلے کے سامنے ایک ضعیف شخص کہ جس کی بھویں بھی سفید تھیں، بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ہمیں اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ قریب گئے۔ پوچھا:

''بڑے میاں! تم کون ہو، کیوں رو رہے ہو؟''

وہ بولا ''اے اجنبی! میرا نام شیطان ہے۔''

پھر کہنے لگا: ''یہ سامنے والا جو مالک مکان، ہم نے اس کو بلیک مارکیٹنگ، بلیک میلنگ اور بلیک قسم کے جتنے بھی فن ہو سکتے تھے، سب ہی سکھا ڈالے۔ پھر اسے ہم نے اسمگلر بنایا، فرسٹ کلاس اسمگلر، پھر اسے حاجی بنایا۔ جب یہ حج کر کے لوٹا تو اپنے ساتھ دینی ثواب کے بجائے دنیاوی ثواب کے ڈھیر اٹھا لایا۔ پھر اس نے یہ بنگلہ بنایا۔'' یہ کہہ کر شیطان پھر رونے لگا۔ ہم نے رونے کی وجہ دریافت کی، تو بولا:

''دیکھو، سامنے کیا لکھا ہے!''

ہم نے کہا ''سامنے لکھا ہے، ھذا من فضل ربی۔''

وہ بولا ''کیا یہ رونے کا مقام نہیں؟'' اس شخص نے اسمگلنگ ہم سے سیکھی، اسے بلیک مارکیٹنگ ہم نے سکھائی، بلیک میلنگ کے جدید ترین طریقے ہم نے بتائے۔ پھر دولت ہم نے اکٹھی کروائی۔ کیا اپنے مکان پر اس احسان فراموش انسان کو یہ نہیں لکھوانا چاہیے تھا:

''ھذا من فضل شیطان''

www.Paksociety.com

سچی
داستان

دوسری جنگِ عظیم کا
حیرت انگیز سچا واقعہ

پرسیوس کا اکلوتا مسافر

سیکڑوں فٹ نیچے تہہِ آب میں
پھنسی آبدوز سے ایک جوان ہمت
کے نکلنے کا یادگار قصہ

ذیشان علی

www.paksociety.com
www.Paksociety.com

یہ ۶ دسمبر ۱۹۴۰ء کی رات ہے۔ برطانیہ کی آبدوز، پرسیوس (Perseus) یونان سے لگنے والے آئیونی سمندر میں گشت کر رہی تھی۔ یہ دو سو باسٹھ فٹ لمبی اور تقریباً ڈیڑھ ہزار ٹن وزنی تھی جس میں جدید ترین مارک VIII تارپیڈو نصب کیے گئے۔ وہ سمندر میں اطالوی جنگی جہازوں کی کھوج میں تھی جنھوں نے علاقے میں اپنی چودھراہٹ قائم کر رکھی تھی۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد پرسیوس اب تک تین اطالوی بحری جنگی جہاز ڈبو کر نام کما چکی تھی۔ آج رات اس پر عملے کے ۵۹ ارکان کے علاوہ دو مسافر بھی سوار تھے۔ یہ مالٹا سے اس پر بیٹھے تھے اور اب آبدوز نے انھیں اپنے اڈے، اسکندریہ (مصر) لے جانا تھا۔ تب آبدوز کے بدقسمت مسافروں کو قطعاً خبر نہ تھی کہ موت دبے پاؤں ان کی سمت بڑھ رہی ہے۔

دو اجنبی مسافروں میں سے ایک، ۳۱ سالہ جان کیپس بحری جنگی جہاز میں بحیثیت جھونکیا (فائرمین) کام کرتا تھا۔ اس نے اسکندریہ جانے کے لیے ''لفٹ'' لی تھی۔ یہ ایک عجیب برطانوی آدمی تھا۔ کیونکہ اس کا باپ وزارت خارجہ میں بڑا افسر تھا۔ خود اس نے مشہور ڈیلوچ کالج میں تعلیم پائی۔ اب یہ حیرت انگیز بات ہی تھی کہ وہ بحریہ کا کوئی بڑا افسر بننے کے بجائے انجن میں ڈیزل ڈالنے والے معمولی کام پر مامور تھا۔

۶ دسمبر کی رات وہ آبدوز کے دنبالے (عقبی سمت) واقع اس کمرے میں آرام کر رہا تھا جہاں تارپیڈو رکھے جاتے ہیں۔ وہ بوتل سے مشروب چسکیوں میں پیتے ذاتی خطوط کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک ایک زوردار دھماکے نے سرتاپا پرسیوس کو ہلا ڈالا۔ جلد ہی آبدوز کے مختلف مقامات سے چیخوں اور کراہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پرسیوس دراصل اطالویوں کی بچھائی بارودی سرنگ سے ٹکرا گئی تھی۔ بارود نے آبدوز کا اگلا حصہ توڑ ڈالا اور اب پانی شراشر اس میں داخل ہو رہا تھا۔ ضرب نے انجنوں کو بھی ہلا ڈالا اور وہ بند ہو گئے۔ جیسے ہی انجنوں نے کام چھوڑا، پرسیوس بتدریج تہ آب جانے لگی۔

بارودی سرنگ سے ٹکراتے ہی آبدوز کی ساری بتیاں بجھ گئی تھیں۔ جان کیپس کی خوش قسمتی کہ دھماکے نے اسے ہلا تو ڈالا مگر زخمی نہیں کیا۔ وہ دم سادھے اپنی جگہ لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور دھماکا ہوا۔ دراصل پرسیوس کا اگلا حصہ تہ آب سے جا ٹکرایا تھا۔ جان پھر لرز گیا۔ ساتھ ہی اب آبدوز کے عقبی حصے میں بھی پانی بھرنے لگا۔

چند منٹ بعد ہی جان کے حواس بحال ہوئے، تو وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ کمرے میں ایک جگہ دیوار پر ٹارچ لگی ہے۔ چنانچہ وہ گھپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے ٹارچ تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی وہ اس کے ہاتھ آ گئی۔ ٹارچ روشن ہوئی تو کمرا جگمگا اٹھا۔ تب تک ماحول میں انجن جلنے کی سڑاند رچ بس چکی تھی اور جان سانس لینے میں کچھ دشواری محسوس کرنے لگا۔

جان کے جی میں قدرتاً پہلی بات یہی آئی کہ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ جائے۔ وہ ساتھ ہی واقع انجن روم پہنچا تو ایک خوفناک منظر اس کے سامنے آ گیا۔ کمرے میں انجینئروں اور دیگر عملے کی لاشیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دراصل دھماکے سے انجن تباہ ہوا، تو اس سے نکلنے والی بجلی کی تاروں نے کئی لوگوں کی جان لے لی۔ تاہم ان میں سے چار لوگ شدید زخمی ہونے کے باوجود زندہ تھے۔ جان آبدوز کے اگلے حصے نہیں جا سکا کیونکہ باہر موجود پانی کے زبردست دباؤ نے انجن روم کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

جان کیپس کو معاملے کی نزاکت سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اور اس کے چار زندہ ساتھی جلد از جلد باہر نہ نکلے، تو چاروں طرف سے سمندر میں گھری فولادی آبدوز ان کا قبرستان بن جائے گی۔

چنانچہ وہ زخمیوں کو ایک ایک کر کے دنبالے میں لے گیا جہاں نکلنے دار کھڑکی واقع تھی۔ (یعنی آبدوز میں بنی وہ کھڑکی یا دروازہ جس سے حادثے کے وقت نکلا جاتا ہے۔)

دنبالے میں پہنچ کر جان نے اس کا آب روک

www.paksociety.com

آبدوز میں بنی وہ کھڑکی جس سے جان فرار ہوا تھا

(Water Tight) دروازہ بند کر دیا تاکہ پانی اندر داخل نہ ہو سکے۔ اس نے پھر کھلنے والی کھڑکی کے پیچ کھولے۔ تین تو با آسانی کھل گئے، لیکن ایک اڑیل پیچ اپنی جگہ جما رہا۔ خوش قسمتی سے کمرے میں جان کو ایک ہتھوڑی مل گئی۔ اس نے ہتھوڑی سے مار مار کر پیچ ڈھیلا کر دیا۔ یہ کام انجام دینے کے بعد اس نے ربڑ سے بنا لباس پہنا جو خالص آکسیجن سے بھرا ایک بیگ بھی رکھتا تھا۔ پھر وہی لباس اپنے ساتھیوں کو بھی پہنا دیے۔ وہ ہر قیمت پر ان کی جان بچانا چاہتا تھا۔ جب لباس زیب تن ہو چکے تو پانچوں آدمیوں نے ماؤتھ پیس منہ میں ڈال لیے۔ جان نے پھر کھلنے والی کھڑکی کھولی اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچوں باہر نکل آئے۔ یوں زندگی اور موت کے مقابلے میں ایک لڑائی جیت لی گئی، تاہم جنگ جیتنا باقی تھی۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ ٹارچ کی روشنی صرف چند فٹ دور ہی گئی۔ چنانچہ جان نہیں دیکھ سکا کہ اس کے ساتھی کہاں گئے۔ بہرحال اس نے سطح آب تک پہنچنے کا سفر جاری رکھا لیکن یہاں ایک مشکل آن پڑی۔ اس زمانے میں آکسیجن بیگ جدید نہ تھے، لہٰذا ان میں بہت کم آکسیجن ہوتی۔ ان کے ذریعے سمندر میں ۱۵۰ فٹ گہرائی تک جا کر ہی واپس آنا ممکن تھا۔ ادھر زندہ بچ جانے والے فوجی اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ آبدوز ''۱۷۰ فٹ'' نیچے تہ آب پڑی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۰۰ فٹ اوپر جانے کے بعد آکسیجن ختم ہوئی، تو جان کا سانس اکھڑنے لگا۔ بلندی کی طرف سفر کرتے کرتے وہ ایک اور بارودی سرنگ سے ٹکراتے ہوئے بال بال بچا۔ زندگی باقی تھی ورنہ معمولی سا ٹکراؤ اس کے پرخچے اڑا دیتا۔

جب سطح آب ۲۵ فٹ دور تھی، تو سانس لینا دشوار ہو گیا۔ سینے میں دم گھٹنے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ مگر اس نے اوپر کی سمت تیرنا نہ چھوڑا اور ایسے میں پورے جسم کی قوت صرف کر دی۔ جب وہ بے دم ہو کر ہمت ہارنے ہی والا تھا کہ اچانک سطح آب پر پہنچ گیا۔ تب وہ ہانپ ہانپ کر سانس لینے لگا۔ آخر رب کائنات نے اس کی کشتی پار لگا ہی دی، تاہم ابھی اس کا دور ابتلا ختم نہیں ہوا تھا۔

جب جان کے اوسان بحال ہوئے، تو اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے زندہ بچنے والوں میں سے کوئی دکھائی نہ دیا۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ چاروں بدقسمت آکسیجن ختم ہونے کے باعث راہ ہی میں رخصت ہو چکے ہیں۔ آس پاس دیکھنے پر اسے دور سفید دیوہیکل اشیا نظر آئیں۔

یہ دراصل پانچ میل دور واقع یونانی جزیرے، سیفولینا کی پہاڑیاں تھیں۔ وہ یہ سوچ کر انہی کی طرف تیرنے لگا کہ شاید وہاں جان بچانے اور پناہ لینے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اسے امید تھی کہ دیگر ساتھیوں نے بھی

ادھر کا رخ کیا ہوگا۔

سمندر کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ ایسے میں تیراکی کا لباس اس کے بہت کام آیا۔ اس نے جان کو نہ صرف گرم رکھا بلکہ زندگی بچاؤ سہارے (لائف جیکٹ) کا کام بھی دیا۔ آخر کار وہ صبح سویرے جزیرے تک پہنچ گیا۔ اس نے بمشکل خود کو ساحل سمندر پر گھسیٹا اور بے ہوش ہوگیا۔ صبح جب دو مچھیرے وہاں سے گزرے، تو انھوں نے اسے دریافت کیا۔ وہ پھر اسے اپنے گھر لے گئے۔

سفولینا پر اطالویوں نے قبضہ کر رکھا تھا، اگرچہ اس کی غیراہمیت کے سبب وہاں فوجی نفری بہت کم تھی۔ چونکہ یونانی ان سے نفرت کرتے تھے، لہٰذا مچھیروں نے جان کو چھپا لیا اور اسے اطالویوں کے حوالے نہ کیا۔ اب اگلے ۱۸ ماہ تک وہ جزیرے پر ہی چھپا رہا۔ اس نے اپنے سنہرے بال سیاہ کر لیے تاکہ اپنی شناخت چھپا سکے۔ اس کا وزن بھی ۳۰ کلو کم ہوگیا۔

مئی ۱۹۴۳ء میں آخر برطانوی بحریہ کو معلوم ہوا کہ جان زندہ اور جزیرہ سفولینا میں مقیم ہے۔ چنانچہ ایک تاریک رات ایک برطانوی آبدوز اسے لینے جزیرے پر پہنچ گئی۔ یوں جان کا خطرات سے بھرا سفر تمام ہوا اور وہ اپنی ڈیوٹی سنبھالنے اسکندریہ پہنچ گیا۔

خاتمہ جنگ کے بعد برطانوی حکومت نے ہمت و استقامت دکھانے پر جان کو تمغۂ بہادری سے نوازا۔ تاہم کئی افسروں کو یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ عملۂ آبدوز میں شامل نہیں تھا۔ پھر اس نے آبدوز سے فرار کی جو تفصیل مختلف مواقع پر بیان کی، اس میں کچھ تضاد تھا۔ بہرحال ۵۴ سال بعد یہ بات عیاں ہوئی کہ جان واقعی سچ بول رہا تھا۔

ہوا یہ کہ ۱۹۹۷ء میں ایتھنز، یونان کے ایک غوطہ خور، کوستاس تھوسٹراڈیس نے مقامی رسالے میں پرسیوس کی کہانی پڑھی۔ تب کوستاس اس برطانوی آبدوز میں دلچسپی لینے لگا۔ اس میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جانے، پرسیوس اس وقت کہاں ہے؟ کیا وہ بارودی سرنگ سے تباہ ہوئی یا تارپیڈو نے اسے برباد کیا۔

چنانچہ کوستاس زیرِ سمندر اشیا کا سراغ لگانے والا ریڈار لیے سفولینا پہنچ گیا۔ وہاں اس نے سمندر میں تین غوطے لگائے، مگر آبدوز نہ مل سکی۔ آخر قسمت نے یاوری کی اور اس کی ملاقات ایک مچھیرے سے ہوئی۔ اس مچھیرے کا جال ایک بار کسی نہایت بھاری شے میں پھنس گیا تھا۔ اب مچھیرے کو یقین تھا کہ بھاری شے وہی ڈوبی آبدوز ہوگی۔

کوستاس مچھیرے کی بتائی جگہ جا پہنچا۔ آخر اسے کامیابی ملی اور دوسرے غوطے میں ریڈار پر زیرِ آب آبدوز نظر آگئی۔ کوستاس پھر آب روک کیمرا اور ویڈیو کیمرے لیے ایک ساتھی کے ساتھ آبدوز تک پہنچا۔ انھیں آبدوز کے منہ پر ایک سوراخ نظر آیا۔ قریب ہی بارودی سرنگ کا ٹکڑا موجود تھا۔ یوں اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ بارودی سرنگ کے باعث ہی تباہ ہوئی۔ پہلے برطانوی حکومت نے صرف شک ظاہر کیا تھا۔

تھوڑی چھان بین کے بعد دونوں غوطہ خوروں کو آبدوز کی کھٹکے دار کھڑکی بھی نظر آگئی جو کھلی ہوئی تھی۔ وہ اس کے راستے دنبالے میں داخل ہوئے۔ انھیں وہاں وہی منظر دکھائی دیا جو جان نے بتایا تھا۔ کمرے میں فوجی بوٹوں کے ۳ جوڑے پڑے تھے اور وہ بوتل بھی جس سے جان مشروب پی رہا تھا۔ یوں ثابت ہوگیا کہ اس رات جان نے فوق البشر جدوجہد دکھائی اور اپنی جان بچانے میں کامیاب رہا ورنہ آبدوز ہی موصوف کا فولادی قبرستان بن جاتی۔

اگرچہ ۱۹۹۷ء میں جان کی صداقت عیاں ہوئی، تو وہ اظہارِ مسرت کرنے کو موجود نہ تھا، وہ بھری پری زندگی گزار کر ۱۹۸۵ء میں چل بسا تھا۔

واضح رہے، دوسری جنگ عظیم میں سیکڑوں برطانوی آبدوزیں تباہ ہوئی تھیں، لیکن ان میں صرف چار ہی فوجی جان بچا کر نکل سکے اور ان فوجیوں میں سب سے زیادہ تعجب خیز اور حیران کن داستان جان کیپس ہی کی تھی۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

خوراک و صحت

چولائی کا ساگ

موسم سرما کا قدرتی تحفہ

بہت سوں کو پھیکا لگنے والا یہ ساگ بچھو کے زہر تک کا تریاق اور کئی ظاہر و پوشیدہ بیماریوں کے لیے اکسیر ہے

ڈاکٹر نثار احمد

پاک و ہند میں چولائی کا ساگ ایک مشہور سبزی ہے۔ کاشت کی جاتی اور جنگلی خودرو بھی ہوتی ہے۔ رنگ کے اعتبار سے تین قسم کی ہے: سبز، سرخ اور سفید۔ اس کی ڈنٹھل چھوٹی ہوتی ہے۔ چولائی کے پودے چھوٹے ہوتے ہیں۔ جنگلی قسم کانٹے بھی رکھتی ہے۔ پتوں کا ذائقہ پھیکا ہوتا ہے لیکن تھوڑی تلخی بھی رکھتے ہیں۔ بیج خشخاش کے دانوں سے کچھ بڑے ہوتے ہیں۔ تازہ شاخوں اور پتوں کو توڑ کر بطور سبزی پکاتے ہیں۔ چولائی کا ساگ یا چینی پالک مرغوب سبزی ہے جو پورے برصغیر میں اگتی ہے۔ گو یہ مختصر عرصہ تک رہنے والی موسمی سبزی ہے۔ اس کے ڈنٹھل تھوڑے موٹے اور گودار ہوتے ہیں۔

اب چولائی کے ساگ کی چھ قسمیں کاشت کی جاتی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا وطن جنوبی امریکہ کے اندرونی علاقے ہیں۔ اب اس کی قسمیں وسیع پیمانے پر ایشیائی ممالک میں زیر کاشت ہیں۔ چولائی کا ساگ گرم موسم میں بویا اور سردیوں میں کھایا جاتا ہے۔

کیمیائی ہیئت:

چولائی کے ساگ کی غذائی صلاحیت ایک سو گرام میں ۴۵٫۳ حرارے ہیں۔ اس میں ۸۵٫۷ فیصد رطوبت، ۳٫۰ فیصد پروٹین، ۰٫۵ فیصد چکنائی، ۲٫۷ فیصد معدنیات، ۱٫۰ فیصد ریشے اور ۶٫۱ فیصد نشاستے (کاربوہائیڈریٹس) پائے جاتے ہیں۔ چولائی کا ساگ پہلے درجے میں گرم و خشک ہے۔ بعض حکماء نے سرد و خشک بھی لکھا ہے۔

طبی تاثیر و افادیت:

چولائی کے ساگ کا باقاعدہ استعمال ہمیں وٹامن اے، بی، سی، کیلشیم، فولاد اور پوٹاشیم کی کمی سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ متعدد بے قاعدگیوں سے بھی بچاتا ہے جن میں خلل بصارت، اعضا میں چھوت، بار بار زکام ہو جانا اور غیر پیدائشی بانجھ پن شامل ہے۔ ہندوستانی وید لکھتے ہیں چولائی کا ساگ زود ہضم اور میٹھا ہے۔ زہروں کا اثر زائل کرتا ہے۔ سانپ کا زہر اتارنے کے لیے اس کے اجزا کا رس پلاتے ہیں۔ جڑ کا جوشاندہ ریاحی درد میں مفید ہے۔ جڑ گھوٹ چھان کر پلانے سے سوزاک جاتا رہتا ہے۔ پیپ کا آنا بند ہوتا ہے۔ استحاضہ دور کرنے کے لیے اسے دوسری مفید ادویہ کے ساتھ شامل کرتے ہیں۔ پھوڑوں پر اس کے پتے پیس کر باندھنے سے وہ جلد پک جاتے ہیں۔ چولائی کا ساگ ہاضم ہے، بھوک بڑھاتا، صفرا، بلغم اور خون کا فساد مٹاتا اور اجابت لاتا ہے۔

www.paksociety.com

دافع زہر:

اس کی جڑ ٹھنڈی اور مدر بول ہے۔ اسے گھس کر لیپ کرنے سے بچھو کا زہر اتر جاتا ہے۔ پتے پیس کر لیپ کرنے سے مکڑی کا زہر اثر نہیں کرتا۔

استحاضہ الرحم:

اس کی جڑ رسوت شہد اور چاولوں کے دھوون کے ساتھ پلانے سے عورت کا سیلان الرحم استحاضہ بند ہوتا ہے۔ سرخ چولائی کی جڑ پانی میں پیس کر روزانہ ۳/۲ ہفتے تک پیتے رہنے سے حیض کا خون آنا بند ہوتا ہے۔ قے یا تھوک میں خون آنے میں بھی نافع ہے۔

امراضِ مثانہ:

اس کے پتے گرم پانی میں بھگو اور پھر مل چھان کر پلانے سے پیشاب کی نالی کی سوزش اور جلن دور ہوتی ہے۔

نکسیر/جھائیاں:

چولائی اور نیم کے پتے پیس کر کنپٹی پر ضماد کرنے سے نکسیر بند ہوتی ہے۔ چولائی کے کثیر استعمال سے پتھری گل جاتی ہے۔ اس کے اجزا جلا کر راکھ پانی میں ملایئے۔ پھر منہ پر لیپ کر کے کچھ دیر دھوپ میں بیٹھ کر گرم پانی سے منہ دھولیں تو جھائیں دور ہوجاتی ہیں۔

امراضِ تنفس:

اس کا تازہ رس شہد کے ساتھ پینے سے پرانی کھانسی، دمہ اور تپ دق کے امراض دور ہوتے ہیں۔ اس کا شعوق شہد میں ملا کر چاٹنے سے سرخیادہ ختم ہے۔ یہ دق کے مریض کو بھی فائدہ دیتا ہے۔ سرخ قسم بلغم، درد، قولنج، شکم کے درد، استسقا، اور جگر کی بیماریوں میں مفید ہے۔

ایام حمل اورکمی دودھ:

حاملہ اور بچوں کو دودھ پلانے والی خواتین اگر چولائی کا ساگ باقاعدہ استعمال کریں تو انھیں بہت فائدہ ہوگا۔ مذکورہ دنوں میں چولائی کے پتوں کا تازہ رس ایک پیالی شہد اور چٹکی بھر چھوٹی الائچی کا سفوف ملا کر پیتے رہیں تو پرورش پانے والے بچوں کی اچھی نشوونما یقینی ہو جاتی ہے۔ جسم میں کیلشیم اور فولاد کی کمی نہیں ہوتی۔ رحم کی بافتوں کو سکون ملتا ہے اور زچگی کے وقت آسانی اور درد میں کمی رہتی ہے۔ زچگی کے بعد اس کا استعمال زیادہ دنوں تک لیٹے رہنے سے بچاتا ہے۔ پیچیدگیاں روکتا اور دودھ کی مقدار اور بہاؤ میں اضافہ کرتا ہے۔

نشوونما اطفال:

بچوں کی ناقص نشوونما دور کرنے کے لیے یہ ساگ بہت مفید ہے۔ بچے کی پیدائش کے ۱۵ دن بعد اسے روزانہ چند قطرے ساگ کا تازہ رس پلایئے۔ یہ بچے کی نشوونما میں مدد دے گا اور اسے توانائی مہیا کرے گا۔ اس سے قبض کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بچے میں قوت مدافعت بڑھتی ہے اور دانت نکلنے کے دنوں میں مسائل پیدا نہیں ہوتے۔ بڑھتے بچوں کو یہ رس بطور محفوظ قدرتی ٹانک دیجیے۔ اس میں تمام ضروری امینوایسڈ مثلاً آرجینین، ہسٹی ڈین، آئیسولوسین، لائی سین، لیوسین، تھریونین اور لائسین ہیں۔

خون رسنا:

چولائی کے ساگ کا استعمال ہر قسم کے خون کا اخراج ختم کرتا ہے۔ اس کے تازہ رس کی ایک پیالی میں ایک چمچہ لیموں شامل کر کے روزانہ رات کو نوش فرمایئے۔ مسوڑھوں، ناک، پھیپھڑوں، بواسیر اور حیض میں خون آنے کی شکایت رفع ہوگی۔

لیکوریا:

ساگ کی جڑوں کا چھلکا ۲۵۰ ملی لیٹر پانی میں گھس کر پانی چھان لیں۔ یہ پانی مریض کو صبح شام پلایئے۔ عموماً پہلی خوراک سے ہی آرام آجاتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ چولائی کی جڑوں کو بہت جلد کیڑا لگ جاتا ہے۔ لہٰذا استعمال میں لانے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ کیڑا تو نہیں لگا؟ اگر جڑیں اچھی حالت میں نہ ہوں، تو چولائی کے پتے اور شاخیں استعمال کرلیجیے۔

www.Paksociety.com پاک سوسائٹی ڈاٹ کام www.paksociety.com www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

سماجی ترقی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دورِ حاضر کی من چاہی ایجاد جو ہر خاص و عام کو
بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ بھی بن گئی ہے

صحت کا نیا دوست

www.paksociety.com

موبائل فون

www.Paksociety.com

”واٹسن! یہاں آؤ، مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔“

یہ دنیا کی پہلی ٹیلی فون کال تھی جو ۱۰ مارچ ۱۸۷۶ء میں ٹیلی فون کے موجد، الیگزینڈر گراہم بل کی طرف سے کی گئی۔ اس کال کے سبب کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ سائنسدان بے احتیاطی سے اپنے اوپر تھوڑا سا تیزاب گرا بیٹھا تھا اور طبی مدد کے لیے اپنے دوست کو بلا رہا تھا۔ واقعہ چاہے کچھ بھی ہوا ہو لیکن اس میں شاید کسی کو اختلاف نہیں کہ آنے والے دنوں میں موبائل فون طب و صحت کے میدان میں انسان کے نئے معاون کے طور پر سامنے آئے گا۔

موبائل فون آج ہماری زندگی کا اہم جزو بن چکا ہے۔ بات چیت، رابطے اور معلومات کے تبادلے سے آگے نکلتے ہوئے یہ تفریح، تعلیم، بینکاری، کامرس اور کئی دوسرے میدانوں میں بھی اپنے قدم جما چکا ہے۔ ایسی طرح ایک شعبہ طب و صحت کا ہے جہاں موبائل فون ٹیکنالوجی اپنے مثبت اثرات کے ساتھ داخل ہو رہی ہے۔ عموماً موبائل فون کے استعمال سے صحت پر پڑنے والے منفی اثرات کی رپورٹیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک رپورٹ جرنل آف امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن میں شائع ہوئی۔ اس کے مطابق موبائل فون کا زیادہ استعمال دماغ کی کارکردگی پہ منفی اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح برطانیہ میں ہونے والی ایک حالیہ تحقیق بتاتی ہے کہ موبائل فون صحت کے لیے ٹائم بم بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ موبائل کا زیادہ استعمال برین ٹیومر جیسی بیماریوں کا باعث بن سکتا ہے۔ تحقیق میں شامل ایک پروفیسر نے موبائل فون کے لیے سگریٹ کے پیکٹ پہ درج انتباہ جیسی عبارت کی سفارش کی ہے۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ موبائل فون کا استعمال محدود ہو اور سمجھ داری سے ہو تو یہ زندگی میں بے شمار آسانیاں بھی پیدا کرتا ہے۔ موبائل فون ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں طب و صحت کے شعبے میں مثبت تبدیلیاں بھی لا رہا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک کے افراد موبائل فون پر موجود ایسی بے شمار ایپلی کیشنز (Applications) سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو صحت برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان ایپلی کیشنز کی تعداد ہزاروں میں ہے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ موبائل فون بنانے والی مقبول کمپنی بلیک بیری کی صحت سے متعلق ایپلی کیشنز کی تعداد ۲۸۰ سے زائد ہے۔ اسی طرح دنیا میں سب سے زیادہ موبائل فون بنانے والی کمپنی نوکیا اور انٹرنیٹ کی بڑی کمپنی گوگل کی طرف سے بھی نت نئی ایپلی کیشنز سامنے آتی رہتی ہیں۔

اگر آپ کسی ترقی یافتہ ملک میں ہیں تو آپ کا موبائل صحت برقرار رکھنے کی کوشش میں آپ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر موبائل فون آپ کے لیے چشمے (Glasses) کا صحیح نمبر تجویز کر سکتا ہے۔ جو غذا آپ کھا رہے ہوں اس کی غذائیت کے بارے میں مکمل معلومات دیتا ہے۔ اسی طرح دن بھر میں حاصل کی جانے والی کیلوریز کی تعداد کا بھی حساب رکھتا ہے۔ آپ کا موبائل فون آپ کے گلوکوز اور کولیسٹرول کی سطح پہ بھی نظر رکھے گا۔

موبائل آپ کو ادویات کے بارے میں بھی بتا سکتا ہے کہ وہ اصلی ہیں یا جعلی۔ اس کے ذریعے دمے کے کسی حملے کی پیشگی اطلاع بھی مل سکتی ہے۔ یہ تمباکو نوشی ترک کرنے کی کوشش میں بھی آپ کا معاون بن سکتا ہے۔ دوا لینے کے وقت کے بارے میں بھی یاد دہانی کروا سکتا ہے۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں طبی مدد کے لیے درکار ابتدائی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ موبائل ایک گھڑی میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے جو ورزش کرتے ہوئے آپ کو اس کے دورانیے اور دل کی دھڑکن کے بارے میں بتاتی رہے یا دوڑ، چہل قدمی، تیراکی اور سائیکلنگ کرتے ہوئے آپ کے طے کردہ فاصلے، وقت اور رفتار پہ نظر رکھے۔

ترقی پذیر ممالک میں موبائل فون استعمال کرنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین

کے مطابق اس رجحان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طب وصحت کے شعبے میں بھی لوگوں کے لیے بے شمار آسانیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ ترقی پذیر اور غریب ممالک میں آبادی کی کثیر تعداد ہسپتال، کلینک اور صحت کی دوسری سہولتوں سے محروم رہتی ہے۔ موبائل ٹیکنالوجی سے ایسے بے شمار منصوبے شروع کیے جا سکتے ہیں جن کے ذریعے امراض کی تشخیص اور علاج کو بہتر بنایا، بیماریوں کا پھیلاؤ روکا اور صحت سے متعلق معلومات کی فراہمی کو عام کیا جائے۔

ایک عالمی فلاحی ادارے نے نوکیا کمپنی کے تعاون سے بھارت میں گزشتہ سال ذیابیطس سے بچاؤ کے لیے ایک آگہی مہم شروع کی۔ اس میں ہدف مقرر کیا گیا کہ دو سال کے عرصے میں ۱۲ مختلف زبانوں میں ۱۰ ؍ لاکھ افراد کو ذیابیطس سے بچاؤ کے حوالے سے موبائل پیغامات بھیجے جائیں گے۔ انھیں بتایا جائے کہ عادات میں تبدیلی کے ذریعے ذیابیطس سے کیسے بچا جائے۔ موبائل استعمال کرنے والا ۶ ؍ ماہ کے لیے ہفتے میں ۲ ؍ بار یہ پیغامات حاصل کر سکتا اور معمولی قیمت میں یہ سلسلہ جاری بھی رکھ سکتا ہے۔

معروف آئی۔ ٹی کمپنی مائیکرو سافٹ کے بانی اور فلاحی کاموں کے حوالے سے عالمی شہرت رکھنے والے بل گیٹس نے بھی سماجی ترقی کے لیے موبائل فون کی افادیت کو تسلیم کیا ہے۔ انھوں نے موبائل کی افادیت کے حوالے سے ہونے والی ایک عالمی کانفرنس میں اس سوچ کا اظہار کیا کہ غریب ممالک میں موبائل فون کے استعمال سے بچوں کو مہلک بیماریوں کے لیے دی جانے والی ویکسین کی شرح میں نمایاں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ ایسے منصوبوں میں لوگوں کے موبائل فون پہ یاد دہانی کے پیغامات بھیجے جاتے ہیں اور محدود ہونے پہ لوگوں کو کال کر کے صحت کے عملے کی طرف سے دیے گئے اعداد و شمار کی تصدیق بھی ممکن ہوتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں طب وصحت کے حوالے سے کئی ایسے منصوبے ہیں جہاں موبائل ٹیکنالوجی اپنی افادیت ثابت کر چکی ہے۔ برازیل کے علاقے میں موبائل کمپنی نوکیا کے تعاون سے معلومات اکٹھی کرنے میں مدد دینے والی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی۔ اس میں فیلڈ ورکرز نے موبائل کے ذریعے اعداد و شمار اکٹھے کیے اور ڈینگی بخار کا پھیلاؤ روکنے کے لیے موثر کردار ادا کیا۔ بچوں کی پیدائش کی رجسٹریشن، زراعت اور پانی کے سروے کے لیے بھی اسی ٹیکنالوجی کو استعمال کیا گیا۔

بھارت میں ایسے کئی منصوبوں پہ کام کیا گیا ہے جن کے ذریعے لوگوں کو ملنے والی صحت کی سہولتوں کو بہتر بنایا گیا۔ وہاں وزارت صحت کے ایک ایسے ہی پروگرام میں بچوں کو ویکسین دینے کی شرح بہتر بنانے کے لیے موبائل فون کا استعمال کیا گیا۔ اس میں ۲۶ ؍ ملین حاملہ خواتین کے موبائل نمبر اکٹھے کرنے کا ہدف مقرر کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ خواتین کی ایک محدود تعداد کو موبائل کے ذریعے بچوں کے ویکسین دیے جانے کے بارے میں پوچھا جائے اور اس حوالے سے صحت کے عملے کی طرف سے اکٹھے کیے گئے اعداد و شمار کی تصدیق کی جائے۔

اسی ملک میں ایک دلچسپ منصوبہ ڈاکٹر ایس ایم ایس (SMS) ہے۔ اس منصوبے میں موبائل استعمال کرنے والے فرد کو ایک ایس ایم ایس بھیجنے پر قریبی ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے پتے اور فون نمبر جیسی معلومات موبائل پیغام کے ذریعے پہنچائی جاتی ہے۔ اس منصوبے کو مزید وسعت دی جا رہی ہے۔ مستقبل میں ڈینگی جیسی بیماریوں کا پھیلاؤ روکنے کے لیے لوگوں کو پیغامات (Alerts) بھیجے جائیں گے۔ خون کے ضرورت مند فرد کی کال خون عطیہ کرنے والے افراد تک پہنچائی جائے گی۔ اسی طرح کے ایک منصوبے میں بھارت کی معروف ٹیلی کام کمپنی ایئرٹیل (Airtel) حاملہ خواتین کو صحت کے حوالے سے موبائل پیغامات پہنچانے کے منصوبے پر کام کر رہی ہے۔

ایک اور ریاست میں بیماری کے پھیلاؤ پر نظر رکھنے کے لیے نوکیا کمپنی کے تعاون سے ایک منصوبہ شروع کیا گیا۔ ایک منفرد منصوبے میں موبائل کمپنی ووڈافون کے تعاون سے طبی آلات بنانے والی کمپنی نے موبائل کے ذریعے یہ ممکن بنایا کہ ڈاکٹر دور بیٹھے مریضوں کی ای۔ سی۔ جی (ECG) اور دل کی کارکردگی کی رپورٹیں دیکھ سکیں۔

صحت کی سہولتوں تک رسائی ممکن بنانے کے لیے ایسے ہی بے شمار منصوبے دوسرے ترقی پذیر ممالک میں شروع کیے جا سکتے ہیں۔ موبائل فون کے استعمال کرنے والوں کی تعداد کے حوالے سے پاکستان ایشیا میں پانچویں نمبر پر ہے۔ پاکستان میں ۱۰۰ ملین سے زائد افراد موبائل فون استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے فروغ کی وجہ کمپنیوں میں بڑھتا ہوا مقابلے کا رجحان اور کال کی کم قیمتیں ہیں۔ موبائل استعمال کرنے والوں میں خواتین، چھوٹے کسان، تاجر، کم آمدنی والے اور کم پڑھے لکھے افراد بھی شامل ہیں۔ یہاں کال کے علاوہ موبائل پیغامات ایس ایم ایس بھی رابطے کا مقبول ذریعہ ہیں۔ یہ ہمارے طرز زندگی میں نمایاں تبدیلی لے کر آئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستانی ہر روز ایک بلین سے زیادہ پیغامات بھیجتے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی کی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۹ء میں پاکستانیوں نے ۱۵۱ ملین پیغامات بھیجے۔ ایس ایم ایس کی ٹریفک کے حوالے سے پاکستان دنیا کے بڑے ممالک میں شامل ہے۔ نوکیا نے پاکستان کو ایس ایم ایس ٹریفک میں دنیا کا تیسرا بڑا ملک قرار دیا۔

پاکستان میں بھی دوسرے ممالک کی طرح سماجی منصوبوں کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے موبائل فون ٹیکنالوجی کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک موبائل کمپنی نے یہاں عالمی ادارہ یونیسکو کے تعاون سے لڑکیوں کی تعلیم کے منصوبے پر کام کیا۔ اس میں بچیوں کی تعلیم کے لیے موبائل پیغامات کے ذریعے خواندگی کے تصور کو اپنایا گیا۔ اسی طرح ایک اور کمپنی نے طبی مشورے کی سروس کا آغاز کیا۔ لیکن یہاں طب و صحت کے میدان میں اس جدید اور مقبول ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کے بے شمار مواقع موجود ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی بیماریوں کی تشخیص اور علاج میں معاونت اور ڈینگی جیسی ہلاکتوں کے پھیلاؤ کو روکنے میں فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے ذریعے ذیابیطس جیسی بیماریوں سے بچاؤ کے لیے آگہی پھیلائی جا سکتی اور بچوں کے لیے حفاظتی ٹیکوں جیسے پروگراموں کو مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن ہمیں ایسے رویوں اور پالیسیوں کی ضرورت ہے جو موبائل ٹیکنالوجی کو معاشی اور سماجی ترقی سے ہم آہنگ کریں تاکہ لوگوں کا معیار زندگی بہتر ہو۔

دنیا کے نامور ماہر معاشیات اور بنگلہ دیش میں گرامین بینک کے بانی، نوبل انعام یافتہ محمد یونس کا خیال ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں لوگوں کو غربت سے نکالنے کا سب سے تیز طریقہ یہ ہے کہ انھیں موبائل فون مہیا کر دیے جائیں۔ گرامین بینک غریبوں کو چھوٹے قرضوں کے ذریعے خوشحال کرنے کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔

موبائل فون کے ذریعے معاشی اور سماجی ترقی کا عمل تیز کرنے کے لیے سرکاری اور نجی شعبے میں موبائل ٹیکنالوجی اور صحت سے متعلق ہمارے اداروں اور کمپنیوں کو بھی سوچ سامنے رکھنی ہوگی۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

موسم سرما کے دو غذائی تحفوں کا ذکر جو مزہ ہی نہیں بلکہ کئی بیماریوں کا مستند علاج بھی ہیں

گاجر

۱۲ بیش قیمت فائدے

کبھی یہ شہنشاہوں کا من بھاتا کھاجا ہوتا تھا

فریدہ خانم

سبزیوں میں گاجر کو بعض ترکاریوں کے ساتھ یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ ترکاری ہے اور پھل بھی! پاک و ہند کے اکثر حصوں میں کاشت ہوتی ہے۔ ذائقہ میٹھا اور خوشگوار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر طبقے کے لوگ یکساں شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ غذائیت سے بھرپور ہے۔ پرانے اطبا، سائنسدان، حکما اسے دل کی طاقت کے لیے انمول غذا قرار دیتے ہیں۔ کبھی یہ بادشاہوں کا من بھاتا کھانا ہوتا تھا کہ تمام حکما بادشاہوں کو اس کے استعمال پر راغب کرتے تھے۔

گاجر کے کیمیائی اجزا: پانی ۸۵.۷ فیصد، پروٹین ۵ فیصد، نشاستہ ۱۰ فیصد، معدنی نمکیات ۹ فیصد، چکنائی ۳۱.۰ فیصد۔ گاجر میں اے، بی، سی وٹامن اور معدنیات میں فولاد، کیلشیم اور فاسفورس ملتے ہیں۔ سیاہ گاجروں میں وٹامن سی کی کافی مقدار ہوتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ زیادہ دیر اگر گاجریں گرمی اور ہوا میں کھلی رہیں تو ان کے وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں اس کے اہم فوائد پیش خدمت ہیں:

(۱) دماغی کمزوری: صبح ۷ عدد مغز بادام کھا کر گاجر کا ۱۰ تولہ رس پی لیجیے۔ چند روز استعمال سے دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ یہ نسخہ حافظہ تیز کرتا ہے۔

(۲) پیٹ میں پانی: اگر پیٹ میں پانی بھر جائے تو اس خلل سے چھٹکارا پانے کے لیے گاجر کا مربا بے حد مفید ہے۔ اسے مسلسل چند روز استعمال کریں، فائدہ ہوگا۔

(۳) درد شقیقہ: گاجر کے سبز پتے گائے کے گھی سے چپڑ کر توے پر رکھ کر گرم کریں۔ پھر نچوڑ کر مریض کے نتھنوں میں پانی ٹپکائیں۔ چند چھینکیں آنے سے پانی نکلے گا یوں درد شقیقہ میں افاقہ ہوگا۔

(۴) تندرست بچہ: اگر حاملہ عورت دوران حمل ایک دو چھٹانک گاجر کا گودا اور مصری ملا کر استعمال کرے، تو بچہ خوبصورت اور تندرست پیدا ہوتا ہے۔

(۵) نیند میں چلنا: بعض لوگوں کو نیند میں چلنے کی خطرناک بیماری ہوتی ہے۔ گاجر اس مرض میں بھی موثر دوا

www.Paksociety.com

نہلے پہ دہلا

ایک آدمی کے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا تھا۔ اس نے میونسپل کمیٹی والوں کو فون کیا "میرے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا ہے، اٹھوا لیں۔"

جواب ملا "وہیں دفن کر دو۔"

وہ آدمی کچھ دیر خاموش رہا پھر جل کر بولا "دفن تو کر دیتا مگر میں نے سوچا کہ پہلے مرحوم کے خاندان والوں کو تو خبر کر دوں۔"

(محمد اقبال، ملتان)

ہے۔ آدھ کلو گاجریں پانی میں بھگو دیں۔ تمام رات بھیگا رہنے دیں۔ صبح ان کا رس نکال کر استعمال میں لائیے، نیند میں چلنے کی بیماری سے نجات ملے گی۔

(۶) گاجر بطور مسواک: گاجریں دانتوں کے امراض کے لیے بھی مفید ہیں۔ گاجروں کو نہ صرف پکائیے بلکہ اسے بطور مسواک دانتوں اور مسوڑھوں پر پھیریے۔

(۷) یرقان: گاجر کا پانی نکال کر اس میں مصری ملا لیجیے۔ تقریباً دس تولہ روزانہ صبح و شام یرقان کے مریض کو پلائیے۔ اللہ نے چاہا تو مرض سے نجات ہوگی۔

(۸) جوشاندہ حیض: تخم گاجر ایک تولہ اور پرانا گڑ دو تولہ، آدھ کلو پانی میں ابال لیجیے۔ جب پانی آدھا رہ جائے تو چھان کر مریضہ کو پلائیے۔ برسوں کا رکا حیض جاری ہو جائے گا۔

(۹) پھنسیوں کا ورم: اگر پھنسیاں متورم ہوں اور ورم نہ اترے، تو گاجریں خشک کر کے باریک پیس لیں۔ پھر تھوڑا سا نمک ملا کر ورم پر باندھیے۔ ورم تحلیل ہو جائے گا۔

(۱۰) آگ سے جلنا: اگر کسی حادثے میں جسم آگ سے جل جائے تو فوراً گاجریں پیس کر اوپر لیپ کر دیجیے۔ اللہ کے فضل سے فوری طور پر جلن اور سوزش ہٹ کر آرام محسوس ہوگا۔

(۱۱) خفقان: گاجر کو تنور میں بھون لیں۔ پھر اوپر کا چھلکا اتار کر ہڈی نکال دیں۔ پھر گاجر کے ٹکڑے کیجیے اور رات کو شبنم میں رکھ دیجیے۔ صبح بید مشک چھڑک کر شکر کے ہمراہ کھائیے۔ ہر قسم کے خفقان کے لیے مفید ہے۔

(۱۲) دبلا پن: گاجر کا ایک وصف یہ ہے کہ وزن بھی بڑھاتی ہے۔ چنانچہ سردیوں میں گاجر کا حلوہ کثرت سے استعمال کیجیے۔

(۱۳) عینک سے چھٹکارا: گہری سرخ گاجریں لے کر حسب ضرورت قاشیں بنالیں۔ اگر ہڈی ہے تو پھینک دیجیے۔ قاشوں پر تھوڑا سا کالی مرچوں کا سفوف اور نمک ملا کر چھڑکیے۔ پھر انھیں رات کو ایک صاف طشتری میں گرد و غبار سے پاک جگہ مثلاً چھت پر رکھ دیجیے تاکہ رات بھر گاجریں شبنم سے تر ہو جائیں۔ صبح نہار منہ شبنم آلود گاجریں بطور ناشتا کھالیں۔ بقایا ناشتا کچھ وقفے کے بعد کریں۔ یہ نسخہ بلاناغہ کم از کم ۴۰ روز استعمال کریں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عینک سے چھٹکارا مل جائے گا۔ جن کی نظر کمزور نہیں وہ بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

(۱۴) بہترین ناشتا: مطلوبہ مقدار میں گاجریں کدوکش کیجیے۔ حسب ضرورت انڈے لے کر گاجروں کے ساتھ پھینٹ لیں۔ پھر دودھ ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیے۔ میٹھا کرنے کے لیے بہتر ہے کہ شہد ڈالیے ورنہ چینی سے کام چل جائے گا۔ پھر گھر کے بچے سے لے کر بوڑھے تک اس کا ناشتا کریں۔ چاہیں تو پراٹھے، پھلکے یا ڈبل روٹی کے ساتھ کھا لیجیے۔ پورے موسم سرما میں اس کا استعمال جاری رکھیے۔ گاجروں کا ناشتا کرنے والے کا چہرہ سرخ، آنکھیں نور سے منور، دل و دماغ تازہ اور حافظہ تیز ہو جائے گا۔

(۱۵) کمی خون: اکثر نوجوان لڑکے، لڑکیاں کمی خون کا شکار رہتی ہیں۔ اگر وہ سال بھر گاجر کا مربا استعمال کریں تو اس مسئلے سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ نیز گاجر کا حلوہ، انڈوں کے ساتھ اور گجریلا بھی تناول کیجیے۔

(۱۶) چہرے کی رعنائی: گاجروں کا عرق مشین سے نکالیے۔ پھر اس کے برابر مقدار میں دودھ ملا کر چہرے پر لیپ کریں۔ ۱۰ منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو لیں۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ استعمال کرنے سے ان شاء اللہ چہرہ چاند سا روشن ہو جائے گا۔ صابن استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔

www.Paksociety.com

سیب کے ۱۰ طبی فوائد

موسم سرما کا ایک اور تحفہ سیب بھی ہے۔ گو ہمارے ہاں سارا سال ملتا مگر تازہ سیب سردیوں کی آمد کے بعد ہی آتا ہے۔ یہ قدرت کا وہ عظیم تحفہ ہے جو ہے تو پھل مگر کسی اچھے ڈاکٹر کی طرح اپنا کام بخوبی جانتا ہے۔

تازہ سیب میں ۸۴ر فیصد پانی ہوتا ہے اور باقی ٹھوس۔ اس میں زیادہ تر کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین ہوتے ہیں۔ سیب میں میلک تیزاب (Acid Malic) بھی ہوتا ہے۔ فاسفورس دیگر تمام پھلوں اور سبزیوں سے زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ سیب کا چھلکا اُتار دینا ایک بہت قیمتی جز پھینک دینے کے مترادف ہے۔ چھلکے میں وٹامن (سی) بڑی مقدار میں پائی جاتی ہے۔

فوائد

(۱) سردرد: ایک سیب کی قاشیں کر کے نمک چھڑکنے کے بعد نہار منہ کھائیے۔ تین چار روز کے استعمال سے پُرانا سردرد دُور ہو جائے گا۔

(۲) مقوی دماغ غذا: روزانہ نہار منہ ناشتا کے طور پر تین چار سیب کھا کر بعد میں دُودھ نوش فرمالیں۔ ازحد مقوی دماغ نسخہ ہے۔

(۳) ہونٹوں کا پھٹ جانا: سیب کے بیج بقدر حاجت خُوب پیس کر گاڑھا کیجیے اور سوتے وقت ہونٹوں پر لیپ کر کے سو رہیں۔ ان شاء اللہ صبح تک مرض کا نام ونشان نہ رہے گا۔

(۴) بھوک کا کم ہو جانا: سیب تُرش کا رس نکال کر اس میں آٹا گوندھ کر روٹی پکائیے اور ایک ہفتہ تک کھاتے رہیں۔ ان شاء اللہ کمیِ اشتہا کا مرض دُور ہو جائے گا اور بھوک پیدا ہوگی۔

(۵) قبض: رات سوتے وقت اور صبح نہار منہ تین چار سیب کھانا قبض کشائی کے لیے فائدہ مند ہے۔

(۶) نیند میں چلنا: آدھ کلو تُرش سیب لے کر پانی میں بھگو دیں۔ تمام رات بھیگنے دیں۔ صبح رس نکال کر استعمال میں لائیں۔ یہ نسخہ نیند میں چلنا دور کرتا ہے۔

(۷) بے خوابی کا علاج: ہر روز صبح ۳ر ماشے بہی دانہ پوٹلی باندھ کر ۳ر چھٹانک پختہ سیب کے رس میں جوش دیں اور ٹھنڈا کر کے پلائیں۔ ان شاء اللہ ۷ر دن کے استعمال سے بے خوابی کا مرض دُور ہو جائے گا۔

(۸) سیب کا حلوہ: اچھی قسم کے سیبوں کا چھلکا اور بیج دور کریں اور انھیں پانی میں پکائیں۔ جب پک جائیں تو چینی یا شہد ملا کر مزید پکائیں۔ مغز پستہ اور ورق لگا کر استعمال کریں۔ خوراک حسب ضرورت لیں۔ دل اور معدہ کے تمام امراض کے لیے مفید ہے۔

(۹) چست اور پھرتیلا: خالی معدہ صبح و شام سیب کھانا بدن کو چست اور پھرتیلا بناتا ہے۔

(۱۰) کدو دانے: سوتے وقت مریض کو ایک سیب کھلائیے اور بعد میں پانی نہ پینے دیں۔ ان شاء اللہ ایک ہفتے کے اندر اندر تمام کرم ہلاک ہو کر پاخانے کی راہ سے نکل جائیں گے۔ آسان نسخہ ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

ایجادات

دنیا بھر سے ورطہ حیرت میں ڈال دینے والی
نت نئی ایجادات کا تذکرہ جو انسانی زندگی
کو بہتر سے بہتر کرنے کا باعث بن رہی ہیں

سائنس کی دنیا

محمد شبیر عادل

www.paksociety.com

ڈرائیور کے بغیر چلنے والی گاڑی

۱۹۸۰ء کی دہائی میں امریکی ٹیلی ویژن سے ایک ڈراما سیریز ''نائیٹ رائیڈرز'' نشر ہوتی تھی۔ اس سیریز کی بے پناہ مقبولیت میں بنیادی کردار ایک حیرت انگیز کار کا تھا۔ ''کٹ'' نامی اس کار میں کئی حیران کن خصوصیات موجود تھیں۔ وہ کار کمپیوٹر کے ذریعے چلتی تھی۔ کٹ میں نصب کمپیوٹر مصنوعی انٹیلی جینس ٹیکنالوجی کے ذریعے اسے ڈرائیور کے بغیر بھی سڑکوں پر رواں رکھتا۔ کار کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر ازخود اپنی منزل پر پہنچ جاتی۔ کٹ کو ٹیلی ویژن اسکرین پر ڈرائیور کے بغیر محوِ سفر دکھانے کے لیے کاری گری استعمال ہوتی کیونکہ ایسی کسی گاڑی کا وجود ہی نہیں تھا جو بنا ڈرائیور چلتی ہو۔ تاہم آکسفورڈ یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے اب ''کٹ'' کو حقیقت کا روپ دے دیا۔

مذکورہ یونیورسٹی میں موبائل روبوٹکس کے شعبے سے منسلک سائنسدانوں نے ایک گاڑی کو ازخود چلنے والی (سیلف ڈرائیونگ) گاڑی میں بدل دیا ہے۔ تاہم اسے ڈرائیور بھی چلا سکتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر ڈرائیور چاہے تو گاڑی کو خودکار ڈرائیور کے سپرد کر کے مزے سے اپنی نیند پوری کر سکتا ہے۔ گاڑی اسی طرح اپنا سفر جاری رکھے گی۔ اس گاڑی کو جسے تحقیقی ٹیم نے وائلڈ کیٹ (جنگلی بلی) کا نام دیا، کئی طرح کی جدید ترین فنی مہارتوں سے لیس ہے۔

''وائلڈ کیٹ'' مکمل طور پر کمپیوٹر سے چلنے والی گاڑی ہے۔ سڑک اور اطراف پر نظر رکھنے کے لیے اس گاڑی میں وہی فنی مہارت استعمال کی گئی جو ڈرون طیاروں میں مستعمل ہے۔ ساتھ ہی طاقتور کیمرے بھی نصب ہیں۔ ''وائلڈ کیٹ'' میں انتہائی طاقتور کمپیوٹر موجود ہیں جو کیمرے، لیزر اور حساس ترین عدسوں سے حاصل ہونے والی معلومات یا ڈیٹا زیرِ عمل لاتے اور پھر اس ڈیٹا کی بنیاد پر فوری فیصلہ کرتے ہیں کہ گاڑی کی رفتار بڑھانی یا کم کرنی ہے، دائیں مڑنا ہے یا بائیں وغیرہ۔ حساس عدسوں اور کیمروں کے ذریعے مصنوعی انٹیلی جینس ٹیکنالوجی سے لیس کمپیوٹر گاڑی کے اطراف کے ماحول پر گہری نظر رکھتے اور پھر اسی مناسبت سے گاڑی چلاتے ہیں۔

وائلڈ کیٹ کی آنکھیں اور اس میں نصب عدسے دو طرح کے ہیں۔ چھت پر لگے حرکت پذیر سہ رخی لیزر اسکینر سے حاصل کردہ ڈیٹا کی مدد سے ایک کمپیوٹر گاڑی کے قرب و جوار کا سہ رخی نقشہ تشکیل دیتا ہے۔ گاڑی کے بمپر پر لگے لیزر اسکینر کی نظر سڑک اور اس کے اردگرد کے حصے پر ہوتی ہے۔ لیزر اسکینر کے علاوہ گاڑی کی چھت پر ایک اسٹیریو کیمرا بھی نصب ہے جو فی سیکنڈ میں انتہائی صاف اور واضح تصاویر کھینچتا ہے۔ ان تصاویر کی مدد سے گاڑی میں نصب کمپیوٹر اسی طرح فاصلے کا اندازہ اور گاڑی بڑھنے کی شرح کی پیمائش کرتا ہے جیسے انسان۔

وائلڈ کیٹ کا ایک کمپیوٹر اگلے حصے میں موجود ہے۔ اس کمپیوٹر کے کام کرنے کی رفتار عام ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر سے دو ہزار گنا زیادہ ہے۔ گاڑی کا دوسرا کمپیوٹر فرش میں ہے۔ یہی مرکزی کمپیوٹر ہے جو لیزر، اسکینرز اور کیمروں سے حاصل ہونے والی معلومات کے ذریعے گاڑی کے قرب و جوار اور سڑک کا نقشہ تشکیل دیتا اور پھر انہی معلومات کی روشنی میں گاڑی کی حرکت کی نگرانی کرتا ہے۔

''نائٹ رائیڈرز'' میں ڈراما سیریز کا ہیرو مائیکل نائٹ جب اپنی گاڑی کو کہیں پہنچنے کی ہدایت کرتا، تو وہ خودکار طور پر وہاں پہنچ جاتی۔ ''وائلڈ کیٹ'' میں یہ بھی خصوصیت موجود ہے۔ اس گاڑی کی تیاری پر تیس لاکھ ڈالر لاگت آئی ہے۔ آکسفورڈ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ''وائلڈ کیٹ'' کے تمام تجربات کامیاب رہے ہیں۔ تاہم اس گاڑی کی عام دستیابی کے لیے کئی برس کا عرصہ درکار ہوگا۔

www.paksociety.com

انسانوں پر نظر رکھنے والا ریڈار سسٹم

افغانستان میں اتحادی فوج پر ہونے والے حملوں، خصوصاً سڑکوں کے اطراف ہونے والے بم دھماکوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اتحادی اور امریکی افواج کے پاس ایسے حملے ناکارہ بنانے کے لیے ماہرین اور بم روک فوجی گاڑیوں کی بڑی تعداد موجود ہے، لیکن حملوں کا سدِباب کرنے کے لیے امریکہ ایسے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے، جس کی مدد سے انھیں ناکام بنایا جائے۔ اس حوالے سے امریکہ ایسے جدید نظام کو استعمال کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے، جو بظاہر ایک ریڈار ہے۔ اس کے ذریعے زمین پر ایسے افراد کو تلاش کرنا ممکن ہو گا جو مہلک دھماکا خیز مادوں (I.Eds) کی تنصیب کرنا چاہتے ہوں گے۔

اس نئے ریڈار نظام کو ویڈر (Vader) یعنی ''وہیکل اینٹی ڈسماؤنٹ ایکسپلائیٹیشن'' کا نام دیا گیا۔ یہ نظام ۲۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر محوِ پرواز کسی طیارے میں نصب ہو، تب بھی انتہائی باریک بینی سے زمین پر موجود ہر شخص پر نظر رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس منفرد ویڈر نظام کو تخلیق کرنے والا مشہور زمانہ ادارہ ''نارتھروپ گرومان'' ہے، جو طیارہ سازی اور میزائل سازی میں اہم مقام رکھتا ہے۔

یہ ریڈار نظام دو مختلف حالتوں میں کام کرتا ہے۔ اول اہداف کی بہت ہی صاف اور واضح تصاویر حاصل کرنے کے لیے، دوم بطور ریئل ٹائم گراؤنڈ موونگ انڈیکیٹر جو حرکت پذیر اہداف کی تلاش کا کام کرتا اور اس سے متعلق تمام معلومات بشمول بصری معلومات ہر لمحہ پہنچاتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ نظام گاڑیوں، افراد و جانوروں اور پانی میں تیرتے کسی بھی طرح کے جہاز تلاش کرنے کی صلاحیت کا بھی حامل ہے۔ دیکھیے کب یہ فتنہ پرور کھوجی میدانِ کارزار میں اترتا ہے۔

بائیوٹیکنالوجی کی اہمیت

پاکستان کے مشہور سائنسدان ڈاکٹر عطا الرحمن سادہ زبان میں حیاتی ٹیکنالوجی کے بارے میں یوں بتاتے ہیں:

حیاتی ٹیکنالوجی علم حیاتیات (بیالوجی) کا وہ شعبہ ہے جس میں مختلف خوردبینی اجسام (Living Organisms) کو صحت، زراعت، ماحول اور دیگر متعلقہ شعبوں میں انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حیاتی انجینئرنگ کے شعبے میں حیاتی ٹیکنالوجی کے استعمال سے تجارتی اہمیت کی حامل مصنوعات حاصل کرنے میں کافی کامیابی ہوئی ہے۔ آج دنیا بھر کی تقریباً ۲۰ فیصد ادویات حیاتی ٹیکنالوجی طریقہ کار کے استعمال سے حاصل کی جاتی ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سال ۲۰۳۰ء تک اس سے ۵۰ فیصد ادویات پیدا ہوں۔ مثال کے طور پر ذیابیطس کے مریضوں کے لیے بنائی جانے والی انسولین حیاتی ٹیکنالوجی طریقہ کار کے تحت بنتی ہے۔ جینیاتی طور پر تبدیل کردہ نامیات (Organisms) کو بہت سی جراثیم کش (اینٹی بائیوٹک) ادویات بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ہیومن جینوم پروجیکٹ اپنے تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ اس طریقہ کار سے ان وجوہ کا پتا چلایا جا سکے گا جو انسانوں میں موروثی بیماریاں منتقل کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ ہر سال ہزاروں لوگ دواؤں کے نقصان دہ ردِعمل کی وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس نقصان سے بچاؤ کے لیے ذاتی طب (Personalized Medicine) کے نام سے ایک نیا شعبۂ صحت متعارف کیا جا رہا ہے تاکہ انسانی آبادی کی مختلف قومیتوں کی جینیاتی ساخت (Genetic Profile) مدِنظر رکھتے ہوئے موزوں ادویات بنائی جا سکیں۔

حیاتی ٹیکنالوجی کے ذریعے زراعت کے شعبے میں زیادہ غذائیت اور بہتر معیار کی نئی فصلیں متعارف کروائی جا رہی ہیں۔ ان فصلوں میں ماحولیاتی اثرات اور مختلف مضر حشرات کا مقابلہ کرنے کی بہتر صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پلانٹ ٹشو کلچر کے طریقہ کار کو استعمال کرتے ہوئے اب ہمیں بیجوں کی ضرورت نہیں رہتی، ہم بیجوں

www.paksociety.com

انسانی دماغ کی نقل: سیکھنے والی چپ

۶ سال کی انتھک محنت، کثیر سرمایہ کاری کی بدولت اب آخرکار امریکی ادارے آئی۔ بی۔ ایم کے تحقیق کاروں نے دو ایسی سلیکان مائیکرو سلیکان مائیکرو چپس بنالی ہیں جو اپنی ساخت کے لحاظ سے ''مماثل دماغ'' ہیں۔ یعنی ان کے کام کرنے کا انداز دماغ جیسا ہے۔ ان چپس کی موٹائی محض ۴۵ اعشاریہ ۴۵ نینو میٹر ہے اور انھیں متعدد برقیروں کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ ان برقیروں کو جدید انداز میں اس طرح ترتیب دیا گیا کہ یہ جانوروں کے دماغی اعصابیوں کے سروں کی ہو بہو نقل ہیں۔ دونوں چپس میں ۲۵۶ ڈیجیٹل اعصابیے ہیں اور انھیں ۱۰ میگا ہرٹز فریکوئنسی پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک چپ پر ۲۶۲،۱۴۴ پروگرام ایبل سائی نیپسز ہیں جبکہ دوسری پر ۶۵،۳۵۶ ارکسایل سائی نیپسز سموئے گئے ہیں۔

اپنی ساخت اور کام کے اعتبار سے دماغ جیسی خصوصیات رکھنے والی (مماثل دماغ) چپس کو تصاویر اور ویڈیوز کے تجزیے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی مدد سے حقیقی وقت میں موسم کی صورت حال کا بھی جائزہ لینا ممکن ہے۔ آئی۔ بی۔ ایم کی یہ پیش رفت اہم ہے۔ اس کی مدد سے کمپیوٹر کنٹرولڈ ٹریفک سگنلز، ایئر ٹریفک کنٹرول اور مختلف خودکار اشیا کا نیا دور شروع ہوگا۔

کے بغیر ہی بہت سے پھل اور پھولوں کی افزائش کر سکتے ہیں۔ جینیاتی طور پر تبدیل کی گئی ایسی فصلوں کی افزائش ہو رہی ہے جو اندرونی طور پر خود کو جراثیم سے بچانے کی بہتر صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کی ایک مثال جی۔ ٹی کاٹن (G.T. Cotton) کی ہے۔ ہر سال دنیا بھر میں وٹامن اے کی کمی سے بچوں میں قوت بصارت سے محروم ہونے کی تعداد تقریباً ۵ لاکھ ہے۔ بچوں کو اس بیماری سے بچانے کے لیے حیاتی ٹیکنالوجی کی مدد سے چاول کی ایک نئی قسم گولڈن رائس (Golden Rice) کاشت کی گئی ہے جس میں وٹامن اے بکثرت موجود ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں جن کے ذریعے زراعت، صحت، ماحول اور میٹریل سائنس کے شعبوں میں حیاتی ٹیکنالوجی نے جدت کے ساتھ ساتھ بہتر طریقوں کو متعارف کروایا ہے۔

پاکستان میں یہ علمی شعبہ نظرانداز کیا جا رہا ہے جبکہ ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے حیاتی ٹیکنالوجی کے شعبے میں شاندار ترقی کی ہے۔ بھارت یہ جان چکا کہ غربت میں کمی لانے اور ترقی کا راز علم وفن پر استوار معیشت (Knowledge Economy) میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حیاتی ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کے لیے پوری توجہ دے رہا ہے۔

ملیریا کے جرثومے کا طریقۂ واردات

ملیریا جرثومہ انسان کا ایک بڑا اور چالاک دشمن ہے۔ ہر سال ۳۰ کروڑ افراد ملیریا کا شکار ہوتے ہیں جبکہ ۱۰ لاکھ افراد ہلاک ہو جاتے ہیں جن میں زیادہ تعداد افریقا میں صحرائے صحارا کے بچوں کی ہے۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں ملیریا سے بچاؤ کی دوا بنانے کے لیے تحقیقات کا سلسلہ کافی عرصے سے جاری ہے۔ کیمبرج میں سانگر انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انھوں نے دریافت کرلیا کہ ملیریا کا جان لیوا جرثومہ کس طرح خون کے سرخ خلیوں میں داخل ہوتا ہے۔ سائنس دانوں نے اُمید ظاہر کی ہے کہ یہ دریافت ملیریا کے علاج کے لیے بنائی جانے والی دوا مزید بہتر بنائے گی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ اس دریافت سے کافی حیران اور متاثر ہوئے ہیں۔ سائنس دانوں کے مطابق جرثومہ پلازموڈیم

فیلسپیرم فضلتی نظام کو دھوکا دے کر بچ نکلنے میں غیر معمولی طور پر ماہر ہے۔ یہ مچھر کے کاٹنے کے بعد ۵ منٹ میں جگر میں چھپ جاتا اور بعد میں نکل کر خون کے سرخ خلیوں کو متاثر کر کے پھیلتا ہے۔

بھارت کی جنگی تیاریاں

بھارت آج کل بُری طرح جنگی جنون میں مبتلا ہے۔ بھارتی فوج کی جانب سے میزائل تجربات کا سلسلہ جاری ہے۔ بھارتی ذرائع ابلاغ کے مطابق اگنی ۴ میزائل کا تجربہ مشرقی ریاست اڑیسہ میں کیا گیا۔ اس میزائل کی زیادہ سے زیادہ مار ۴ ہزار کلو میٹر ہے۔ میزائل کی لمبائی ۲۰ میٹر، قطر ایک میٹر اور وزن ۱۷ ٹن ہے۔ میزائل کو بہ آسانی ایک سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ بھارت اگنی سیریز کے مزید تجربات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو ۳ ہزار کلو میٹر تک اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکے۔

بھارت کی جانب سے ۱۹۸۰ء کی دہائی سے میزائل تجربات کا آغاز کیا گیا۔ بھارت میں انٹی گریٹڈ میزائل ڈویلپمنٹ پروگرام کے تحت اگنی سیریز پر کام جاری ہے۔ بھارت رواں سال کے آخر تک اگنی ۵ بلیسٹک میزائل کے تجربے کی تیاری میں مصروف ہے اور حالیہ میزائل تجربات درحقیقت اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اگنی ۵، ۵ ہزار کلو میٹر تک اپنے ہدف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت کا حامل ہوگا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ بھارت کی جانب سے میزائل تجربات اپنی ایٹمی صلاحیت مزید بہتر بنانے، خطے میں برتری اور پاکستان کو موجودہ حالات میں دباؤ میں لانے کی کوشش ہے۔

بھارتی فضائیہ نے ارودھرا (Arodhra) ریڈار نظام راجستھان اور گجرات میں پاکستانی سرحد کے قریب نصب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ریڈار نظام بھارتی ادارے ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن نے اسرائیل کی مدد سے تیار کیا ہے۔

بھارت زمینی اور فضائی نگرانی کے نیٹ ورک کو منسلک کر کے سرحدی حدود کی جاسوسی و نگرانی کی صلاحیت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں بھارتی فوج نے اپنی جنگی صلاحیت بڑھانے اور دفاع مضبوط بنانے کے لیے اسرائیل سے ۳ر اواکس طیارے خرید کر فضائیہ میں شامل کیے ہیں جن سے زندہ تصویر، آواز اور نقل و حمل کو دیکھا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ نگرانی کے مزید آلات شامل کیے جائیں گے جس سے بھارت کا زمینی اور فضائی جاسوسی کا نیٹ ورک مضبوط ہو جائے گا۔

لمبی عمر کی وجہ صحت مند طرزِ زندگی نہیں

ایک نئی تحقیق کے ذریعے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جو لوگ ۱۰۰ سال زندہ رہتے ہیں، اس کی وجہ طرزِ زندگی نہیں بلکہ اصل کردار جینیاتی کا ہے۔ امریکن گیریاٹرک سوسائٹی کی ایک تحقیق کے مطابق جو لوگ ۱۰۰ سال زندہ رہیں، وہ بھی باقی لوگوں کی طرح غیر صحت مند خوراکیں کھانے اور شراب اور سگریٹ نوشی میں مبتلا رہے ہوتے ہیں۔

تحقیق کا اہتمام نیویارک کے البرٹ آئن سٹائن کالج آف میڈیسن نے کیا۔ دورانِ تحقیق اسرائیلی محققین نے یہودیوں کے اشکنازی قبیلے کے ۴۷۷ یہودیوں کا تجزیہ کیا جنھوں نے ۹۵ سے ۱۱۲ سال کی عمر پائی تھی۔ تحقیق کے مطابق ان افراد نے کوئی صحت مند زندگی نہیں گزاری۔ ان میں زائد الوزنی کا مسئلہ بھی تھا اور وہ سگریٹ نوشی کرنے کے علاوہ کم ورزش کی خرابی سے بھی دوچار تھے۔ ان کی خوراک بھی عام تھی۔ چنانچہ ان میں زائد العمری کی وجہ رویوں اور طرزِ زندگی سے زیادہ جینیاتی تھی۔

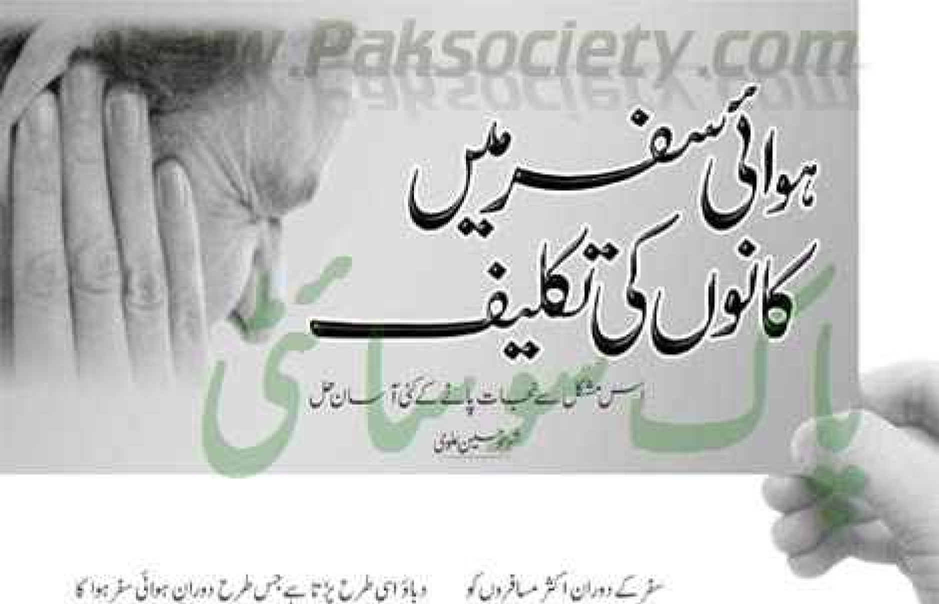

ہوائی سفر میں کانوں کی تکلیف

اس مشکل سے نجات پانے کے کئی آسان حل

[illegible] حسین علوی

ہوائی

سفر کے دوران اکثر مسافروں کو کانوں میں تھوڑی بہت تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس بیماری کو اصطلاحاً انگریزی میں ائیر پلین ائیر (Air Plane Ear) ائیر بیروٹراما (Ear Baro Trauma) یا بیرو ٹائٹس میڈیا (Baro Titis Media) کہتے ہیں۔ اس خلل کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سفر کے دوران کان کے پردے اور کان کے دیگر اعضاء پر ہوا کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ یہ تکلیف عموماً تب لاحق ہوتی ہے جب جہاز اوپر اٹھ رہا یا نیچے اتر رہا ہوتا ہے۔ سفر کے دوران بلندی میں تبدیلی کی وجہ سے ماحول میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہی تبدیلی کان پر بُرے اثرات ڈالتی ہے۔

اس وقت کان کے درمیانے حصے میں ہوا کا دباؤ صحیح طریقے سے مرتب نہیں ہوتا۔ ایک کان میں درد ہوتا ہے، سماعت کم ہو جاتی ہے، یا دونوں کان بند ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔ ہوائی سفر کے دوران یہ تکلیف ایسی ہی ہے جو غوطہ خوروں کو گہرے پانی میں نہاتے محسوس ہوتی ہے۔ گہرے پانی میں نہاتے ہوئے بھی کانوں میں پانی کا دباؤ اسی طرح پڑتا ہے جس طرح دوران ہوائی سفر ہوا کا دباؤ، کوئی بھی ایسی بیرونی تبدیلی جو کان کے درمیانی حصے میں معمول کی کارکردگی پر اثر انداز ہو، خلل پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اس کی علامات ناک کا بند ہونا، الرجی، فلو اور گلے کی خرابی ہیں تاہم ان وجوہ کی بنا پر سفر ملتوی نہیں کرنا چاہیے۔

ان خرابیوں سے بچنے کے لیے ۳۰ منٹ تا گھنٹہ بھر سفر سے پہلے ہوائی نالیاں کھولنے والی گولیاں استعمال کیجیے۔ جہاز سے اترنے سے پہلے بھی یہ دوا کھائیے۔ لیکن اگر آپ دل کے مریض ہیں، فشارِ خون زیادہ ہے یا پہلے سے کوئی دوا کھا رہے ہیں تو اپنے ڈاکٹر کے مشورے سے اس قسم کی ادویات استعمال کیجیے۔ ہوائی سفر کے دوران کینڈی یا چیونگم چبائیں۔ جہاز کے اوپر چڑھتے اور نیچے اترتے وقت سونے سے احتراز کریں۔ منہ کو بند کر کے کان، منہ اور نتھنے بھینچیں۔ خاص طور پر بنے ہوئے فلٹرڈ ائیر پلگ استعمال کریں۔ یہ ائیر پلگ میڈیکل اسٹور اور ہوائی اڈے پر واقع تجارتی مراکز سے مل جاتے ہیں۔ خود بھی اور بچوں کو بھی پانی اور دیگر مشروبات پلائیں۔

www.Paksociety.com

پرندوں کی دنیا

خاص و عام کی نظروں میں سما جانے والا!!!

میاں مٹھو

پہلے انسان طوطا چشم ہوتے تھے،
اب طوطے انسان چشم ہوتے جا رہے ہیں

ڈاکٹر محمد وسیم صدیقی

طوطے

کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ اس کی بعض باقیات تقریباً ۵ر۷ کروڑ سال پرانی ملی ہیں۔ سکندر اعظم دنیا سے تو خالی ہاتھ گیا لیکن ہندوستان سے واپسی پر طوطا ساتھ لے گیا۔ ایک طوطے کا نام اسی سے منسوب ہے۔ اس طرح یورپ کو طوطا روشناس کرانے کا سہرا سکندر اعظم کے سر ہے۔

روم کے کلاسیکی شعرا نے طوطا پرستی کی۔ ایک رومی بادشاہ اپنے شیروں کو طوطے کا گوشت کھلاتا تھا۔ مہمانوں کی تواضع ان کی زبان سے کرتا۔ کھانے میں طوطے کا گوشت مرغوب غذا تھی۔ رومی سلطنت کا زوال اور طوطے کا منظر عام سے غائب ہونا ساتھ ساتھ ہوا۔ پندرھویں صدی میں یہ دوبارہ منظر عام پر آیا۔

یورپی جہازران چاہے ایسٹ انڈیز جائیں یا مغربی افریقہ یا بحرِ اوقیانوس کے جزائر، طوطا ان کے ساتھ ہوتا۔ وحشی قبائل تک طوطا پالتے تھے۔ طوطا پالنے کا ذکر ابتدائی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ قدیم مصری گلابی چھلّے دار طوطا شوق سے پالتے تھے۔

طوطا خاندان ۳۷۰ر اقسام پر مشتمل ہے۔ انگریزی ادب میں اس کے نام پیرٹ (Parrot) اور پیرا کیٹ (Para Keet) ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ عام گلابی چھلّے یا گھنٹی دار طوطا ہے۔ اس کے علاوہ کیکاٹو (Cacktoo)، کی آ (Kea)، لوری (Lory)، لوبرڈ (Lovebird) اور میکا (Macaw) بھی شامل ہیں۔

طوطے کی ساخت اللہ تعالیٰ کی صناعی حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ اول چونچ سے یہ جوار بھی اور دوسرے اجناس کھاتا ہے۔ میوہ دار پھل بھی مرغوب غذا ہے۔ پنجوں کو ٹہنیوں پر مستحکم کرکے جھکتا اور چونچ سے پھل کا گودا نکال کر کھاتا ہے۔ کھانے سے زیادہ ضائع کرتا ہے۔ طوطوں کے ننھے میاں صرف ۸۳ر ملی میٹر اور وزن ۱۰ ر سے ۱۵ ر گرام چھوٹا طوطا "بونا پیلے چہرہ والا طوطا" (Buff-Faced Pygmy Parrot) ہے۔ سب سے بڑا پہلوان جس کی لمبائی ہوا تین فٹ تک ہوتی ہے "میکا" (Macaw) ہے۔

نیوزی لینڈ کا، کاکاپو یا اُلّو طوطا Kakapo Parrot یوں دلچسپ اور منفرد ہے کہ بے چارہ اڑنے سے معذور ہے۔ پَر تو ہیں مگر طاقت پرواز نہیں رکھتے کہ سینے کی وہ ہڈی جس پر عضلات منسلک ہوتے ہیں، ان سے محروم ہے۔ یہ عام طوطوں سے بھاری ہوتا اور رات کو متحرک رہتا ہے۔ خوراک کا انداز بھی دلچسپ ہے۔ تنے یا پتے سے رس نکال کر پیتا ہے۔

انڈے دینے کا موسم آیا، تو نر نے اپنے ہوائی جھولوں کو پھلا کر مادہ کو لبھانا اور رعب ڈالنا شروع کیا۔ لیکن گھونسلے بنانے یا گھر آباد کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔

سنہری شانے والا طوطا (Golden Shouldered Parrot) کافی دلچسپ اور عنقا ہے۔ یہ آسٹریلیا میں جھاڑ جھنکاڑ کے جنگلات میں دیمک کے ٹیلوں میں رہتا اور زمین سے بیج چگتا ہے۔

اگر رنگوں کی بہار دیکھنی ہو تو آسٹریلین لوری کیٹ میں دیکھیے۔ گروہ میں رہتے اور قوسِ قزح کا منظر پیش کرتے ہیں۔ بعض جگہوں ہزاروں کی تعداد میں رہن بسیرا کرتے ہیں۔

لٹکنے والے طوطے لوری اور لوری کیٹ کی خوراک پھولوں کا رس اور زردانے ہے۔ استفادے کے لیے ان کی زبان برش کی طرح ہوتی ہے۔

کی آ (Kea) نیوزی لینڈ کا سبز رنگ کا طوطا ویسے تو پھل اور پودوں کی جڑوں کو کھاتا ہے۔ شاید خوراک نہ ملنے پر اس نے بھیڑوں کے فضلوں کو خوراک میں شامل کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھیڑ پر حملہ کرکے گردوں کے گرد جمع چربی سے اپنے دسترخوان کو سجایا۔ لہٰذا بھیڑ کے چرواہوں کا نشانہ بن کر اپنی آبادی میں کمی کا باعث بنا۔ سچ ہے لالچ بُری بلا ہے۔

کھانے کا ذکر آیا تو آسٹریلوی ریاست نیو کوئنز لینڈ اور نیوگنی کے پام کوکٹو (Palm Cackato) کی مہارت

اور ذوق کا بھی ذکر ہو جائے یہ حضرت بڑی مہارت سے ناریل توڑ لیتے اور گھول کر کھاتے ہیں۔

بھانت بھانت کے دلچسپ طوطوں کا ذکر تو ہو گیا، ان کے سحر میں ہم ایسے کھوئے کہ اپنے عزیز طوطوں کا ذکر بھول گئے۔ بقول فارسی کہاوت "اول خویش بعد درویش" اب اپنے طوطوں کی طرف آتے ہیں۔ طوطا شناسی برصغیر میں کافی پرانی ہے۔

انگریز ماہر حیوانیات سٹورٹ بیکر (Stuart Baker) نے ۹۰ اقسام اور کئی ذیلی اقسام کے طوطوں کو بیان کیا لیکن اس میں موجودہ برما اور سری لنکا کے طوطے بھی شامل ہیں۔ یہ قریباً ۹۰ سال پرانی بات ہے۔

"پاکستان کے پرندے" ٹی۔ جے۔ رابرٹس (T.J. Roberts) کی تصنیف ہے۔ اگر آپ طیور شناس بننا چاہتے ہیں تو یہ کتاب مفید ثابت ہو گی۔ ان کے مطابق ہمارے ملک میں ۴ اقسام کے طوطے پائے جاتے ہیں۔

سکندری یا بڑا ہندوستانی پیراکٹ

یہ ہندوستانی طوطوں میں سب سے بڑا ہے۔ مضبوط چونچ، لمبی دم، گھاسی سبز رنگ، نر میں کالے رنگ کا گردنی چھلا آسانی سے شناخت ہو سکتا ہے۔ وہ مری، مرگلہ، مل، ملتان، ساہیوال کے علاوہ تھوڑی تعداد میں سندھ میں سکھر اور ایرو۔ خیبر پختونخوا میں کوہاٹ میں خال خال ملتا ہے۔ بلوچستان میں نہیں دیکھا گیا۔ تجارت کے لیے اس کی بڑی مانگ ہے۔ اس کے باوجود تعداد میں ابھی کمی نہیں ہوئی۔ کلیوں اور پھلیوں کے بیج کو مضبوط چونچ سے توڑ کر کھاتا ہے۔ امرود، سنگترے بھی چٹ کر جاتا ہے۔ پھولوں کی پتیاں اور ان کا رس بھی مرغوب ہے۔

گلابی چھلے دار طوطا

گھاسی سبز رنگ، لمبی دم اور نر میں گلابی یا سرخ چھلا اس کی شناخت ہے۔ سندھ طاس میں پایا جاتا ہے۔ مری کی ترائی، کوئٹہ، کوہاٹ میں بھی ملتا ہے۔ البتہ صحرا اس نہیں آتا کیونکہ پھل اور سبزہ ناپید ہے۔ ایک بار موٹ کے علاقے میں ۳ ہزار سے زیادہ مکئی کی فصل پر دھاوا بولتے نظر آئے۔ رات کو جہاں رین بسیرا کریں، شور مچاتے ہیں۔ اگرچہ اجناس خور ہیں لیکن ہر طرح کے پکے پھل اور پھولوں کا رس بھی چوستے ہیں۔ کھانے کا انداز بھی دلچسپ ہے۔ بیج کی پھلی توڑ درخت پر بیٹھ آرام سے پیر میں پکڑ کر منہ میں لے جاتے ہیں۔

نشانچی

جنگ کوریا میں امریکی ڈویژن کا کمانڈنگ جنرل ایک روز فوجی معائنے کے لیے نکلا ہی تھا کہ قریب کی پہاڑی سے دشمن کے کسی سپاہی نے یکے بعد دیگرے ۳ فائر کیے۔ گولیاں سنسناتی ہوئیں جنرل کے اوپر سے گزر گئیں۔ جنرل بدحواس ہو کر مورچے میں کود گیا جہاں ایک سارجنٹ بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔

"اس شخص کا پتا لگاؤ جس نے گولی چلائی۔" جنرل نے حکم دیا۔

"جناب! ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔" سارجنٹ نے سکون سے جواب دیا۔

"پھر تم نے اسے گولی کیوں نہیں ماری؟" جنرل غصے سے چلایا۔

نوجوان سارجنٹ نے جنرل کو بے وقوف سمجھ کر اسی لہجے میں جواب دیا "یہ آدمی تقریباً ۶ ہفتے سے ہم پر گولیاں چلا رہا ہے لیکن آج تک وہ ہمارے کسی آدمی کو ہلاک نہیں کر سکا۔ ہم نے محض اس ڈر سے اسے مارنے کی کوشش نہیں کی کہ دشمن بعد میں کسی ایسے شخص کو نہ بھیج دے جس کا نشانہ ہو اچھا ہو۔"

(شیخ عمیر طارق، ملتان)

ان کا خوش رنگ ہونا، شور مچا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا ہمیں بھاتا ہے لیکن ان کی نسل دشمنی کسی کو نہیں بھاتی۔ درختوں کی کھوہ، عمارات کے کونے کھدروں میں فروری سے اپریل تک گھونسلا بنا کر ۵ ؍ تک انڈے دیتے ہیں۔ ۲۵ ۔ ۲۸ ؍ دن میں چوزے نکل آتے جنہیں والدین چوگ دیتے ہیں۔

غنچے سر پیراکیٹ

پاکستانی طوطوں میں یہ سب سے چھوٹے ہیں۔ محدود تعداد میں مری کی ترائی، جہلم، سیالکوٹ، سالٹ رینج، لاہور اور اسلام آباد میں ملتا ہے۔ پھل خور لیکن پھولوں کا رس بھی چوستا ہے۔ سرخ مرچ، خوبانی، بیر اور جنگلی انجیر بہت بھاتا کھا جاتا ہے۔ پرندوں کے خالی گھونسلے میں ۵ ؍ انڈے دیتے ہیں۔ گلابی دھاری پیراکیٹ اور مینا سے گھونسلے کو محفوظ رکھتے ہیں۔

سلیٹی سر پیراکیٹ

گلابی دھاری والے جیسا اور گہرا سبزی مائل رنگ، سر سلیٹی اور دم اڑتے وقت پیلی نظر آتی ہے۔ یہ پہاڑی طوطا ہے۔ ۷ ؍ سے ۸ ؍ ہزار فٹ کی بلندی پر چترال، کاغان، سفید کوہ میں ملتا ہے۔ سردیوں میں اتر کر مارگلہ پہاڑی تک آجاتا ہے۔ جنگلی پھول اور بیج اور پھلوں کے موسم میں سیب، ناشپاتی اور مکئی کھاتے ہیں۔ سخت جان ہیں، جب جنگلات برف سے ڈھکے ہوں تو زندہ رہتے ہیں۔

کیا بڑے کیا بچے طوطا شوق سے پالتے ہیں۔ سنہری مچھلی (گولڈ فش) کے بعد طوطا پالنا سب سے زیادہ عام ہے۔ بحری قزاق اپنی بیساکھی والی ٹانگ اور ایک آنکھ پر پٹی کے ساتھ کندھے پر طوطا بٹھائے نظر آتے ہیں۔ کولمبس ازابیلا ملکہ اور فرڈی نینڈ کے دربار میں ہاتھ پر طوطا بٹھائے پیش ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امریکا دریافت کرنے میں حضرت طوطا کا بھی کردار ہے۔ کچھ طوطے اڑتے ہوئے گئے جس سے خشکی آنے کی نشان دہی ہوئی۔

ہمارے بادشاہ اور نواب بھی طوطا قدردانی میں کسی سے کم نہیں۔ نظام حیدرآباد دکن کا زمرد، لعل اور یاقوت سے مزین ۱۸ ؍ ویں صدی کا طوطا ہیروں سے مجسم اکتوبر ۲۰۱۰ء میں نیلامی کے لیے پیش کیا گیا جس کی ابتدائی بولی ۴ سے ۶ ؍ لاکھ پونڈ تھی۔

طوطا عوام دوست بھی ہے۔ ۱۹ ؍ ویں صدی میں ایک گاؤں کے لوگ خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ طوطوں نے اتنا شور مچایا کہ لامحالہ گاؤں کے باشندوں نے ان سے نجات پانے کے لیے جنگل کا رخ کیا۔ طوطے بے چارے انھیں حملہ آوروں سے ہوشیار کر رہے تھے۔ اس طرح گاؤں والے محفوظ رہے۔

طوطوں میں رنگوں کی بہار ملتی ہے۔ نیلے، پیلے، سبز، سفید، کالے غرض کون سا رنگ ہے جس سے اس کے پروں کو قدرت نے نہیں نوازا۔ اتنے سارے رنگ ہوں اور خواتین اس سے اپنی سجاوٹ میں اضافہ نہ کریں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ٹوپی میں طوطا پر لگانے سے لے کر ۱۷۰۰ء میں لباس پہ پروں کا استعمال شروع ہوا۔ بعض خواتین سر پہ پورا حنوط شدہ طوطا سجا لیتیں۔ تقریبات، تحفے تحائف، سجاوٹ، لباس، پنکھے، بوہائی، دستانے غرض ہر جگہ "فیشن" اتنا مقبول ہوا کہ ۱۸۸۰ء میں اور اس کے ہر سال بعد ۵۰ ؍ لاکھ طوطے پروں کے لیے قتل کیے جانے لگے۔ ایک شخص کے مطابق صرف طوطے ہی نہیں بلکہ اس نے ہیٹ میں ۴۰ ؍ اقسام کے پرندوں کے پر دیکھے۔ اس طرح ۱۸۹۰ء تک پرندوں کو مارنا قتل عام ٹھہرا۔

طوطوں پر مزید آزمائش ان کی پھلوں، اجناس، بیج کے لیے رغبت ثابت ہوئی۔ طوطے سیب، ناشپاتی، آم، ٹماٹر، مرچ، سورج مکھی، سرسوں کے باغات اور کھیت تباہ و برباد کرتے ہیں۔ پاکستان اور دوسرے ممالک میں یہ تباہی ۸۰ ؍ فیصد تک ہوتی ہے۔ ارجنٹائن کی حکومت طوطے کے پروں کی جوڑی لانے پر انعام دیتی ہے۔ طوطوں کو ڈرانے بھگانے کے لیے زمیندار ملازم رکھتے ہیں۔

طوطا ایک عقل مند پرندہ ہے۔ طوطے انسان کے کہے

www.paksociety.com

نرسنگ کی بانی کا المیہ

فلورنس نائٹ انگیل نرسنگ کی بانی تھی۔ وہ ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئی۔ اس نے تو جوانی میں ہسپتالوں کو بہتر بنانے کی باقاعدہ مہم چلائی اور نرسنگ کو باقاعدہ پیشہ بنا دیا۔ اس کام میں اس نے ساری دنیا میں شہرت حاصل کی اور آج تک اس کا نام زندہ ہے۔

اس کی عمر ۳۶ برس ہوئی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اس وقت دل کا معاینہ کرنے کے لیے ای سی جی وغیرہ کوئی مشینی انتظام نہیں تھا، تاہم ڈاکٹر اسٹیتھو سکوپ اور علامات سے پتا چلا لیتے تھے کہ دل ٹھیک ہے یا کسی مرض میں مبتلا۔ ڈاکٹروں نے نائٹ انگیل کو یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ وہ دل کے کسی مرض میں مبتلا نہیں لیکن وہ قائل نہ ہوئی۔ یہی کہتی رہی کہ کوئی بھی لمحہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو سکتا ہے۔

اس نے اپنی حالت اتنی بگاڑ لی کہ بستر پر لیٹ گئی اور باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ کہتی تھی کہ کسی بھی وقت اس کی حرکت قلب بند ہو جائے گی۔ آخر ایک روز اس کی حرکت قلب بند ہو گئی، لیکن تب تک اس کی عمر ۹۰ برس ہو چکی تھی۔ (تسنیم، لاہور)

الفاظ دہرا لیتے ہیں۔ بعض اقسام کو بولنا سکھایا جائے، تو وہ بالکل ہماری طرح بولنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایلکس (Alex) نامی ایک افریقی بھورے طوطے کو چیزوں کی شناخت، انھیں بیان کرنا، شمار کرنا اور یہاں تک کہ سوالات کا جواب دینا مثلاً کسی چیز میں لال خانوں کو ۸۰ فیصد تک صحیح بتا دینا سکھایا گیا۔

ایک اور افریقی طوطا ''ن کسی'' (N'Kise) ایک ہزار الفاظ پر مشتمل حافظہ رکھتا تھا۔ وہ الفاظ تخلیق کر سکتا اور الفاظ کا استعمال اس کے صحیح تناظر اور فعل (Tense) میں کرتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ طوطا ادبیات کا استاد یا پروفیسر ہو سکتا ہے۔ طوطے بے چارے بولنے میں پھسڈی اس لیے رہ گئے کہ ان کی گلے میں حنجرہ (Vocal Cord) نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ وہ سانس کی دو شاخہ نالی سے ہوا کا اخراج کر کے آواز نکالتے ہیں۔

اس وقت طوطوں کی ۷۰ سے زیادہ اقسام معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ کیرولائنا کا پیراکیٹ امریکہ کا واحد مقامی طوطا تھا۔ جب ناشپاتی، انگور اور بھوسے کا دشمن ہوا تو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ آبادی کم ہوتے ہوتے صرف ایک جوڑا امریکا کی ریاست سن سنائی کے چڑیا گھر میں لایا گیا تا کہ نسل کشی ہو سکے لیکن بوڑھے ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ۳۰ برس ساتھ رہنے کے بعد انکاس (Incas) اور لیڈی جین (Lady Jane) نامی جوڑا داغِ مفارقت دے گیا۔ لیڈی جین کی وفات ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ انکاس ۲۱ فروری ۱۹۱۸ء کو راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ آج عبرت کے طور پر وہ چڑیا گھر میں حنوط شدہ موجود ہیں۔

طوطوں کی بربادی کا ایک اور سبب ان کے رہن بسیرے درخت کاٹ کر تباہ کرنا ہے۔ یہاں تک کہ جنوبی افریقا کے بارانی جنگلات (Rain Forest) صرف ۴۰ فیصد رہ گئے ہیں۔ بلی، چوہے، سانپ، نیولے، خرگوش، بکری بھی طوطا دشمن ہیں۔ آب و ہوا کی تبدیلی، آلودگی، کیڑے مار دوا مزید کمی کا باعث ہیں۔ طوطوں کو پکڑنا، تجارت کرنا بھی طوطوں کی کمی کا سبب ہے۔

طوطا شوق سے پالیے مگر ''طوطا بیماری'' سے ہوشیار رہیں۔ یہ طوطے سے انسان کو لگ سکتی ہے۔ طوطا اور انسان کا ساتھ ہو اور وہ ہمارے شعر و ادب میں چاشنی نہ ڈالے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ طوطا چشم، طوطے اڑ جانا، طوطے کی طرح آنکھ پھیرنا، طوطے کی طرح رٹنا یا پڑھنا، طوطی بلوانا، طوطا کہانی وغیرہ محاورے عام ہیں۔

شیخ سعدی کی حکایت ہے ''طوطے کو گنجے فقیر کی طرح سمجھنا۔'' ابن انشا فرماتے ہیں ''طوطا بڑا خوبصورت جانور ہے۔ بعض طوطوں میں انسان کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آنکھیں پھیر لینا، خصوصاً مطلب نکل جانے کے بعد طوطے آپس میں کہتے ہیں کہ کیسا انسان چشم ہے۔''

www.Paksociety.com

ایک خط
ایک ان دیکھا
احساس

قیدی نمبر ۶۵۰

ایک ماؤں کا تذکرہ، اس کو یاد کرنے والوں کی آواز بڑی توانا ہے
معتدل شہزادیاں جس مختصر کو ناواقف سی تھیں
کیا قیدی نمبر ۶۵۰ مثل مختصر اعصاب پر سوار ہے

افشاں نوید، کراچی

اُردو ڈائجسٹ ماہ نومبر کا شمارہ پڑھتے پڑھتے صفحہ ۱۰ پر پہنچی تو پھر آگے نہ پڑھ سکی۔ بابیہ پر لکھے گئے افسانے کا حصہ تھا یہ صفحہ نظروں کے سامنے حجاب بن گیا۔ صفحہ پر درج اقبال کے ان اشعار کو پڑھ کر ذہن میں جیسے پے در پے دھماکے ہوئے۔

مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے مرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

میں نے ان اشعار کا مطلب کب اور کس سے سمجھا اور کن لمحوں میں اور کن جذبات کے ساتھ سمجھا۔ اُردو ڈائجسٹ کھلا ہوا میرے ہاتھوں میں تھا اور میں یک دم ڈیڑھ دو برس پیچھے کے ان لمحوں میں جا پہنچی جب ڈاکٹر عافیہ کو ۸۶ برس قید کی سزا ہوئی تھی۔ تب ہم سب کے ایک سی جیسے جذبات تو تھے تا جو جب بھی ناقابلِ بیان تھے اور اب بھی۔ ہم ڈاکٹر عافیہ کی والدہ کی رہائش گاہ گلشن اقبال پہنچے کہ ان سے اس ظالمانہ فیصلے پر اظہارِ ہمدردی کر سکیں۔ ان کے گھر میڈیا اور ہمدرد افراد کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ تعارف ہونے پر وہ ہمارے گروپ کے ساتھ علیحدہ آکر بیٹھ گئیں اور ہدایت کی کہ اس وقت کسی اور کو ان کے پاس نہ بھیجا جائے اور پھر وہ بولتی رہیں اور ہم سنتے رہے۔ وہ گفتگو کرتے کرتے بے خود سی ہو جاتیں کبھی ڈاکٹر عافیہ کے بچپن کے جھروکوں میں جھانکنے لگتیں کبھی اس کی جوانی کے ایام کے پٹ وا کر کے وہاں داخل ہو جاتیں۔ وہ ہم سب کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھیں اور ہم بھی ان کے ساتھ انہی دنیاؤں میں داخل ہو رہے تھے باہر نکل رہے تھے۔ جب مستقبل کا مؤرخ ڈاکٹر عافیہ پر لکھے گا تو اس باب کا عنوان یقیناً ان کی عظیم ماں ہی قرار پائیں گی۔

میں آپ کو بتاؤں بس چند گھنٹوں قبل یہ ظالمانہ فیصلہ ہوا تھا پر وہ خاتون بالکل بھی مضطرب تھیں نہ اداس۔ بالکل ہشاش بشاش اور بہت خوش کہ وہ "عافیہ" کی ماں ہیں جو ایک قوم کا فرضِ کفایہ ادا کرنے تنہا نکل کھڑی ہوئی ہے۔ وہ قرآن کی آیات پڑھتیں بار بار اپنے سرہانے رکھے قرآن کو اٹھاتیں اور کہیں کہیں سے قرآن کھول کر آیات کی نشاندہی کرنے لگتیں کہ اس قرآن نے ان کو تھام رکھا ہے۔ وہ کہتی تھیں قرآن ان کو تنہا نہیں ہونے دیتا، مایوس نہیں ہونے دیتا اور وہ درحقیقت روشنی کا سفر کر رہی ہیں کہ قرآن ہر دن ایک نئی روشنی اور امید ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان کے سرہانے بالکل بائیں جانب "کلیاتِ اقبال" رکھی تھی جس کو جگہ جگہ سے نشان زد کیا ہوا تھا انھوں نے۔ اور وہ کلامِ اقبال سے ہمیں سنانے لگتیں کہ اس امت پر کیسے کیسے افسوس تھا اقبال کو، جو اتنا عظیم الشان ماضی رکھتے ہوئے بے خبر ہے بے گانہ ہے اور بے وقعت ہے!!!

پھر انھوں نے وہی شعر پڑھا تیمور والا اور اس کا پورا پس منظر بیان کیا اور شعر کی تشریح کی اور ماضی اور حال کی کڑیاں جوڑیں۔ مجھے لگا ان اشعار کی اس سے بہتر تفسیر

کون بیان کر سکتا ہے۔ وہ تو داعی نہیں تھا بھی تو سراپا تفسیر ہیں کہ ان کی شہزادی نے مغل شہزادیوں کی طرح ننگے سر اور ننگے پاؤں رقص کر کے حمیت نیلام نہیں کی۔ بلکہ اس کا رقص بسمل تو آج کے تیمورزادوں کے لیے ایک پکار ہے اور ایک للکار! جو اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرنے پر مائل ہیں۔ جنھوں نے اپنے کفر کی حمیت کو ڈالروں کے عوض فروخت کر دیا۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا کہنے والے نے کہ:

"جب نامراد موسموں کی بے توقیر ہوائیں چلتی ہیں تو بزدلی کا پہلا حملہ "حمیت" کے کھیتوں پر ہوتا ہے۔ پھر ایک وبا چھوٹتی ہے جس کے زیر اثر رائے ساز لکھاری اور دانشور باور کرانے لگتے ہیں کہ محکوم لوگوں کو اہل جبر کی بے مہریاں سر جھکا کر برداشت کر لینی چاہئیں کہ مقدر کا لکھا یہی ہے۔ پھر زرد رنگ کی ایک آندھی چلتی ہے اور اپنی تجوری میں ایٹم بم رکھنے والی کروڑوں کی قوم مکھیوں کی ایک اجتماعیت میں تبدیل ہو جاتی ہے...... اور اپنے اسلحے خانے میں ۱۵ ہزار ایٹمی ہتھیار رکھنے والی سپر پاور کو ڈر تھا کہ ۸۶ سال تک زندگی کی چکی میں پسنے والی نحیف نزار لڑکی آزاد کر دی گئی تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دے گی لہٰذا عوام کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اسے مزید ۸۶ سال کسی کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے۔

عصمت آپا (عافیہ کی والدہ) اپنی توانا آواز میں بول رہی تھیں کوئی بھی خوف نہ تھا انھیں کسی کا بھی۔ بس رچا بچا۔ دنیا کی بے ثباتی۔ اگلی دنیا کے انصاف کا یقین۔ ایسی مائیں ہی تو ایسی اولاد کو جنم دے سکتی تھیں جو تاریخ رقم کر جائیں کہ دنیا کی تاریخ کا سفر دائروں میں ہے اور اس کی لوح پر درج ہے کہ مشرق و مغرب میں اظہار حق کل بھی جرم تھا اور آج بھی جرم ہے لیکن وقت نے یہ بھی ثابت کیا کہ پورا مغرب اپنی تمام سفاکی کے ساتھ اور صیہونی عدالت نام نہاد ججوں کی موجودگی میں یہ "جرم" عائد تو نہ کر سکی۔

آج بھی عافیہ اپنے دھان پان جسم پر امریکی تشدد کی بے پناہ ضربیں سہہ رہی ہے لیکن نہ جھکنے پر تیار ہے نہ بکنے پر۔ سلام اس پاکیزہ وجود پر ۸۶ برس کی سزا سن کر بھی جس کے پائے استقلال میں کوئی لرزش نہ آئی اور اس کی تقدیس ۱۷ کروڑ دلوں کے بالا خانوں میں ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئی۔ اس کا داعیانہ کردار امر ہو گیا۔ وہ حق کا استعارہ اور علامت بن گئی۔ فرعون اور ہامان کے ساتھی اپنا سارا کذب اور سحر اکٹھا کر کے بھی اس کے عصا میں کوئی جنبش نہ لا سکے۔ وہ ناتواں عورت بظاہر ہار کے بھی جیت گئی کہ اس کا "مشن" جیت گیا۔ دوسری جانب منافقوں اور بے ضمیروں کے بے وزن ہجوم ہیں اور مداری کے تماشے......!!!!

بلاشبہ ڈاکٹر عافیہ کا ہر لمحۂ ابتلا ایک انقلاب کی نوید بن کر رہے گا اور اس کی استقامت اور پامردی سے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی روشنی کی کرنیں ضرور افق پر اجالا بکھیریں گی۔ ہر رات کی ایک سحر ضرور ہے اور بلاشبہ ہم آفتوں کی ماری ہوئی قوم ضرور ہیں جسے کبھی خوف نے مارا، کبھی دہشت نے، کبھی زلزلوں نے ہلایا تو کبھی سیلاب سیل بلا بن کر سب کچھ بہا کر لے گیا۔ کہیں ٹارگٹ کلرز تھے تو کہیں ڈرون اٹیک، جس باعزت قوم کی عزت اس کے حکمرانوں نے وہائٹ ہاؤس کو نیلامی کے لیے پیش کر دی۔

لیکن بحیثیت قوم ہم پھر بھی زندہ ہیں۔ اس نفسیاتی اور اعصابی جنگ نے اعصاب ضرور شل کیے لیکن سر جھکائے نہ جا سکے۔ قوم آج بھی اس "وار آن ٹیرر" کو حکمرانوں کی جنگ ہی سمجھتی ہے اور غلامی کا طوق!

اور عافیہ کی استقامت نے اس قوم کو غلامی سے نکلنے کا عظیم درس دیا ہے۔ وہ حضرت سمیہؓ اور حضرت آسیہؓ کے ورثے کی امین ہے۔ بلاشبہ وقت یزیدوں کی گرفت میں ہے لیکن عافیہ نے حسینی قبیلے کی توقیر بڑھا دی ہے اور اب ماؤں کی کوکھ سے محمد بن قاسم اور معتصم باللہ کی راہ پر چلنے والی نئی نسل جنم لے گی اور ثابت ہو گا کہ ظلم کا مقدر شکست ہے اور مغل شہزادیاں جس خنجر کو نہ اٹھا سکیں، آج وہ نحیف و نزار لڑکی جو قیدی نمبر ۶۵۰ کی صورت میں تاریخ میں زندہ رہے گی۔ اس وقت مثل خنجر وقت کی سپر پاور کے اعصاب پر سوار ہے۔

www.paksociety.com

کتاب تبصرہ

زندگی کی سب سے قیمتی متاع
اچھی کتاب
ہے
زیادہ پڑھیں اور سیکھیں

مطالعے کی میز پر

آئیے۔۔۔ کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریے

یہ کالم آپ کو کتابوں پر تبصرے سے واقف کرائے گا۔ اس میں کتاب اور صاحب کتاب دونوں کا تذکرہ ہوگا اور ہر بار غور و فکر کے لیے کچھ موتی آپ کی نذر کرتے رہیں گے

نورالاسلام صدیقی

وطنِ عزیز میں کتابوں کی طلب روز بروز کم ہو رہی ہے۔ ماضی میں کتاب کا ایک نسخہ کم از کم گیارہ سو چھپتا تھا، آج پانچ پانچ سو کی تعداد میں بہت اعلیٰ اور مہنگی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی وجہ مہنگائی ہے تو یہ دلیل اس لیے قابل قبول نہیں کہ ایک مٹھائی فروش بتاتا ہے کہ اس نے مٹھائی کی قیمت پچیس روپے فی کلو بڑھا دی لیکن گاہکوں کی تعداد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نئی نسل کا کتابوں سے تعلق دوبارہ جوڑیں اور گھر میں اچھی اچھی کتابیں لے کر آئیں۔ اسی لیے ہم ہر ماہ نئی اور اہم کتب سے آپ کا تعارف کرواتے ہیں۔

سیرتِ محسنِ اعظم

میاں محمد نواز مرحوم نے حضور اکرمؐ کی حیات طیبہ کے بارے میں یہ کتاب لکھی۔ آپ رحیم یار خان کے باشندے تھے۔ آپ کا خاندان پشت با پشت سے اس علاقے میں مقیم تھا۔ آپ نے ایم اے انگلش اور اسلامیات میں ایم اے کیا۔ متعدد موضوعات پر مقالے تحریر کیے اور چار دیگر کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

حافظ ادریس پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''حضور اکرمؐ کی سیرت مبارکہ پر بے شمار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کے مصداق سیرت النبی

پرکشش ہے۔ تمام کتابوں کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ ہر کتاب کا تشخص اس مرکزی خیال کے تحت نمایاں ہوتا ہے جسے بنیاد بنا کر وہ تصنیف کی گئی۔ کسی کتاب میں آپؐ کا داعیانہ کردار نمایاں کیا گیا۔ اسی طرح حضور اکرمؐ کی انقلابی تعلیمات بعض مصنفین کی فکر ونظر کا موضوع بنی اور بعض مصنفین نے حضور اکرمؐ کی تمام خصوصیات پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں انسان کامل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ دراصل آپؐ کی شخصیت و کردار اور حسن اخلاق کی جس قدر تعریف کی جائے، آپؐ کے مقام و مرتبہ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں نہایت جامع انداز میں آپؐ کی شان میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔ (سورۃ القلم، آیت ۴)

زیر تبصرہ کتاب ''سیرت محسن اعظمؐ'' اپنی چند خصوصیات کی بنا پر اردو کتب سیرت میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مصنف نے حیات طیبہ کے تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً حضور اکرمؐ کی فعال اور جدوجہد سے معمور زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس کے مطابق آپؐ کا ہر لمحہ اس مقصد کے لیے وقف تھا کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب ہو جائے اور بنی نوع انسان کفر و شرک جیسے ظلم عظیم سے بچ کر توحید کی صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔

حضور اکرمؐ کی تمام سرگرمیوں کا مقصد یہی تھا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے آپؐ نے ۱۳ سال مکے اور ۱۰ سال مدینہ منورہ میں جانگسل جدوجہد کی۔ مصنف نے معتبر اور مستند کتابوں کے حوالوں سے سیرت کا مواد اخذ کیا ہے۔ ان کا قلم عقیدت کے پھول بکھیرتا نظر آتا ہے اور قاری ان کے ساتھ خود کو آں حضورؐ کے دور سعید میں محو جہاد محسوس کرتا ہے۔

یہ سیرت پر ایک جامع کتاب ہے۔ کتاب نے سیرت النبیؐ کے متعلق جن موضوعات کو لیا ہے، ان کا اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے: پہلے باب میں خطۂ عرب کے امتیازات اور حضورؐ کے ماقبل دور کے حالات اور حضور کی ولادت مبارک کا بیان ہے۔ دوسرا باب: اولاد اسماعیل اور بیت اللہ کی تولیت۔ تیسرا باب آپؐ کی ولادت سے چالیس سال کی عمر تک کے حالات بیان کرتا ہے۔ چوتھا تا ساتواں باب مکی دور کی تمام تفصیلات سمیٹے ہوئے ہے۔

آٹھواں باب مدنی دور کا وہ زمانہ ہے جب اسلامی ریاست تشکیل پا رہی تھی۔ نواں باب غزوۂ بدر و چند اور غزوات کے بارے میں ہے۔ دسواں باب: غزوۂ احد اور اس دور کے دیگر واقعات۔ گیارھویں باب میں غزوات و سرایا پر ایک نظر ڈالی گئی اور بدر و احد کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بارھواں باب: غزوۂ بنو نضیر و دیگر غزوات، شراب کی حرمت۔ تیرھواں باب: غزوۂ احزاب، غزوۂ بنو قریظہ، آنحضورؐ کا حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح اور اس نکاح پر پروپیگنڈے کا طوفان۔ چودھواں باب: پانچویں اور چھٹی ہجری کے واقعات، حضرت جویریہؓ کا واقعہ، واقعہ افک۔ پندرھواں: باب صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان، صلح حدیبیہ کے فوائد اور برکات۔ سولھواں باب: رسول مقبولؐ کی خارجہ حکمت عملی، قیصر و کسریٰ اور امرا و سلاطین کے نام نبوی خطوط۔

اٹھارواں باب: جنگ موتہ و دیگر سرایا (قیصریت کے پرستاروں کے خلاف پہلی جنگ)۔ انیسواں باب: فتح مکہ۔ بیسواں باب: غزوۂ حنین و طائف اور دیگر سرایا۔ اکیسواں باب: غزوۂ تبوک، مسجد ضرار اور اس کے بانی منافقین، حضرت ابراہیم بن محمدؐ کی وفات۔ بائیسواں باب: ماضی پر ایک نظر اور دارالاسلام کی حدود میں توسیع۔ تیئسواں باب: وفود عرب حضورؐ کی خدمت میں۔ چوبیسواں باب: حجۃ الوداع، پچیسواں باب: مرض آخرت، جھوٹے مدعیان نبوت کے فتنے، آپ کا آخری دن، دعوت وتحریک میں اہل بیت کا بے مثال کردار۔ غرض کتاب کیا ہے، اسے سیرت پاک کا انسائیکلو پیڈیا کہہ لیجیے۔

(شائع کردہ مکتبہ معارف اسلامی، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات ۶۲۳، قیمت ۸۰۰ روپے)

www.paksociety.com

دل پہ دستک

بعض کتابیں پڑھ کر اپنی خوش قسمتی کا خیال آتا ہے۔ اس سے قبل میں نے اختر عباس صاحب کی کتاب

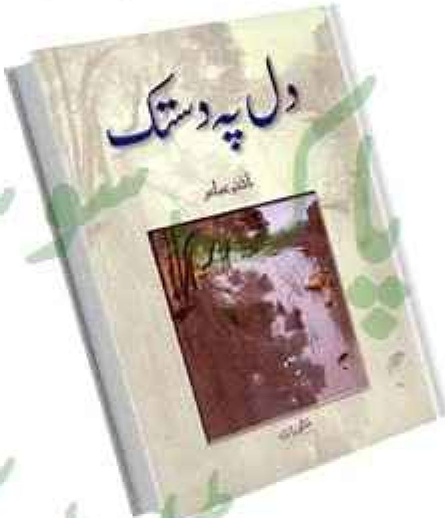

”دستک لائن پر کون پہنچاتا ہے“ پڑھی تھی۔ یہ ان کی دوسری کتاب ہے جسے پڑھ کر ایک نشے کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہے:

بے پیے میرے دل کو نشہ آ گیا
زندگی پہ میری بے خودی چھا گئی
جام سے کیا غرض ہے کیا واسطہ
وہ نظر جب اسی کیف برسا گئی

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی بات دوسرے کے دل میں اتارنے کا ایسا ملکہ دیا ہے کہ آدمی ابھی ہوش میں بھی نہیں آیا ہوتا کہ شکار ہو جاتا ہے۔

میری بچپن سے یہ عادت ہے کہ اچھا فقرہ پڑھا، اچھا شعر دیکھا، یا اچھی باتیں سنیں، انھیں اپنے پاس درج کر لیا۔ اب مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں اس کتاب میں سے کیا لوں اور کیا چھوڑ دوں۔ کچھ چیزیں آپ بھی پڑھیں گے جو میں نے محسوس کی ہیں۔

اختر عباس کو خود بھی احساس ہے کہ اچھی بات ہوگی تو یقیناً اگلا سنبھالے گا بھی اور اس کے بارے میں سوچے گا بھی۔ اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں ”سنبھالنے کی چیز تو اچھی باتیں ہوتی ہیں۔ چیزوں کا کیا ہے، آج ہیں کل نہیں۔ اچھی بات ہو یا اچھی سوچ، یہ تو کتاب کی اچھی جلد جیسی ہوتی ہے۔ انسانی جذبوں کو مضبوط اور محفوظ بناتی ہے۔“ ایک اور جگہ یوں رقم طراز ہیں ”کچھ باتیں مشینوں جیسی ہوتی ہیں، بہت جلد پرانی ہو جاتی ہیں اور کچھ ہار سنگھار کے پودے جیسی کہ ۱۲ ماہ ان پر پھول کھلے رہتے ہیں۔“

قاری کے دل میں اترنے کے لیے سبق آموز قصے بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کا قصہ جو کئی سال خدا سے ناراض رہا تھا، وہ اس سے کیسے راضی ہو گیا۔ اس آدمی کا قصہ جو بیٹی اور بیوی کی موت پر شکرانے کے نفل پڑھ رہا تھا۔ ایک بچے اور بڑھیا کا قصہ جن دونوں کی خدا سے ملاقات ہوئی۔ ایک طالب علم کا قصہ جس نے رات بھر دعا کی۔ قصہ کہ دوست کے یقین کو بے یقینی اور ناامیدی میں بدلنے سے بچانے کے لیے کیا کیا۔

بڑے لوگوں کی ناقابل فراموش باتوں اور واقعات کو بھی کتاب کی زینت بنایا گیا ہے۔ مثلاً اسلام آباد میں ہم ممتاز مفتی کے گھر گئے تھے، کہنے لگے، ”اللہ سے محبت کا تعلق یوں بنا لو کہ اسے اپنا جانو۔ جیسے تمھاری گھڑی ہوتی ہے۔ ہر دم، ہر لمحہ، ٹک ٹک، تمھارے ساتھ ساتھ۔ نماز پڑھتے، سجدہ کرتے، کھانا کھاؤ تو اسے ساتھ بٹھا لو۔ کہو ذائقہ اچھا ہے۔ کرکٹ کھیلو تو ساتھ کھڑا کر لو کہ ذرا چھکا تو لگوا دیں۔ نیند آئے تو قریب بلا لو، ذرا سر تو دبا دیں۔ ٹھیک ہو جاؤ تو اس کی گود میں سر رکھ لو۔ وہ خود تھپک دے گا۔ سب دکھ دور ہو جائیں گے۔“

یادیں: کہتے ہیں بچھڑے اور گزرے وقت کی کچھ چیزیں بہت یاد آتی ہیں۔ اپنا گھر، اپنے دوست، اپنی

www.paksociety.com

غلطیاں، اپنا محلہ، اپنا شہر، اپنی شرارتیں، اپنی خوبیاں اور دوسروں کی غلطیاں۔ یادوں کا تو یہ ہے کہ یاد رکھی جائیں تو ہر بات ایک یاد ہے، بیتا ہوا ایک پل، ٹھہری ہوئی ایک میٹھی نظر۔ تمام یادیں، نئے ماحول، نئی بستیوں کی پذیرائی پر بھی بہت منحصر ہوتی ہیں۔ بڑے سے بڑا نقش ماند پڑ جاتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے کانٹے کی چبھن نہیں جاتی۔ کبھی ایک میٹھے لقمے کی یاد نہیں بھولتی، اس کا ذائقہ سب پر سوا ہوتا ہے کہ جب یاد کرو منہ میٹھا ہونے لگتا ہے۔

(یہ بھی کن بولوں کو تکتے ہیں)

پتھر کے دل: ہمارے ہی آس پاس موجود کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر کے ٹکڑے رکھے ہوتے ہیں۔ تبھی تو ان کی آنکھوں میں دوسروں کے لیے آسانی کی روشنی اترتی ہے نہ دل میں نرمی کو آنے کی اجازت ملتی ہے، نہ روح کو تازہ ہوا میسر آتی ہے نہ دوسروں کے لیے آسودگی کا خیال ہمرکاب ہوتا ہے۔ جن کو دھوپ کا تجربہ ہی نہ ہو، کوئی انھیں کیسے فرق بتائے، کوئی انھیں کیسے سکھائے اور کیونکر بتائے کہ انسان کی ظاہری صورت سے ماورا ہی تو اصل انسان ہوتا ہے۔ ظاہری شکل اور خوبصورتی سے جدا، اس سے الگ اور وہی محبوب اور مطلوب ہوتا ہے۔ وہی زندہ رہتا ہے۔ وہی محبت کا رزق پاتا ہے۔

(شیشے سے نک چڑھے، حسرت زدہ لوگ)

مشورے کا تیر: ویسے مشورہ دینا ایک ذہنی ورزش ہی نہیں، بہت سے لوگوں کے لیے تفنّنی لذت بھی ہوتی ہے۔ وہ تاک میں رہتے ہیں، کب موقع ملے اور وہ مشورے کا تیر چلا دیں۔ شاید اسی لیے مشورہ دینے والا اکثر چوک جاتا ہے۔ نیت میں اگر خیر خواہی سے زیادہ شرارت شامل ہو تو مشورے کی قبولیت تو دور رہی شرمساری کا بول الگ ملتا ہے کیونکہ بونے والے نے بُری چاہت سے یہی بیج بویا ہے۔

(گیراژ کا یہ جذبہ کہیں باہر سے نہیں آتا)

کامیابی کا راز: جس شعبۂ زندگی میں کامیابی کی جو مانگ اور ضرورت ہے، اس سے زیادہ لے کر جائیں تو کامیابی ملتی ہے۔ سو فیصد کی ضرورت ہو اور نوے فیصد مارکس لے جائیں تو ہے مقام نہیں ملے گا۔ جب زندگی کی دوڑ میں کوئی پیچھے رہتا ہے تو اپنی ہی کسی نہ کسی کمی اور کوتاہی کے باعث رہتا ہے۔ اس کمی کو جاننے والے، محنت کر کے اگلی بار وہ مقام پا لیتے ہیں۔

(کامیابی کی آخری سیڑھی)

☆ نیکی کا خیال ہی کریں تو دامن بھر جاتا ہے۔

☆ دل میں آنے والا ہر خیال کسی دستک کی طرح ہوتا ہے۔

☆ اچھے اعمال والے، اچھے خیالوں والے لوگ ایسے ہی کمیاب ہوتے ہیں، یہ سڑک پر پڑے تھوڑی مل جاتے ہیں۔

☆ جو اچھا بننا نہ چاہے، اچھی روایت پر چلنا نہ چاہے، اس پر بھلا کب دریچے کھلتے ہیں، کب سمتیں روشن ہوتی ہیں۔

☆ چہروں کے حسین ہونے کی اصل وجہ عمر نہیں، دل کی پاکیزگی اور فراخی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ سے محبت کا تعلق، اس کے کاموں پر یقین اور مشکلوں میں صبر کا تعلق کوئی جوہڑ نہیں، دریا ہے، ہر وقت بہتا رہے گا۔ ہر وقت چلتا رہے گا۔ یہی آباد رکھے گا۔ یہی شاداب رکھے گا۔

☆ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک، ہم نے تو بھی کو باتیں کرتے، باتوں کو کھاتے، باتوں سے پیٹ بھرتے اور باتوں سے ہی دوسروں کی بھوک کم کرتے کے گر بتاتے دیکھا ہے۔

☆ اکثر ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ دوسرے احساس دلائیں تو خیال آتا ہے، ورنہ ان کے بغیر کام بڑے احسن انداز سے چلتا رہتا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ دوسرے ہمیں، وجہ بے وجہ، ہماری ضرورتوں کا احساس دلانے اور خوشی کم کرنے کیوں چلے آتے ہیں۔

☆ انسانی خواہشیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ کبھی وجہ کے ساتھ اور اکثر وجہ کے بغیر دل میں وصولی جمانے چلی

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آتی ہیں۔ کبھی واپس چلی جاتی ہیں، کبھی ذہن پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ جب یا تو دل ان کا اسیر ہو جاتا ہے یا ان سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب جادو اثر سوچ ہوتی ہے۔ آسانی سے رہائی نہیں ملتی۔ ہاں اگر انسان کو اندر کی مضبوطی میسر ہو تو پھر ذاتی خواہشوں کی پھاوڑی اجڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

☆ یہ سچ ہے وہ مالک تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا کوئی سوچنے والا اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ مہربان اور دیالو اتنا کہ ساری کائنات میں اپنی مہربانی تقسیم بھی کر دے تو ذرا کمی نہ آئے۔

☆ چیزوں سے محبت کرنے والوں کے ہاتھ اور زندگی ہمیشہ خالی ہی رہتی ہے۔ اول تو کبھی خوشی آتی نہیں، آئے بھی تو دروازے سے جھانک کر واپس چلی جاتی ہے۔

☆ اچھی کمپنی ہو، اچھے دوست ہوں، تو صلاحیتوں کو ہی نہیں، خوابوں اور خیالوں کو بھی وسعت ملتی ہے۔

☆ اپنی غلطی کی اصلاح کرنی ہو، یا اپنا کوئی کام۔ خود کرنے میں جو آسانی اور عزت ہے، وہ کسی دوسرے کے کرنے میں باقی نہیں رہتی۔

☆ کچھ باتیں اور یادیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ چاہے وہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو جائیں۔

☆ دنیا میں جب بھی کسی کو کچھ اچھا ملتا ہے، اچھی نیت اور پُرخلوص محنت سے ملتا ہے۔ صلاحیت کے درست استعمال سے ملتا ہے۔ اچھے خیال کے استعمال سے ملتا ہے۔

(شائع کردہ منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ قیمت ۴۰۰ روپے)

زندگی کے بیس عظیم سبق

ہال اربن (Hal Urban) کی انگریزی کتاب ”Life's Greatest Lessons or 20 Things I want My Kids to know“ کی ایک دوست نے کچھ عرصہ قبل بہت تعریف کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مصنف نے اقدار کی بات بالکل نئے انداز میں کی ہے۔ وہ جھوٹ، بددیانتی، رشوت کو برا نہیں کہتا۔ وہ نہیں کہتا کہ خدا ناراض ہوتا ہے، خدا اس کی سزا دے گا، وہ جہنم میں ڈالے گا۔ وہ بہت پیارے اور دلنشیں انداز میں قاری کو بتاتا ہے کہ ہم جب ایسے منفی افعال کرتے ہیں تو یہ ہماری ذات کو کیا نقصان پہنچاتے ہیں۔

چند دن قبل کتابوں کی ایک دکان پر اس کتاب کا اردو ترجمہ نظر آ گیا۔ اردو کتاب کا نام ہے ”زندگی کے ۲۰ عظیم سبق“ اور اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ محمد احسن بٹ نے کیا ہے۔ یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے کہ اس میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ شعر میرے ذہن میں گھوم رہا تھا:

جینا بھی اک فن ہے یہاں
ہر اک کو کب آتا ہے

ہال اربن امریکی معاشرے کی بات کر رہے ہیں لیکن اپنے ہاں بھی اب یہی حال ہے۔ لکھتے ہیں: ”ہم ایک ایسے معاشرے میں رہتے ہیں جو آرام، لذت اور فوری کام ہونے کی پرستش کرتا ہے۔ ذرا سوچیں کہ ہم

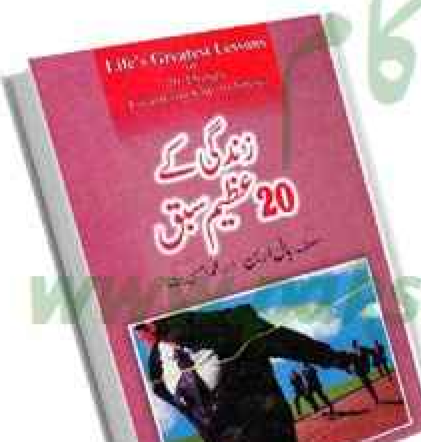

کتنے کام صرف ایک بٹن دبانے سے کر سکتے ہیں، گیراج کا دروازہ کھولنا، کھانا پکانا، فون کال کرنا، کپڑے دھونا اور سکھانا، ٹی۔وی آن کرنا، چینل تبدیل کرنا وغیرہ۔ یہ صرف گھر کی مثال ہے۔ کار اور کام کی جگہ پر مزید بٹن ہوتے ہیں۔ بٹن دباؤ، ہر کام آسانی سے اور فوراً ہو جائے گا۔ نہ پسینا، نہ کھنچاؤ۔

اس پر مستزاد صبح شام ہر وقت میڈیا ہمیں درس دے رہا ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں، اسے بڑی آسانی سے اور فوراً حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ راتوں رات لکھ پتی بن سکتے ہیں، چوبیس گھنٹوں میں تمام بیماریوں سے نجات پا سکتے ہیں، جو چاہیں اس کے مالک بن سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے موجودہ دور میں میڈیا بالکل الٹ پیغام دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی اس طرح کام نہیں کرتی جس طرح میڈیا میں دکھایا جاتا ہے۔ کامیابی کا کوئی شارٹ کٹ، کوئی راز نہیں ہوتا۔ صرف اور صرف محنت کامیابی دلاتی ہے۔ محنت کا متبادل کوئی نہیں۔ عمل سے زندگی بنتی ہے:

(۱) محنت ہمیں ہماری صلاحیتیں جاننے میں مدد دیتی ہے۔ (۲) محنت زندگی بہتر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ (۳) کامیابی کا خوش گوار احساس عطا کرتی ہے۔ (۴) کردار سازی کرتی، ہمارے اندر موجود بہترین چیز باہر لاتی ہے۔ (۵) انسان کو باعزت بناتی ہے۔ (۶) مسلسل محنت کرنے سے ہم اپنا احترام کرنے لگتے ہیں۔ (۷) زندگی کو معنویت عطا کرتی ہے۔ (۸) بہترین نتائج کا باعث بنتی ہے۔ زندگی اس وقت زیادہ دل چسپ اور خوش گوار ہو جاتی ہے جب ہم کوئی کام کر رہے ہوں۔ (۹) محنت عادت بن جاتی ہے۔ عادتیں ہر کامیابی کی کنجی ہیں۔ (۱۰) محنت صحت عطا کرتی ہے۔ جب ہم محنت کریں تو اپنے ذہن اور جسم کو مثبت انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سے ذہنی اور جسمانی صحت ملتی ہے۔

مصنف بتاتا ہے کہ ضبط نفس کیا ہے؟ وضاحت ضروری ہے کیونکہ بہت سے لوگ اس اصطلاح کو غلط سمجھتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ ضبط نفس کوئی ایسی چیز ہے جس سے بچنا چاہیے کیونکہ یہ منفی چیز ہے۔ وہ اسے اپنے اوپر خود طاری کردہ سزا کے مساوی سمجھتے ہیں۔ اکثر اوقات اسے اپنے اوپر پابندیاں عائد کرنا یا اپنی ذات کی نفی کرنا بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ سارے خیالات غلط ہیں۔ حقیقتاً ضبط نفس ایک مثبت شے ہے۔

مختصراً ضبط نفس کا مطلب ہے اپنے آپ کو کام کرنے کی ترتیب میں ڈھالنا۔ جب ہم ضبط نفس اپنا لیں تو ہمیں علم ہوتا ہے کہ اب ہماری زندگی کی باگ ڈور ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ہم خود ہی یہ طے کرتے ہیں کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ ہم خود فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگی کو کتنا بہتر بنانا ہے۔ ضبط نفس کا مطلب ہے اپنا نگران خود ہونا۔

بددیانتی کے متعلق مصنف نے قاری کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی قیمت دنیا ہی میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے یہ سبق سیکھا ہے، بددیانتی ایسی چیز ہے جو ہماری زندگی تباہ کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ کسی بھی دوسری چیز سے زیادہ بددیانتی ہمیں ویسا شخص نہیں بننے دیتی جیسا ہم بننا چاہتے ہیں اور بن سکتے ہیں۔ یہ سرطان کی طرح ہے۔ ابتدا تھوڑی بددیانتی سے ہوتی ہے اور اگر اس کا سراغ نہ لگایا جائے تو پھیل کر قابو سے باہر ہوتی اور بالآخر ہمیں تباہ کر دیتی ہے۔

آخر میں قارئین یہ جان لیں کہ زندگی کے تین زاویے ہیں: جسمانی، ذہنی اور روحانی۔ اسی لیے جسم کی مضبوطی کا ہمیشہ خیال رکھیں۔ جسم کی طرح ذہن کو بھی صحت مند رہنے کے لیے خوراک اور ورزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہن کی غذا ہے: اچھی کتابیں، فکر افروز تحریریں اور سنجیدہ ٹی۔وی پروگرام اور ذہنی ورزش یہ ہے کہ منفی خیالات ابھرنے نہ دیں اور مثبت خیالوں کو ذہن میں زیادہ جگہ دیں۔ روحانی زاویہ سمجھنے کے لیے وسیلہ مذہب ہے۔ آپ کا جو بھی مذہب ہے اس کے بنیادی اصولوں پر عمل کرنے کی عادت اپنائیے۔ مکمل انسان وہی ہے جو اپنے جسم، ذہن اور روح کے تقاضوں کو منصفانہ انداز میں پورا کرتا ہے۔

(شائع کردہ دارالشعور، ۳۷ مزنگ روڈ بک سٹریٹ، لاہور)

صفحات ۲۰۸۔ قیمت ۳۰۰ روپے

www.paksociety.com

ارضِ عالم

خطۂ عرب کے اس تاریخی نگر کی داستان عجب
جہاں دنیا میں سب سے پہلا بند تعمیر ہوا

تین ہزار سال
پرانا عظیم شہر

مآرب

یمن کے ایک قصبے کے رہنے والوں کو ان کی خوشحالی نے ہی انہیں [illegible] کر دیا

محمود [illegible]

یمن

کے دارالحکومت صنعا سے شمال مشرق کی طرف تقریباً ساٹھ ستر میل دور "مارب" نام کا ایک قصبہ اپنے بے شمار کھنڈرات لیے موجود ہے۔ اس قصبے کی کہانی بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔ ۲۰۰۰ قبل مسیح میں یہ قصبہ اپنے وقت کی متمدن آبادی اور زراعت و صنعت کے اعتبار سے بے حد ترقی یافتہ تھا...... پھر کیا ہوا؟ وہ موجودہ تباہ حالی تک کیسے پہنچا، آئیے دیکھتے ہیں۔

عرب نسابوں کے مطابق مارب کا بانی سبا بن یشجب تھا۔ الاکلیل نامی راوی بیان کرتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے "سبا" کی نسبت دریافت کیا گیا، آیا وہ کوئی شہر تھا یا آدمی یا عورت؟ آپ نے فرمایا کہ "سبا" ایک آدمی تھا جس کے ۱۰ بیٹے تھے۔

اس طرح یہ گویا سبائیوں کا دارالحکومت تھا۔ سبائی حکومت کی خوشحالی زراعت، تجارت اور تعمیری مہارت پر منحصر تھی۔ قوم سبا کے عروج و زوال کی ایک داستان حضرت مولانا مودودی نے تفہیم القرآن کی جلد نمبر ۴ میں "سورہ سبا" کی تفسیر کرتے ہوئے کچھ یوں بیان کی ہے:

"تاریخ کی رو سے "سبا" جنوبی عرب کی ایک بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ ۲۵۰۰ قبل مسیح میں "اور" کے کتبات اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور کے کتبات اور انجیل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر ہے۔ یونان و روم کے مورخین اور جغرافیہ نویس تھیوفراسٹس (۲۸۸ ق م) کے وقت سے مسیح کے بعد کی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے۔

اس کے عروج کا دور ۱۱۰۰ برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی پھر جب اس کی ملکہ (بلقیس) حضرت سلیمانؑ (۹۶۵-۹۲۶ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ غالب اکثریت مسلمان ہو گئی۔ لیکن بعد میں نا معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور یہ "المقہ" (چاند دیوتا)، "عشتر" (زہرہ) "ذات حمیم" اور "ذات بعدان" (سورج دیوی) اور بہت سے دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنے لگی۔ "المقہ" اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حقدار قرار دیتے تھے۔ یمن میں بکثرت ایسے کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے سارا ملک

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

ان دیوتاؤں اور خصوصاً المقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑا اہم واقعہ پران کے شکریے ادا کیے جاتے۔

قوم سبا کی تاریخ کے اہم ادوار حسب ذیل ہیں:

(۱) ۶۵۰ قبل مسیح سے پہلے کا دور۔ اس زمانے میں ملوک سبا (سبا کے بادشاہ) کا لقب مُکَرّب سبا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مُقَرّب کا ہم معنی تھا۔ مطلب یہ کہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (Priest Kings) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایۂ تخت ''صرواح'' تھا جس کے کھنڈرات آج بھی مارب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور ''خریبہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دور میں مارب کے مشہور بند کی بنیاد رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

(۲) ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور۔ اس دور میں سبا کے بادشاہوں نے مکرب کا لفظ چھوڑ کر ''مَلِک'' (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور دنیویت کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں ملوک سبا نے صرواح کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔

(۳) ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر قبیلہ حمیر غالب ہو گیا جو قوم سبا ہی کا ایک قبیلہ اور تعداد میں دوسرے قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ ''یمنت'' اور ''یمنات'' کا استعمال شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ''یمن'' اس پورے علاقے کا نام ہو گیا۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

(۴) ۳۰۰ء کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور۔ یہ قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں، بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی، زراعت نے دم توڑا اور آخرکار آزادی تک ختم ہو گئی۔

پہلے ریدانیوں، حمیریوں اور ہمدانیوں کے باہمی نزاعات سے فائدہ اٹھا کر ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہوگئی مگر اسی تک مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۴۵۰ء یا ۴۵۱ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید کی آیات میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد ''ابرہہ'' کے زمانے تک بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی، وہ پھر جمع نہ ہو سکی۔ نہ ہی آبپاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہو سکا۔

۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ''ذونواس'' نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں ''اصحاب الاخدود'' کے نام سے آیا ہے۔ نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہوئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے ''ابرہہ'' نے کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو روندنے، حبشی اثر میں لانے کے لیے ۵۷۰ء میں (نبی ﷺ کی پیدائش سے چند روز قبل) مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخرکار ۵۷۵ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا۔ اس قبضے کا خاتمہ اسی وقت ہوا جب ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

قوم سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا، ایک زراعت، دوسرے تجارت۔ زراعت کو انھوں نے آبپاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعے ترقی دی۔ اس کی مثل کوئی دوسرا نظام آبپاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ ملتا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے۔ انھی نالوں پر جگہ جگہ بند باندھ کر انھوں نے تالاب بنا لیے۔ ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا کہ قرآن مجید کی تفسیر کے مطابق

ہر طرف ایک باغ ہی نظر آتا تھا۔

اس نظام آب پاشی کا سب سے بڑا مخزن آب وہ تالاب تھا جو شہر ''مارب'' کے قریب کوہ ابلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا۔ مگر جب اللہ کی نظر عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا۔ اس سے بہہ نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا یہاں تک کہ ملک کا پورا نظام آب پاشی تباہ ہوگیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کرسکا۔

تجارت کے لیے خدا نے اس قوم کو بہترین جغرافیائی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق سے مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کی بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام اور ہاتھی دانت پہنچتے۔ دوسری طرف وہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عود، عنبر، مشک اور دوسری خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنھیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے: ایک بحری اور دوسرا بڑی۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انھی سبائیوں کے ہاتھ تھا۔ کیونکہ بحر احمر کی موسمی ہواؤں، زیر آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے۔ دوسرے کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے۔

بڑی راستے عدن اور حضر موت سے مارب پر جا کر ملتے پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یثرب، العلا، تبوک اور ایلہ سے گزرتی ہوئی پیٹرا تک پہنچتی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا۔ اس بڑی راستے پر جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدود شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں۔ شب و روز ان کے تجارتی قافلے وہیں سے گزرتے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حمیری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہوگیا۔ شرق اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ عرب تاجر اپنی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموال تجارت کی من مانی قیمتیں وصول کررہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ خود اس میدان میں آگے بڑھ کر تجارت پر قبضہ کرلیں۔ اس غرض سے پہلے مصر کے یونانی النسل فرماں روا بطلیموس ثانی (۲۸۵۔۲۴۶ ق م) نے اس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۱۷ سو برس پہلے فرعون سسوسترلیس نے دریائے نیل کو بحر احمر (Red Sea) سے ملانے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحر احمر میں داخل ہوا۔

لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی۔ لیکن جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقتور تجارتی بیڑا بحر احمر میں لے آئے۔ اس کی پشت پر انھوں نے ایک جنگی بیڑا بھی لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں، ان میں جہازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آگیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلط قائم ہوگیا۔ اسی سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم سازباز بھی کرلی جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہوگئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف بڑی تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی مگر کئی اسباب نے مل

www.paksociety.com

کر رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے حبشیوں نے بحیرۂ احمر سے العلا تک بالائی حجاز اور اردن کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر ۱۰۶ء میں رومیوں نے نبطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام و اردن کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ یوں اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی۔

ایک وقت تھا کہ سبا کی دولت کے افسانے سن سن کر یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو (مؤرخ) لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے، چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوتا ہے۔ پلینی (مؤرخ) کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت انھی کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہے۔ یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں۔ ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتوں اور مویشی سے بھرا ہوا ہے۔

آرٹی میڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہیں۔ جلانے کی لکڑی کے بجائے دارچینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ قوم سبا ہی نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعا کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک بوس (Skyscraper) عمارت تعمیر کی جو "قصر غمدان" کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔

مگر یہ سب کچھ اسی وقت رہا جب اللہ کا فضل ان کے شامل حال رہا۔ آخرکار جب انھوں نے کفران نعمت کی حد کر دی تو رب قدیر کی نظر عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی۔ پھر ان کا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔"

☆☆

آل سبا کی کہانی جو مولانا نے انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کی، قاری کو عبرت کے ان گنت پہلوؤں سے آشنا کرتی ہے۔ یہ پہلو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آگے بڑھتے اور اثریات کے حوالے سے ان آثار و باقیات کا کھوج لگاتے ہیں جو اس عظیم تمدن کے امین ہیں جس کی نظیر اس وقت کی معروف دنیا پیش کرنے سے قاصر رہی۔

مارب کو ایک صحت بخش مقام سمجھا جاتا ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۱۲۰۰ میٹر بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔ مارب کے لوگوں کا تمام تر انحصار بارش کے اس پانی پر ہے جو ان کے کھیت سیراب کرنے پہاڑی وادیوں سے آتا ہے۔ ماضی قریب کے خطرناک سیاسی حالات سیاحوں کو یہاں پہنچنے سے روکتے تاہم تھامس آرنلڈ (Thomas Arnald) پہلا سیاح ہے جو یہاں ۱۸۴۳ء میں پہنچا۔ اس کے سفرنامے کی اشاعت پیرس، ۱۸۴۵ء میں ہوئی۔

پھر ایڈورڈ گلاسر (Adward Glaser) کے نام کا ایک شخص ۱۸۸۸ء میں ایک عرب شیخ کا بہروپ بھر کے یہاں آیا۔ اس وقت کے ترک گورنر اور مارب کے اشراف نے اسے وہاں پہنچنے میں مدد دی۔ اس کی یہ سیاحت بہت اہم ہے۔ وہ مارب میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرا اور بعدازاں اپنے مشاہدات پیش کیے۔ ۱۹۳۶ء میں ایک شامی اخبار نویس یہاں پہنچا پھر مزید زائرین آتے رہے۔ سبا کی قدیم سلطنت موجودہ یمن، عظیم تمدن کے ساحلی علاقے اور اس طویل رقبے پر مشتمل تھی جو آج کل سعودی عرب میں شامل ہے۔

قدیم کاروان کے راستے جنوبی عرب کے لوبان پیدا کرنے والے علاقے کو بحر روم سے ملاتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی شاخ وادی بیجان سے ہوتی ہوئی مارب کو جاتی تھی۔ مارب سے یہ سڑک معین جاتی جو الجوف میں

ہے۔ وہاں سے یہ نجران پہنچ جاتی۔ نجران سے مکہ، یثرب (مدینہ)، تبوک وغیرہ اور آخر میں غزہ پہنچ جاتی۔ وہاں سے قافلے اور بحری جہاز سامان تجارت دنیا کی تمام منڈیوں مثلاً مصر، بابل، شام، یونان اور ایران وغیرہ پہنچاتے۔

غرض مارب تجارتی راستوں کا سنگم (مقام اتصال) تھا۔ ان راستوں میں سب سے اہم وہ راستہ تھا جو اسے خلیج فارس اور بابل سے ملاتا۔ اس شہر کے کھنڈر جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی دیواریں، منارے اور ستون زمین سے باہر کی طرف ابھرے ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ان معبدوں کی تباہی خطرناک صورت حال اختیار کرگئی۔ ہوا یہ کہ امام (وہاں کے حاکم اعلیٰ) نے مارب کے گورنر کو مختلف سرکاری عمارتوں کی تعمیر کا حکم دیا۔ گورنر نے کھڑے مندروں کو گرانے کا حکم دے دیا تاکہ نئی تعمیرات میں ان کے پتھروں کو استعمال میں لایا جاسکے۔

چنانچہ ۲ سال کے دوران ۱۵ سے زیادہ قدیم سنگی عمارتیں منہدم کی گئیں۔ پتھر کے بڑے قطعات توڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا لیے گئے اور اس بات کا قطعاً لحاظ نہ رکھا گیا کہ آیا ان پر کچھ کندہ ہے یا نہیں۔ یوں یہ عمل تخریب قوم سبا کی تاریخ اور ان کے آثار قدیمہ کے لیے تباہی کا باعث بن گیا۔ قدیم شہر کے گرد ایک پتھر کی دیوار تھی جو تقریباً ۳ میٹر موٹی اور چونے کے پتھر کے بڑے بڑے ٹھوس ٹکڑوں سے نہایت احتیاط سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف دیواروں میں ۴ بڑے دروازے تھے۔ آج کل ان میں زیادہ اہم وہ دروازہ ہے جو مغربی دیوار میں اور باب المدینہ کہلاتا ہے۔ اسے دونوں طرف برج بنا کر اچھی طرح محفوظ کرلیا گیا ہے۔

اگرچہ یہ جگہ تباہ حالت میں ہے اور تمام مقامات پر ٹیلے نظر آتے ہیں تاہم ان کے نیچے کہیں کہیں کھنڈروں کی شناخت ہوسکتی ہے۔ یہاں کی ایک وسیع کھلی زمین پر غالباً شہر کی منڈی ہوگی جسے المیدان یا السوق کہتے ہیں۔ ان کھنڈروں میں اہم کتبوں اور منقوش سنگ مرمر کے ٹکڑوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ یہاں دارالبیداء نام کی ایک جگہ ہے جس کے متعلق مورخین کا خیال ہے کہ وہ ملکہ بلقیس کا محل تھا۔ ان کھنڈروں میں چھوٹے بڑے ستون ٹوٹے پڑے ہیں۔ تاہم کچھ ابھی بدستور کھڑے ہیں اور ان جگہوں کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں کبھی مندروں یا محلوں کے اندر ستونوں والے بڑے کمرے واقع تھے۔

قریب ہی ایک قدیم معبد کے آثار ہیں۔ اس کے صدر دروازے کے ۸ سنگِ خارا کے ستون اس مسجد کی دیواروں میں شامل کر دیے گئے ہیں جسے مسجد سلیمان کہا جاتا ہے۔ یہ نام اس داستان کی یادگار ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ملکہ بلقیس بیت المقدس میں حضرت سلیمانؑ کی زیارت کرنے گئی تھی۔

مورخین کا بیان ہے کہ مارب میں تین مستحکم قصر تھے: الصالحین، القشیب اور الحجر۔ ان میں مشہور ترین "الصالحین" ہے اور اسی میں عرش بلقیس تھا جس کا ذکر قرآن مجید (النمل ۲۳، ۳۸، ۴۲) میں آنے کی وجہ سے اسلامی تصانیف میں مشہور ہوگیا۔ یہ ذکر ملکہ بلقیس کے حضرت سلیمانؑ سے تعلق پیدا ہونے کی وجہ سے آیا۔

مورخین کہتے ہیں کہ اس عرش کے پائے اب تک بدستور قائم ہیں۔ وہ اس قدر ضخیم اور اتنی مضبوطی سے زمین میں گڑے ہوئے ہیں کہ خواہ کتنی ہی تعداد میں آدمی اسے گرانے کی کوشش کریں، وہ انھیں گرا نہیں سکتے۔ یہ پتھر کے پایوں پر قائم تھا جن میں سے ہر ایک ۲۹ ذراع (ایک ذراع تقریباً آدھا گز) بلند تھا اور زمین کے اندر اس کی بنیاد اسی قدر گہری تھی جس قدر زمین کے اوپر اس کی بلندی۔

یمن میں دیگر جگہوں کو بھی عرش بلقیس کہا جاتا ہے۔ یاقوت (مورخ) کے مطابق عرش بلقیس "صنعا" سے ایک دن کی مسافت پر ایک جگہ کا نام ہے جس پر سنگ مرمر کے ۶ ستون کھڑے ہیں۔ ستونوں کے علاوہ یہاں بہت سے کتبے، مزین پتھر اور بتوں کے نیم اور مکمل مجسمے معبد کے اصل کمرے میں رکھے ہیں۔ وہاں سنگ رخام اور دیگر پتھروں سے بنے بہت سے سر بھی موجود ہیں جن کی بلندی ۱۵ سے ۳۵ سینٹی میٹر تک ہے اور جو صنعت گری کی مثال ہیں۔

چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً تعویذ، منکے، انگشتریوں کے نگینے وغیرہ بھی کثیر تعداد میں ملے ہیں۔ چونکہ مارب میں کبھی منظم طور پر کھدائی کا کام نہیں ہوا لہٰذا اس کی مکمل جغرافیائی تاریخ کبھی نہیں لکھی جا سکی۔ مارب شہر مدت دراز تک روبہ ترقی رہا۔ اس کی ترقی کا سبب تجارت اور آب پاشی کے ذرائع تھے، جن کی تعمیر ۸ویں صدی قبل مسیح میں شروع ہو چکی تھی۔ مارب کا مشہور بند (Dam) اس زرخیز وادی کو سیراب کرتا تھا۔ شہر اور اردگرد کے باغات اُن نہروں کے ذریعے سیراب ہوتے جو بند سے نکلتی تھیں۔ قلعہ بند شہر کے باہر کئی ایسے مضافات تھے جن میں محل اور مندر تھے۔ ان کے کھنڈر اب تک وادی مارب کے جنوب میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم المقہ کا مندر ہے جو "محرم بلقیس" کے نام سے مشہور ہے۔

بند کے قریب ہی ایک قدیم قبرستان ہے جسے آج کل قبور المقتسین کہا جاتا ہے۔ اس کے بعض مقبرے پتھر سے تعمیر ہوئے۔ بعض سیلابی مٹی کاٹ کر بنائے گئے۔ سیلاب گزر جانے کے بعد بعض بدوی وہاں جاتے ہیں۔ وہاں انھیں وہ چھوٹی چھوٹی اشیا ملتی ہیں جو دراصل قبروں میں مُردوں کے ساتھ رکھی گئی تھیں۔ قدیم شہر کی جنوبی دیوار سے باہر کی طرف پانی کا بہاؤ منظم کرنے والے ایک بند کے آثار ہیں جو اس شہر کی قدیم گزرگاہ کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بڑے بند کا پانی آتا تھا۔

پانی کی رفتار منظم کرنے والا یہ بند شہر کے اصل دروازوں میں سے ایک کے سامنے واقع ہے اور شہر کو نہر کے دوسرے کنارے کے وسیع مضافات سے ملاتا ہے۔ اس کے موجودہ آثار صرف دو بڑی سنگی دیواروں پر مشتمل ہیں جو مشرق سے مغرب کی جہت ایک قطار میں واقع ہیں۔ پانی ان دیواروں کے درمیان کی خالی جگہ پر بہتا تھا۔ ایک دیوار کے شمالی پہلو پر ایک کتبہ کھدا ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ قوم سبا کے مکرب ذمر علی وا تر بن کرب ایل نے پانی منظم کرنے والے بند کو تعمیر کیا تھا۔

یہ مکرب اپنے خاندان کے ۳۰ بڑے حکمرانوں میں سے پہلا حکمران تھا۔ اس نے آب پاشی کی طرف بہت زیادہ توجہ دی اور ایسے بند اور تالاب بنوائے جو مارب کی فراواں خوشحالی کا سبب بنے۔ اس حکمران کا عہد ۷ویں صدی قبل مسیح کا ابتدائی زمانہ تھا۔

محرم بلقیس کا معبد مارب کے علاقے کی سب سے زیادہ محفوظ اور قدیم عمارت ہے۔ یہ آج کے موجودہ گاؤں سے ۴ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ عوام کا مشہور معبد ہے جو چاند کے دیوتا "المقہ" کی پوجا کے لیے بنایا گیا۔ یہ بیضوی شکل کی بہت بڑی عمارت ہے جس کا اصل دروازہ شمال مشرق کی طرف کھلتا ہے۔ اس کے سامنے ۸ ستونوں کا پھاٹک ہے جو اس سے تقریباً ۱۰ میٹر کے فاصلے پر ہے۔

"محرم" لفظ کا مطلب "دیوتا کی مقدس جگہ" ہے۔ ملکہ بلقیس حضرت سلیمانؑ کے پاس آنے سے پہلے سبا پر ۷ سال حکومت کر چکی تھی۔ اس کے بعد وہ مزید ۲۳ سال حکمران رہی۔ ابن خلدون کے مطابق بلقیس سبا کے حکمرانوں میں چھٹے نمبر پر تھی۔

سدِ مارب

یہ زمانہ قدیم میں جنوبی عرب (موجودہ یمن) کے لوگوں کا ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال جب یا ما قبل زمانے میں نہیں ملتی۔ اس بند (Dam) کے کھنڈر زبان حال سے قوم سبا کے عروج و زوال کی داستان سناتے ہیں۔ بند اور قوم سبا کی تباہی کا ذکر قرآن پاک میں یوں آیا ہے:

"سبا کے لیے ان کی بستی میں ایک نشانی تھی، دائیں اور بائیں دو باغ۔ خدا کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو۔ شہر اچھا اور مغفرت والا پروردگار، لیکن وہ روگرداں ہو گئے تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ہم نے ان دونوں باغوں کو بدل کر ایسا باغ بنا دیا جس میں کسیلا پھل، جھاؤ اور کچھ بیری کے درخت اُگنے لگے۔ یہ ہم نے ان کو ان کے کفر کا بدلا دیا اور اس طرح کی جزا صرف کافروں کو دیتے ہیں اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان

جنھیں ہم نے بابرکت کیا تھا، ایسی اور بستیاں آباد کر رکھی تھیں جو دور سے نظر آتی تھیں اور (ہم نے کہہ دیا تھا کہ) ان راستوں میں دن رات امن کے ساتھ سفر کرو، پھر انھوں نے کہا خدایا ہمارے سفر کا فاصلہ دراز کر دے۔ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا اور ان کو تتر بتر کر ڈالا۔ یقیناً اس میں سچے کی باتیں ہیں ہر صبر کرنے والے شکرگزار آدمی کے لیے۔" (سبا: ۱۵تا۱۹)

سد مارب کی شکستگی جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور جو مارب کے زرخیز گردونواح کی تباہی کا باعث بنی، ۵۴۳ء اور ۵۷۰ء کے درمیان کہیں واقع ہوئی۔ یہ اس لیے ہوئی کہ انھوں نے خدا کا شکر ادا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ خدا نے ان کی طرف ۱۳ پیغمبر بھیجے جنھوں نے انھیں اللہ کے سیدھے راستے پر چلنے کی نصیحت کی، اللہ کی عنایات یاد دلائیں اور خدا کے عذاب سے ڈرایا، لیکن ان لوگوں نے کوئی پروا نہ کی اور کہا "ہم نہیں جانتے کہ اللہ نے ہم پر کوئی عنایت کی ہے۔"

اس سد (بند) کے دائیں بائیں ۲ باغ تھے۔ سد کے ٹوٹتے ہی یہ زمین بنجر ہو گئی۔ المسعودی (مؤرخ) بیان کرتا ہے کہ اس علاقے کی سرسبز اور مزروعہ زمین طے کرنے کے لیے ایک گھڑسوار کو ایک ماہ سے زیادہ کی مدت لگتی تھی۔ مسافر خواہ پیادہ ہو یا سوار، کو تمازت آفتاب (دھوپ) کا کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ وہ ہمیشہ درختوں کے سائے میں سفر کرتا۔ وہ پانی جو اس سد (Dam) سے اکٹھا ہوتا، مارب کے میدان اور حضر موت کا صحرا سیراب کرنے، انھیں باغوں میں بدل دینے کے لیے کافی تھا۔

ایک اور مؤرخ ابن رستہ ان باغوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سر پر ٹوکری رکھ کر ان باغوں سے گزرتا تو وہ خودبخود درختوں سے گرتے پھلوں سے بھر جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ سد کی تباہی مارب کے باشندوں کے لیے بھاری آفت تھی۔ پھر ان کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یا تو فوراً اس کی مرمت کریں یا وطن چھوڑ کر دوسرے مقامات میں چلے جائیں۔

چنانچہ بنو غسان اپنی بے چارگی دیکھ کر مجبوراً شام کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ تباہی ایسا اہم واقعہ تھا کہ اس سے انھوں نے اپنی نئی تاریخ جاری کی اور اس کا نام "عام السیل" رکھا۔ بند کی تعمیر ذومرعلی نے شروع کی تھی۔ بند کی بقیہ تعمیر اس کے بیٹے "یتاعمر بین" نے جاری رکھی۔ یہ عرصہ ۶۶۰ سے ۶۳۰ قبل مسیح تک کا بنتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بند کی تباہی ہوتی رہی اور وقتاً فوقتاً تعمیر بھی جاری رہی۔ آخری تباہی ابرہہ کے عہد (۵۷۰ء) کے کچھ عرصے بعد ہوئی۔ کھنڈروں سے دریافت ہونے والے کتبات میں سد کی مرمت کرنے والوں میں ابرہہ کا نام بھی شامل ہے۔ بند کی آخری تباہی اپنے ساتھ یمن کی مفلسی بھی لائی اور ایک بے حد زرخیز علاقہ اجاڑ میدانوں میں بدل گیا۔

رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے یمن میں عیسائیت کو فروغ ملنے لگا۔ لیکن اس دوران حیرت انگیز طور پر یمن کے شاہی خاندان نے یہودی مذہب اختیار کر لیا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ "ذونواس" (۵۱۰ء تا ۵۲۵ء) تھا جس نے نجران کے عیسائیوں کو سخت اذیتیں دیں اور ان کا قتل عام کیا۔ اس کے باوجود عیسائی اپنے مذہب پر پختگی سے قائم رہے۔ یہاں تک کہ ۵۲۳ء میں ذونواس نے حکم دیا کہ خندقیں کھودی جائیں تاکہ ان میں عیسائیوں کو پھینک کر جلا دیا جائے۔ اس واقعے کا ذکر قرآن پاک کی سورہ اخدود میں "اصحاب الاخدود" کے حوالے سے آیا ہے۔

اس بے رحمانہ اور وحشیانہ ظلم کی خبر سے تمام عالم عیسائیت پر لرزہ طاری ہو گیا۔ شہنشاہ روم نے حبشہ کے بادشاہ کو حکم دیا کہ وہ فوج لے جائے اور اپنے ہم مذہبوں کو نجات دلائے۔ حبشہ کا بادشاہ روانہ ہوا۔ ۵۲۵ء کے آنے تک حبشیوں کا سبا کے ملک پر قبضہ ہو چکا تھا اور ذونواس یا تو، جیسا کہ ایک روایت میں ہے، شکست کھانے کے بعد اپنے ہی ملازموں کے ہاتھوں مارا گیا۔ دوسری روایت میں ہے، گھوڑے سمیت دریا میں کود کر غرق ہو گیا۔

www.paksociety.com

ٹھٹھرتی زندگی کو ونٹر پیکج کا تحفہ

کمیونٹی ڈویلپمنٹ پراجیکٹ کے تحت ''الخدمت'' کا بیس ہزار افراد تک گرم کپڑوں کی ترسیل کا قابل قدر پروگرام

عمیر ادریس

جنوری فروری کی سرد راتیں ہوں، گرم لحاف میں دبکے، خشک میوہ کھاتے، یا قہوہ کے گرم گرم گھونٹ بھرتے، ٹی۔وی پر گلگت بلتستان یا کوئٹہ کے برفیلے مناظر نگاہوں کے سامنے آجائیں، تو...... چند ثانیے! جی ہاں محض لمحے بھر کو ٹھنڈک کی ایک لہر جسم و جاں میں ایسی کپکپی چھیڑتی ہے کہ رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔

ایسے میں آپ روزانہ یہ بھی دیکھتے اور سنتے ہیں کہ ہمارے ہزاروں، لاکھوں ہم وطن، بچے، بوڑھے، جوان، خواتین، ایسے ہی سرد موسم میں دن زندگی کی سختیاں جھیلتے گزارتے اور راتیں ہڈیوں میں اترنے والی سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔

وہ برف سے ڈھکے پہاڑوں، گلگت بلتستان کے دل موہ لینے والے مناظر میں نقطۂ انجماد سے بھی کہیں کم درجہ حرارت پر، اپنی رات جلد گزر جانے کی ان کہی دعا کرتے ہیں۔ ان کے ہونٹ کپکپاتے ہیں لیکن سردی کی لہر ادھ کھلے ہونٹوں سے ٹکراتی ہے اور لفظ بننے سے پہلے ٹوٹ جاتے ہیں۔

www.paksociety.com

آپ جانتے ہیں کیوں...؟

ان علاقوں میں ہزاروں بچے اور مرد وزن کسی گرم بستر سے بھی محروم ہیں۔ کہیں دن بھر مشقت سے چور مزدور ہے جو ٹانگیں اور بازو سینے سے لگائے اس سرد موسم کی شدت کو دھوکا دینا چاہ رہا ہے۔

یہ مناظر ہمیں فٹ پاتھوں پر، ویران گلیوں کے کونوں میں اور برائے نام گھروں کے ٹوٹے فرش پر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ بھی انسان ہیں...... شدید سردی میں گرم بستر سے محروم، یخ بستہ ہواؤں میں لحاف سے محروم، کسی گرم چادر اور تکیے سے بھی محروم۔

ایسے پاکستانی، ایسے ہم وطن کوئٹہ چمن کے پہاڑوں میں، مظفر آباد میر پور کے سرد لہروں کے کہساروں میں، پنجاب اور سندھ کے میدانوں میں، ہر جگہ مخیر ہستیوں اور ہم وطنوں کے منتظر ہیں۔ یہ وہ بے چارے لوگ ہیں سارے دن میں ۱۰۰ روپے بھی نہیں کما پاتے۔

الخدمت فاؤنڈیشن خدمت انسانی کے مقدس مشن میں مصروف عمل اپنی ایک قابل فخر تاریخ رکھتی ہے۔ وہ کمیونٹی ڈویلپمنٹ پراجیکٹ کے تحت ہر سال موسم سرما میں ملک بھر میں ''ونٹر پیکج ڈسٹری بیوشن'' پروگرام کا انعقاد کرتی ہے۔ اس میں الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے رضا کار، نادار اور مستحق افراد کا چناؤ کرتے ہیں جو کسمپرسی اور ناہموار حالات کے باعث گرم کپڑے اور لحاف خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس سارے عمل میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ امدادی سامان مستحق لوگوں تک ہی پہنچے اور یہ امر ہر حال ممکن بنایا جاتا ہے۔

ملک بھر میں الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے رضا کاران اپنے اپنے علاقوں میں انتہائی محنت اور خلوص سے مستحق افراد کی فہرست بناتے ہیں۔ الخدمت فاؤنڈیشن ہر سال آزاد کشمیر، گلگت وبلتستان، خیبر پختونخوا، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے مستحق افراد تک ونٹر پیکج کی فراہمی ممکن بناتی ہے۔ مزید براں ۲۰۰۵ء میں آزاد کشمیر اور خیبر پختونخوا میں آنے والا تباہ کن زلزلہ ہو یا ۲۰۰۸ء میں جنوبی پاکستان اور خیبر پختونخوا میں آنے والا سیلاب، ۲۰۰۸ء میں بلوچستان کا زلزلہ ہو یا ۲۰۰۹ء میں جنوبی وزیرستان اور مالاکنڈ میں ہونے والی فوجی کارروائی کے باعث لاکھوں بے گھر افراد، ۲۰۱۰ء میں ملک بھر میں آنے والا تاریخ ساز سیلاب ہو یا ۲۰۱۱ء میں سندھ بھر میں آنے والا سیلاب...... ان تمام سانحات میں لاکھوں افراد بے گھر ہوئے جنہیں بے سروسامانی کے عالم میں عارضی پناہ گاہوں میں رہنا پڑا۔

الخدمت فاؤنڈیشن کے رضا کاروں نے ان کے زخم پر بھی مرہم رکھتے ہوئے جہاں ان متاثرین کی دیگر ضروریات زندگی کا خیال رکھا، وہاں بے گھر افراد کے لیے گرم کپڑوں، لحاف اور بستروں کا انتظام کیا۔

الخدمت فاؤنڈیشن نے شدید سردی سے بے حال نادار اور مستحق افراد کی مجبوریوں اور حالات کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے ۳۰ ملین کی لاگت سے ۳۶،۰۰۰ افراد کے لیے گرم کپڑوں، لحاف اور بستر کا انتظام کیا ہے۔ جس کی ترسیل کا کام الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان کے صدر ڈاکٹر حفیظ الرحمن کی زیر نگرانی شروع کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر حفیظ الرحمن نے فاٹا میں فوجی کارروائی سے پیدا ہونے والی صورتحال کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے افراد میں ۳۲۰۰ ونٹر پیکج تقسیم کرتے ہوئے کہا کہ الخدمت فاؤنڈیشن کے تحت گلگت و بلتستان، آزاد کشمیر، جنوبی پنجاب، سندھ کے سیلاب زدہ علاقوں، فاٹا، خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے نادار اور مستحق افراد میں ونٹر پیکج تقسیم کیا جا رہا ہے۔ جس سے مستفید افراد سردی کی اذیت سے بچ سکیں گے۔ انہوں نے کہا کہ الخدمت فاؤنڈیشن بلاتفریق مذہب اور رنگ ونسل، اللہ کی مخلوق کی خدمت پر یقین رکھتی ہے۔ صدر الخدمت نے صاحب استطاعت افراد سے اپیل کی کہ اپنے بھائیوں کو سردی کی اذیت سے بچانے میں الخدمت فاؤنڈیشن کا ساتھ دیں، جو کسی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اور گرم کپڑے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ لیکن سردی تو انہیں بھی لگتی ہے۔ آئیے بے کسوں کا سہارا بننے کی یہی انسانیت ہے۔

www.paksociety.com

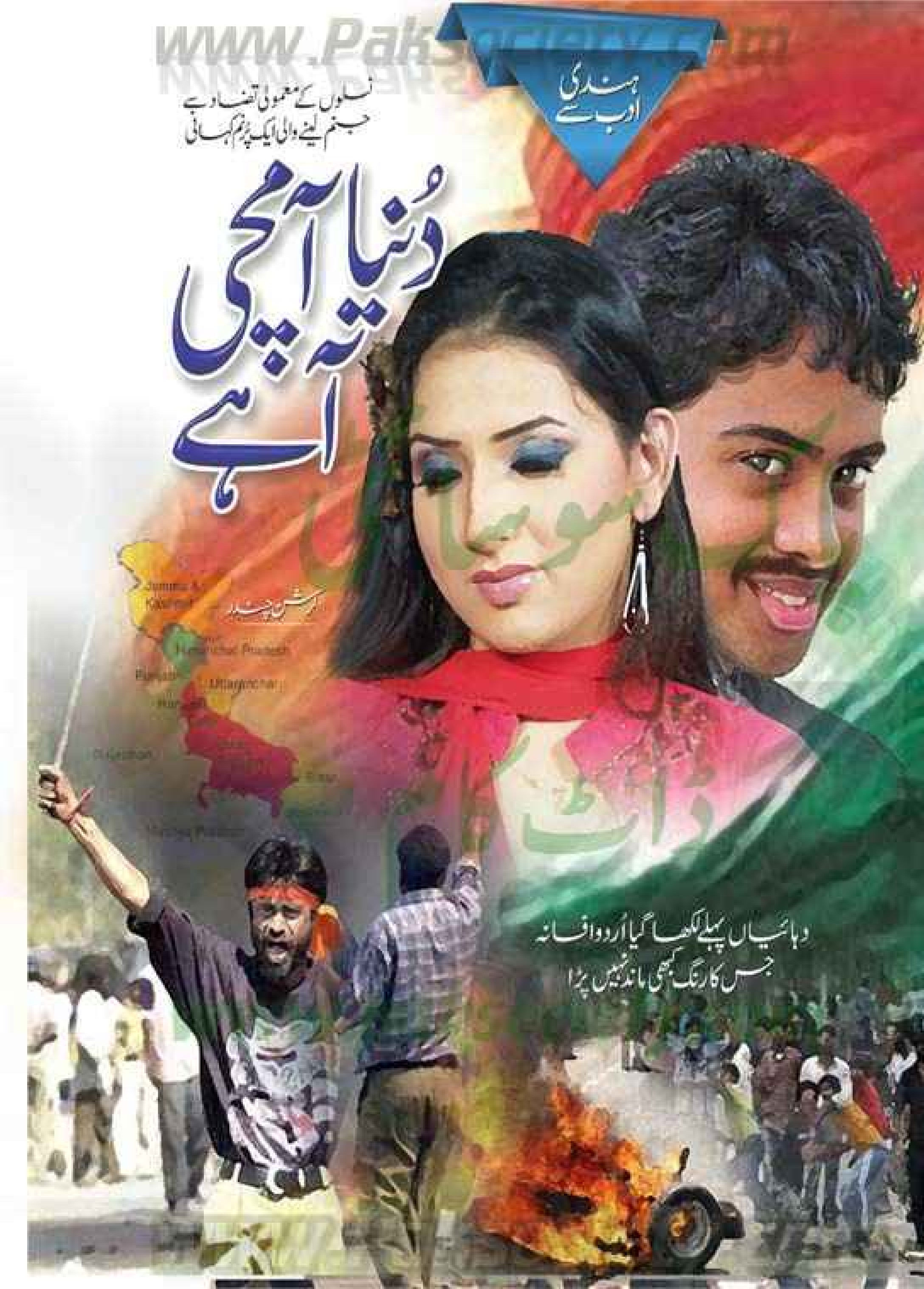

www.PakSociety.com

واسنت

مراٹھے کی شادی شاردا دیسائی سے ہوئی تھی۔ شاردا گجراتن تھی اور سنت مراٹھا۔ یہ شادی کبھی نہ ہوتی اگر واسنت کے باپ رام مراٹھے کا چیمبور میں لالٹین بنانے کا کارخانہ نہیں ہوتا۔ اس کے کارخانے کے قریب شاردا کا باپ مگن لال دیسائی اپنا کانچ کا کارخانہ کھڑا نہ کرتا۔ رام مراٹھے کے کارخانے میں لالٹین بنانے کا سامان تیار ہوتا تھا۔ سوائے کانچ کے ہنڈے کے، اور یہ ہنڈا دیسائی گلاس ورکس سے آتا تھا۔ اس لیے واسنت اور شاردا کی شادی کیا ہوئی گویا گھر کی لالٹین مکمل ہوگئی۔

واسنت ناٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان تھا اور دور سے بالکل اپنے کارخانے کی لالٹین کی طرح مضبوط، چوڑا اور سانولا نظر آتا۔ شاردا گورے رنگ، لانبے قد کی بڑی بڑی آنکھوں والی نازک بدن کانچ کی گڑیا سی دکھائی دیتی۔ شادی کے بعد دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی کیونکہ ہندوستان میں شادی پہلے ہوتی ہے، محبت بعد میں! یورپ میں محبت پہلے ہوتی ہے، شادی بعد میں۔ بچہ دونوں صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

واسنت اور شاردا کے دو بچے، لکشمن اور کملا تھے۔ لکشمن ۶؍سال کا تھا، کملا ۴؍سال کی۔ دونوں میاں بیوی بڑے مزے سے اپنے بچوں کے ساتھ چار کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے جس کا نام ''لالٹین نواس'' تھا۔ یہ فلیٹ مگن لال دیسائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔ جس دن لکشمن پیدا ہوا، اسی دن اس کے دادا مراٹھے نے اپنے پوتے کے پیدا ہونے کی خوشی میں لالٹینوں کے ساتھ ساتھ لوہے کے ڈرم بنانے کا کارخانہ بھی چالو کردیا۔ پھر جس دن شاردا کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی، اسی دن لڑکی کے نانا نے تھرمامیٹر بنانے کا کارخانہ بھی شروع کردیا۔ مگن لال دیسائی نے اپنے کارخانے کا سب سے پہلا ہیرومیٹر واسنت اور شاردا کے گھر لگایا تاکہ دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ''ٹمپریچر'' کا اندازہ ہوتا رہے۔

شادی کے ۷؍سال بڑے مزے سے کٹ گئے۔ پھر جس دن رنگاریڈی نے صابن بنانے کا کارخانہ شروع اور سردار جاتن سنگھ نے دادر میں دی گریٹ مون شائن فلم کمپنی کا مہورت کیا، اسی دن بمبئی میں ایک طوفان اٹھا، ہنگامہ ہوا، گولی چلی، ٹراموں پر پتھراؤ ہوا، سیکڑوں لوگ زخمی ہوئے۔ دوسرے دن اخبار دیکھ کر واسنت کی آنکھیں غصے سے لال ہوگئیں، اس نے اخبار کو زور سے ناشتے کی میز پر پٹخ دیا اور بولا ''چھ؟''

''سوں چھے؟'' شاردا بولی۔

واسنت نے کہا ''یہ اخبار بولتا ہے کہ بمبئی اکیلی مراٹھوں کی نہیں حالانکہ سب جانتے ہیں کہ بمبئی ہماری ہے، ہمیشہ ہماری رہے گی، ہم مراٹھوں کی!''

شاردا نرمی سے بولی ''ہاں ہاں بمبئی تمھاری ہے، بے شک تمھاری ہے لیکن وہ ہماری بھی تو ہے، ہم گجراتیوں کی۔''

''واہ! بمبئی تمھاری کیسے ہوگئی؟ بمبئی تو مراٹھوں کی ہے۔''

''نہیں! وہ گجراتیوں کی ہے۔'' شاردا ذرا غصے سے بولی۔

''یہ سارا شہر ہم نے بنایا، اس کا بزنس ہم نے چلایا، اس کا کارخانہ ہم نے لگایا...... تم کدھر سے حق جتانے لگے ہماری بمبئی پر؟''

''شہر تم نے بنایا لیکن اسے بسایا کس نے؟ بزنس ضرور تم نے چلایا لیکن اسے پھیلایا کس نے؟ کارخانہ لگایا تم نے لیکن وہاں کام کون کرتا ہے؟ ہمارے مہاراشٹر کا مزدور سمجھیں؟ بمبئی آمچی کا ہے۔'' واسنت نے آملیٹ چھری سے کاٹتے ہوئے کہا۔

''نا بمبئی ہماری چھے!'' شاردا آملیٹ پر نمک چھڑک کر بولی ''تمی گدی کھوٹا بولتا!''

''تمے جسے کہو چھے، تے چھوٹو چھے۔ شدن چھوٹو چھے!'' بمبئی آپنی آہے۔''

واسنت نے چائے کا چمچہ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ شاردا نے چھری کانٹے پلیٹ میں پھینک دیے۔ دونوں ناشتے کی میز سے اٹھ کر علاحدہ کمروں میں بند ہوگئے۔ بچے سہم کر سسکنے لگے۔ جب اس جھگڑے کی خبر مگن لال دیسائی اور رام مراٹھے تک پہنچی تو دونوں بوڑھے نوجوان میاں

www.paksociety.com

بیوی کی حماقت پر بڑے خفا تھے۔ رام مراٹھے نے مسکرا کر کہا
"مگن بھائی! ہمارے بچے بھی کس قدر بھولے ہیں۔ نہیں جانتے کہ مہاراشٹر بن جائے، چاہے گجرات الگ ہو جائے مگر گجراتیوں کو مراٹھوں کی ضرورت رہے گی اور مراٹھیوں کو گجراتیوں کی۔"

"ہاں، جیسے تمھاری لالٹین کو میرے کانچ کے ہنڈے کی ضرورت ہے اور میرے کانچ کے ہنڈے کو تمھاری لالٹین کی۔" مگن لال دیسائی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔" رام مراٹھا سر ہلا کر بولا۔

"تو چلو! چل کر ان دونوں بے وقوفوں کو سمجھائیں۔" مگن لال دیسائی نے تجویز پیش کی۔ دونوں بزرگ اسی وقت اپنی اپنی آرام کرسیوں سے اٹھے، موٹر میں بیٹھ کر لالٹین نواس پہنچے اور وہاں جا کر واسنت اور شاردا کو سامنے بٹھا کر سمجھانے لگے۔ واسنت کے باپ نے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا "شرم نہیں آتی، میری بہو کو تنگ کرتا ہے۔"

مگن بھائی نے شاردا سے کہا: "نالائق! اپنے پتی سے جھگڑا کرتی ہے؟"

"میں تو جھگڑا نہیں کرتی پتا جی!" شاردا سسکتے ہوئے بولی "یہی جھگڑا کرتے ہیں۔ بولتے ہیں تم گجراتی لوگ بہت خراب لوگ ہو، ہمیشہ ہم مراٹھوں کا حق مارتے رہتے ہو۔"

"ایسا؟" مگن لال دیسائی چوکنا ہو کر واسنت کی طرف دیکھنے لگا۔

واسنت نے سر جھکا کر اپنے باپ سے کہا "پتا جی! شاردا کہتی ہے کہ اکھا بمبئی گجراتی لوگوں نے بنایا اور اس شہر کا سارا کاروبار سارا دھندا گجراتی لوگ چلاتے ہیں۔ شاردا بولتی ہے کہ ہم گجراتی لوگ نہ ہوں تو مراٹھے بھوکے مر جائیں۔"

"ایسا؟" رام مراٹھے نے شاردا کی طرف گھور کر دیکھا اور گرج کر پوچھا "کیا تم نے ایسا کہا تھا؟" یہ کہتے کہتے وہ غصے سے کھڑا ہو گیا۔

پیشتر کہ شاردا کوئی جواب دیتی، اس کے باپ نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور خود رام مراٹھے کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا "اگر میری بیٹی نے نہیں بھی کہا تو میں اب کہتا ہوں کہ اس نے جو کہا وہ بالکل ٹھیک کہا۔"

رام مراٹھے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور بولا "اگر تمھاری بیٹی نے ٹھیک کہا تو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے نے بھی جو کہا، ۱۰۰ فیصد ٹھیک کہا۔ بمبئی آمچی آہے۔"

"بمبئی اماری چھے!" مگن لال دیسائی نے چلا کر کہا اور شاردا کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے بولا "چل بیٹی اپنے گھر چل، ہم کوئی ایسے گرے پڑے نہیں کہ تجھے پناہ نہ دے سکیں۔"

"جاتے ہو تو جاؤ۔" رام مراٹھے اپنی چھڑی ہوا میں گھما کر بولا "مگر کہے دیتا ہوں، دوبارہ اس گھر میں گھسے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"بڑے آئے ٹانگیں توڑنے والے، جیسے بمبئی تمھارے باپ کی ہے۔" واسنت کا باپ گرج کر بولا "جے مہاراشٹر۔"

"جے گجرات!" مگن لال دیسائی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اپنی بیٹی اور بچوں کو لے کر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆

آج واسنت کے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ شاردا کو گھر چھوڑے ایک سال بیت گیا تھا۔ ایک سال سے واسنت نے نہ شاردا کی صورت دیکھی تھی نہ بچوں کی۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہو گیا۔ بڑے بڑے فساد ہوئے، آپس میں لڑائی جھگڑے چلے مگر آخر میں سمجھوتا ہو گیا۔ بمبئی کا صوبہ تقسیم ہوا اور گجرات کا صوبہ الگ بن گیا۔ مہاراشٹر کا صوبہ الگ وجود میں آیا۔ پارلیمنٹ نے بھی بل پاس کر دیا۔ ہر چیز طے ہو گئی، ختم ہو گئی۔ ساری نفرتیں اور کدورتیں دھو ڈالی گئیں اور آج ۲۹ اپریل تو روشنیوں کا دن تھا۔ گانے، ناچ، جلسے، جلوس، ہنگامے، غل غپاڑے، تماشے، مشاعرے، نعرے، ڈھول تاشے، باجے گاجے۔ لوگوں نے آج ساری بمبئی میں روشنی کی تھی اور اسے دلھن کی طرح سجا دیا مگر واسنت کے اپنے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ سڑکوں کے دو رویہ درختوں پر بجلی کے ہزاروں قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ہواؤں میں خوش بو تھی، فضاؤں میں قہقہے تھے، عورتیں آنکھوں میں کاجل لگائے،

جوڑے میں شنیوتی کی ڈبی سجائے، بچوں کو انگلی سے لگائے اس کے فلیٹ کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔

واسنت کا دل اپنی بیوی بچوں کی یاد سے بے چین ہو اٹھا۔ کئی بار اس نے پہلے بھی سوچا تھا کہ وہ احمد آباد جائے اور اپنی بیوی سے صلح کر کے بچوں سمیت واپس بلا لائے مگر ہر بار جھوٹی انا اس کا دامن پکڑ کر روک لیتی۔ آج اسے نہ صرف شاردا بلکہ اپنے پیارے بچے بھی بہت یاد آ رہے تھے، ننھا لاکشمن اور بھولی کملا۔ ان دونوں معصوم بچوں کی صورتیں گویا اس کے دل کا دامن پکڑنے لگیں۔

وہ سوچنے لگا، بھلا اس نے کیوں اپنی بیوی سے جھگڑا کیا؟ بلاوجہ ہی اپنا گھر برباد کیا۔ بھلا کیوں؟ بمبئی کے مہاراشٹر میں آ جانے سے کیا اس کی صورت بدل گئی؟ کیا اس کا میرین ڈرائیو اٹھ کر پونا چلا گیا؟ کیا ٹرامے کا ایکٹر ناگ پور بھیج دیا گیا؟ کیا فورٹ کا علاقہ ناگ پاڑے میں آباد ہوا؟ کیا آج بھی لوگ سڑکوں پر نہیں سوتے؟ غلیظ کھولیوں میں نہیں رہتے؟ دکھ اور درد کا درماں نہیں ڈھونڈتے؟ مفلسی اور موت کا سامنا نہیں کرتے؟ پھر کس لیے اس نے اتنا جذباتی ہو کر اپنی پیاری بیوی سے جھگڑا کر لیا اور اپنے بچوں کو خود سے دور کر دیا؟

آج ہر گھر میں روشنی ہے، صرف اس کے گھر میں اندھیرا ہے۔ اب تو اس میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنے اندھیرے کونے سے اٹھ کر ایک بتی بھی روشن کر دے۔ وہ دیر تک اسی طرح جلتا، کڑھتا رہا۔ اندھیرے کونے میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے، ٹانگیں سکیڑے لیٹا رہا۔ اس کے چاروں طرف خوشیوں کا جلوس گزرتا رہا۔ دو تین بار اس کے کانوں میں آواز سی آئی، جیسے کوئی اس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو مگر آج وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اٹھ کر دروازے تک بھی نہ گیا۔

اس نے سوچا، جو بھی ہوا، خود ہی دروازہ پیٹ کر چلا جائے گا یا بہت ہی ڈھیٹ ہوا تو اندر آ جائے گا۔ پھر یکایک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی ''ارے! آج خوشیوں کے روز یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے؟'' آواز کے ساتھ ساتھ ایک بتی جلی۔ بتی کی روشنی میں واسنت نے دیکھا کہ دروازے میں شاردا بچوں کو لیے کھڑی مسکرا رہی ہے۔

ایک لمحے کے لیے چونک کر اس نے شاردا کی طرف دیکھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ پھر وہ یک لخت اپنی کرسی سے اٹھا، دوڑ کر دروازے کی طرف گیا، جھپٹ کر جلدی سے اپنے دونوں بچوں کو گود میں اٹھا لیا اور انھیں پیار کرنے لگا۔

شاردا نے یکایک منہ پھیر لیا اور بالکونی کے جنگلے کے قریب جا کر بولی ''شرم نہیں آتی لوگوں کو مہاراشٹر کے جنم دن پر میرے گھر میں اندھیرا کرتے ہیں۔''

واسنت کچھ نہ بولا مگر اس کی نگاہوں میں خوشی کے دیے قطار اندر قطار مسکرانے لگے۔ پھر وہ دھیرے سے اپنی بیوی کے قریب گیا اور سر جھکا کے بولا ''شاردا! مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آ گئی ہو؟''

شاردا نے بالکونی پر مٹی کے دیوں میں تیل ڈالتے ہوئے کہا ''کیوں نہ آتی! کیا یہ میرا گھر نہیں؟ کیا بمبئی شہر میرا نہیں؟'' شاردا نے بے خوف نگاہوں سے واسنت کی طرف دیکھ کر کہا ''بمبئی آمچی آہے۔''

واسنت نے مسکرا کر کہا ''تمھاری چھے! تدن تمھاری چھے! نہ صرف بمبئی تمھاری ہے، یہ گھر بھی تیرا ہے اور میں خود بھی تیرا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو اسٹامپ پیپر پر لکھوا لو۔''

شاردا کا چہرا خوشی سے گل نار ہو گیا۔ اس نے اپنا سر واسنت کے کندھے پر رکھ دیا اور جذبات سے کانپتی ہوئی بولی ''میں نے غلطی کی جو یہاں سے چلی گئی۔ میں بھول گئی کہ اس دیس میں نہ کچھ تیرا ہے نہ میرا، یہ سارا دیس ہمارا ہے اور یہاں جتنے بھی مراٹھے اور گجراتی، پنجابی اور سندھی، بنگالی، نیپالی، ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی، یہودی اور پارسی رہتے ہیں، ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں۔ گو صوبے الگ الگ ہیں مگر گھر ایک ہے، میں گجراتی ہوں تم مراٹھے مگر ہم دونوں کا مستقبل ایک ہے۔'' واسنت نے مسکرا کر شاردا کو گلے لگا لیا۔ پھر بچوں کو لیے باہر بالکونی میں آ گیا جہاں ان کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

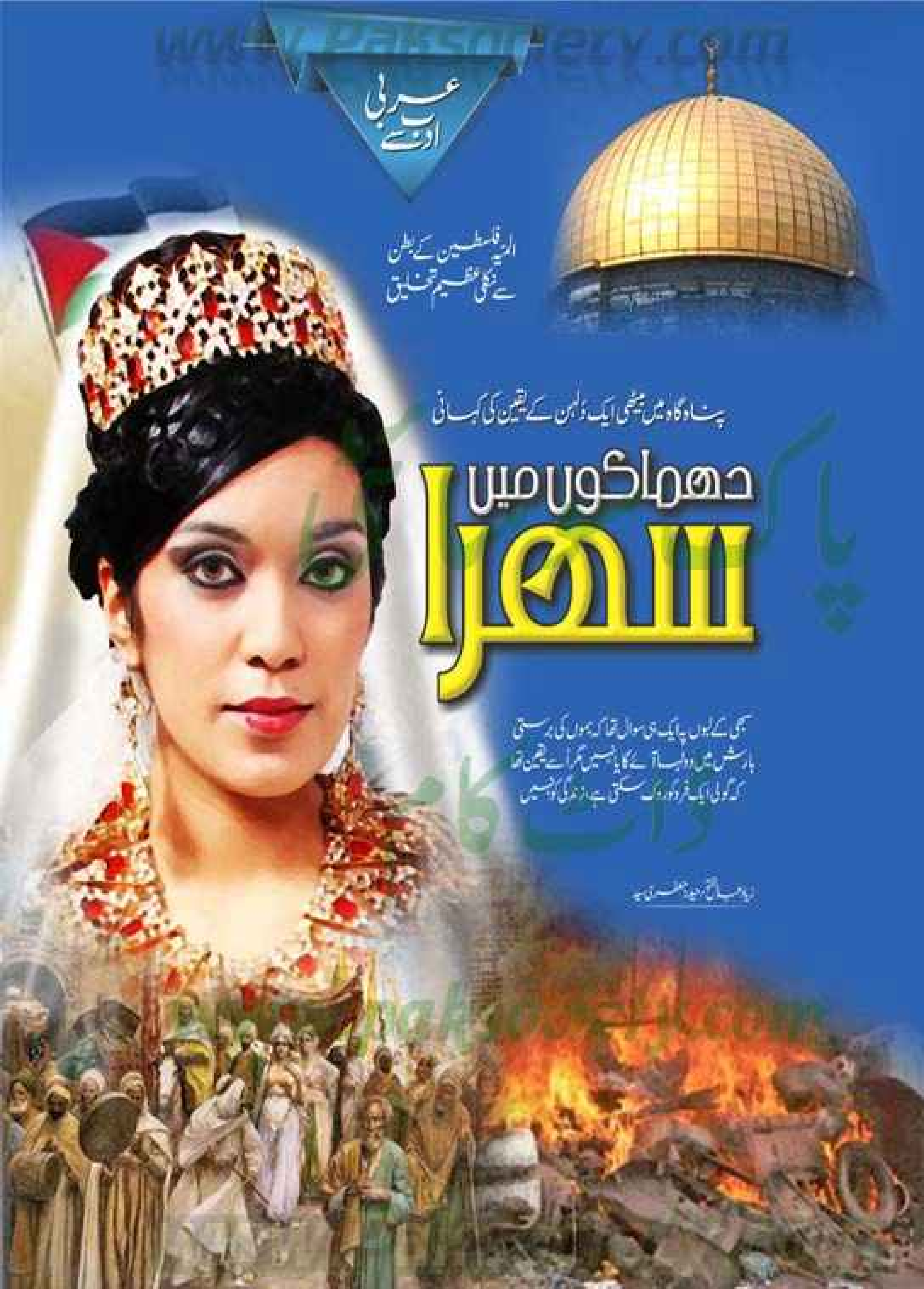

www.Paksociety.com

دُور

ہونے والے اکا دکا دھماکوں کی آوازیں تو آ رہی تھیں لیکن یہاں بمباری کچھ دیر رکی ہوئی تھی۔ غزہ کے اس جنوبی حصے میں چھائی ہوئی یہ غیر متوقع خاموشی چھتوں پر پھٹنے والے گولوں اور فائرنگ کی آواز سے کبھی کبھی ٹوٹ جاتی۔ دور سے دیکھنے پر لگتا جیسے اس علاقے میں دھند صاف ہو رہی ہے اور چار سو پھیلے ہوئے کھنڈرات کے باوجود علاقہ ٹھہر رہا ہے۔

خاموشی کے ان نایاب لمحات کے طفیل ہی لوگ اپنی ضروریات کی تکمیل کر لیتے۔ لیکن وہ گلی کوچوں میں کم ہی نکلتے۔ اس وقت گلی محلے میں سرکاری نل سے تھوڑا پانی لانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا۔ شوروغل سے محروم ان ہی لمحات میں بیٹی کی ماں مکان کی دوسری منزل سے دلہن کے غسل کے لیے تھوڑا سا پانی لے آئی۔ اسی دوران جشن منانے کی شائق چند خواتین ماحول طرب انگیز بنانے کے لیے شادی کے گیت جلدی جلدی گانے لگیں۔

پناہ گاہ میں بھی ہلچل مچ گئی۔ پرانے کمبلوں سے بنائے گئے پردوں کو ایک کونے میں لٹکا دیا گیا۔ گیس کے ہنڈے کی دھندلی روشنی میں خواتین دلہن کے قریب کھسک آئیں۔ ان سب نے کام آپس میں بانٹا ہوا تھا۔ کوئی دلہن کے ناخن رنگنے لگی اور کوئی اس کے گیسوؤں اور ملبوسات کی آرایش میں مصروف ہوگئی۔ گیس کے ہنڈے کی گرماہٹ سے دلہن کے چہرے پر آئے پسینے کو جب ایک خاتون نے پرانے تولیے سے پونچھا، تو رخساروں پر لگی کریم اور پاؤڈر بھی صاف ہوگئے۔

پناہ گاہ کے دوسرے حصے میں عمر رسیدہ حضرات اور خواتین جنھیں کوئی کام سپرد نہیں کیا گیا تھا، وقت کاٹنے کے لیے بات چیت کرنے لگے۔ بات چیت کا موضوع ان کی زندگی پر مسلط خوف اور اس سے نجات ہی تھا۔ کام میں مصروف اور خالی بیٹھے سب ہی لوگ یہ بات بھی سوچ رہے تھے کہ اب تک دلہا آیا ہے اور نہ سہرا گانے والے۔

اچانک کہیں قریب ہی بم پھٹا اور پناہ گاہ میں خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک شخص سکوت توڑتے ہوئے بولا ''سہرا گانے والوں کو تو بہت دور سے آنا ہے۔ کیا وہ یہاں آ سکیں گے؟''

''شاید......!'' ہم نے اُن سے کل کہہ تو دیا تھا اور انھوں نے وعدہ بھی کیا تھا۔'' دلہن کا ایک رشتے دار بولا۔

''حمرا میں تو بہت ہی شدید بمباری ہوئی ہے اور اس سے بھی زیادہ آنے والے راستے پر۔ اگر بمباری جاری رہی تو اُن کا آنا مشکل ہے۔''

''لیکن ہمیں تو زیادہ فکر دولہا کی ہے۔''

ہنڈے کی دھندلی روشنی میں ایک شخص نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ''اب تک تو اس کا کام ختم ہو چکا ہوگا۔ غالباً دولہا میاں راستے میں ہوں گے۔''

''کیا سہرا گانے والے اپنے ساز لا سکیں گے؟''

''ضرور...... اگر وہ یہاں آ سکے تو...... لیکن اب تو بمباری شدت اختیار کرنے لگی ہے اور غالباً کہیں آس پاس میں ہی ہو رہی ہے۔ ہر جگہ آگ لگی ہے۔''

اچانک پناہ گاہ کی چھت کا شہتیر جلنے لگا۔ سب خاموش ہوگئے۔ دلہن کی سہیلیاں بھی ساکت ہوگئیں اور ان کی انگلیاں کانپنے لگیں۔

''یہ بمباری تو سب کچھ تباہ کر دے گی......''

پہلے سے ہی خوفزدہ لوگوں کے دلوں کو اس بات نے اور بھی دہلا دیا۔ کہنے والے نے اپنی غلطی کا احساس کر کے بات سنبھالنے کی ناکام کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی کوئی بول پڑا ''کیا حماقت کی بات ہے۔ دلہا بھی آئے گا اور سہرا گانے والے بھی، انھیں تو شیرون (اسرائیلی جنرل) بھی نہیں روک سکتا۔''

بمباری تیزی سے ہونے لگی۔ تمام علاقہ بم کے ٹکڑوں سے پٹ گیا۔ بمباری قریب ہی ہو رہی تھی جس سے محسوس ہوتا تھا کہ قریب کا کوئی مورچہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ غزہ کے اس حصے کو بچانے کے لیے گزشتہ ۲ ہفتوں سے گھمسان کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

''شاید ہمارا دفاعی حصار ٹوٹ گیا۔''

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

دلہن بھی گھبرانے لگی۔ اس نے اپنی ہمت برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی پھر بھی کاجل سے کالے دو آنسو آنکھوں سے ٹپک ہی پڑے اور رخساروں پر لگی کریم اور پاؤڈر میں گھل مل گئے۔ دلہن کی سہیلیاں پریشان ہو گئیں۔ وہ بھی سوچ رہی تھیں کہ دولہا میاں آئیں گے یا نہیں؟ سبھی کے لبوں پر یہی سوال تھا ''آخر ہمیں ساری دنیا کی طرح شادی امن و سکون سے کیوں کرنے نہیں دی جاتی؟''

پناہ گاہ کے تہ خانے سے گولے گرتے ہوئے تو نظر نہ آتے لیکن ان کے دھماکے محسوس کیے جا سکتے تھے۔ دل ہلا دینے والے دھماکے، بموں کے اڑتے ٹکڑے، کھڑکیوں کے شیشوں کی بکھرتی کرچیں، دور دہشت اور گھٹن، فکری خلا میں تبدیل ہوتا ہوا تسخیر زماں و مکاں کا یوٹوپیا اور تخیل کو فنا کرنے پر آمادہ گولیاں۔

اچانک دلہن چیخی ''وہ آئیں گے، تم سب خاموش کیوں ہو، تیاری کرو۔'' وہ پھر قریب کھڑی ایک سہیلی کے ہاتھ سے کپڑا کھینچ کر آنسو پونچھتے ہوئے بولی ''مجھے کاجل اور پاؤڈر دو۔ ہماری زندگی کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ گولی کسی ایک فرد کو ہلاک کر سکتی ہے لیکن زندگی کو نہیں۔''

پیکر حسن و جمال، مجسم ناز و انداز، بے نظیر دلہن جب اپنی شادی کی تیاری کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تو ایسا لگا وہ پناہ گاہ نہیں بلکہ بموں کے دھوئیں سے پیدا ہونے والے آسمان پر کھڑی ہے۔

☆☆☆

دولہا اپنے رفقا کے ساتھ کام میں مصروف تھا، تب ہی اس نے دلہن کو پہلی بار دیکھا جو مجسمہ حسن تھی۔ بموں کے دھماکوں سے بے نیاز لڑکی نے اپنے ساتھیوں کو بتایا تھا ''دشمن ہمیں شکست نہیں دے سکتا۔ ہم ... ان پر شدید حملہ کر کے انھیں نیست و نابود کر دیں گے۔ دشمن ہمارے اوپر جہازوں سے بم گرا سکتا، ہمارے ٹھکانے تباہ کر سکتا، ہمارے مورچے روند سکتا ہے لیکن پھر بھی ہم شکست تسلیم نہیں کریں گے اور موقع ملتے ہی انھیں بھگا کر دم لیں گے۔''

لڑکے نے یہ سن کر لڑکی کو بہت سراہا اور اس کے قریب ہو گیا۔ انھیں باتیں کرتا دیکھ کر ان کا ساتھی بولا ''میرا تو محبت کرنے کا وقت بیت گیا لیکن یہ خمار آلود آنکھیں، سیب جیسے گلابی رخسار...... تم دونوں کی جوڑی کتنی جچتی ہے؟''

لڑکی شرما کر نیچے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے سر اٹھایا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بموں کے دھماکوں میں دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پھر وہ ایک دوسرے کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔ تب ہی دور بجلی چمکی اور اداسی چھا گئی۔

زندگی رواں دواں تھی مگر محبت کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ اسی شام جب خون آلود سورج، سمندر میں اپنا سفر ختم کر رہا تھا، کسی تمہید کے بغیر اس نے کہا ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنا شوہر تسلیم کرو گی؟''

''اتنی جلد؟''

''زیادہ وقت نہیں ہے۔''

وہ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر اس نے کہا ''ہم شادی کریں گے۔'' ماضی کی یادیں دلہن کے چہرے پر تبسم بن کر رقصاں ہو گئیں۔

اچانک مردوں میں ہلچل مچی اور ساتھ ہی عورتوں میں گہما گہمی شروع ہو گئی۔ تب ہی ایک بم پھٹنے کا دھماکا ہوا اور کسی نے دلہن کے کان میں کہا ''دولہا آ گیا۔'' دلہن نے کچھ نڈھال سی ہو کر اپنے رب کا شکریہ ادا کیا۔

وہ اٹھی تو اس کی مسرت کی حد نہ تھی۔ دولہا خاکی وردی میں ملبوس تھا۔ کمرے کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی مخموری آنکھوں سے ظاہر ہونے والا اعتماد اور عزم اسے شاہانہ انداز عطا کر رہا تھا۔

افراتفری اور بے چینی کچھ کم ہوئی۔ عجلت میں بنائے گئے پردے کو تھوڑا سا کھینچا اور پھر پورا کھینچ دیا گیا۔

تب ہی تھرتھراتی دیواروں اور بموں کے دھماکوں کے درمیان سہرا گانے والے بھی آ پہنچے۔ سب ہی کے چہروں پر امنگ تھی اور وہ گلی میں ہونے والی بمباری سے بے خبر تھے۔ بمباری تو نغمہ سرا کی الاپ تلے دب گئی تھی۔

www.Paksociety.com

پشتو ادب
ایک بہن کی داستان، اُسے
اپنے بھائی کی یاد بہت ستاتی تھی
مِٹی کا ڈھیر
دنیا کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے والوں کو
کچھ یاد دلاتی ایک طرح دار کہانی
زیتون بانو

جب میری نانی مر گئی تو ماں اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کو اپنے گھر لے آئی۔ میرے نانا پہلے وفات پا چکے تھے، ماں کی شادی سے بھی بہت پہلے۔ یہی وجہ تھی کہ ماں اسے گھر لے آئی۔

کہتے ہیں میرا ماموں خصلت اور عادات و اطوار میں مثالی آدمی تھا، بے حد نیک اور بے ضرر، اتنا بے ضرر کہ سوئے ہوئے آدمی کو جگانا بھی اس کے نزدیک معیوب تھا۔ جیسا کہ سنتے آئے ہیں کہ نیک آدمیوں کی زندگی مختصر ہوتی ہے۔ میرے ماموں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ دو دن بخار ہوا اور تیسرے دن چل بسا۔

ماں رو رو کر بے حال ہو گئی۔ دوسرے دن بھائی کی قبر پر گئی تو شدت غم سے بے ہوش ہو کر گر گئی۔ ہماری دوسری رشتہ دار عورتیں یہ صورت حال دیکھ کر گھبرا گئیں اور انھوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ خود میں بھی ان دنوں چھوٹی سی تھی، چنانچہ دہاڑیں مار کر رونے لگی۔

قبرستان کے چوکیدار شوضل کاکا نے شور سنا تو دوڑا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ ہماری ایک رشتہ دار عورت نے پورا کٹورا ماں پر انڈیل دیا۔ ماں کے کپڑے بھیگ گئے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ سفید برقع جسے وہ آدھا الٹا چکی تھی، بکھرا پڑا تھا۔ لاش کی طرح زرد رنگ اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ماں کی یہ حالت دیکھ کر میں دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑنے اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ ماں بھی ماموں کی طرح مر چکی اور سفید کفن میں لپٹی ہوئی ہے۔ آج بھی ان لمحوں کی یاد آئے، تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میری روح کانپ جاتی ہے۔

دو تین روز بعد جب ماں دوبارہ ماموں کی قبر پر گئی تو میرے اور ہماری نوکرانی ولاجان بی بی کے علاوہ کوئی ساتھ نہ تھا۔ اچانک ماں کی حالت پھر بگڑ گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ قبرستان کا چوکیدار شوضل کاکا دوبارہ ہماری مدد کو پہنچا اور ولاجان بی بی سے کہنے لگا "گھر والوں کو کہہ دو، بیگم صاحب کو قبرستان نہ آنے دیں۔ خواہ مخواہ روگ لگ جائے گا۔ اگر بہت ہی مجبوری ہے، ضرور آئے، تو چند روز ناغہ کرنے کے بعد آئے۔ آہستہ آہستہ غم ہلکا ہو جائے گا۔"

ماں ہوش میں آئی تو ولاجان بی بی نے شوضل کاکا کی بات دہرائی۔ ماں رونے لگی، بولی:

"اکلوتے بھائی کا غم بھی کبھی کم ہوگا؟ ایسی جوانمرگی کی موت، کلیجا کٹ کٹ جاتا ہے۔ بے چارہ دلہن کے چہرے کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھا سکا۔ ہائے موت کو بھی ترس نہ آیا!" ماں پھر رونے لگی۔ "باپ کا خون اور ماں کی آخری نشانی۔ موت کے بعد بھی ماں کے کیا کیا ارمان تھے، پختہ قبر بنانے کی آرزو اور اس پہ سرخ سبز جھنڈے لہرانے کی حسرت، لیکن خدا جانے ایسا ہوا کیوں نہیں!"

اب کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ ماں قبرستان نہیں جاتی۔ بھائی کی قبر پہ ہاتھ رکھ کر زار و قطار روتی۔ میں حیران ہوتی کہ آنسوؤں کا یہ رواں دواں کارواں ختم کیوں نہیں ہوتا؟ یہ ڈھیروں پانی کہاں سے آتا ہے۔ وہ پھر قرآن مجید کھولتی، پڑھتی اور ہچکیاں لے لے کر تلاوت کرتی۔ آنسو تھے کہ پھر بھی نہ تھمتے۔ لیکن احتیاط کرتی کہ بہتے آنسو قرآن کے صفحات کے بجائے دائیں بائیں گریں۔

وہ پھر پنج سورہ لے کر جانے لگی۔ اب میں اور ماں ہی قبرستان جاتی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ قبر پر جانا کم ہونے لگا۔ جمعرات کے جمعرات اور پھر بتدریج مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار، یوں ایک سال گزر گیا۔ اب شب قدر یا عید آتی تو ماں ماموں کی قبر پر چلی جاتی۔ پھر ایک وقت آیا میں اس سے کہتی "ماں، ماموں کی قبر پر نہیں جانا؟ اب تو ۲۰ سال بیت گئے ہیں۔"

تب ماں چونکتی، ٹھنڈی آہ بھرتی اور کہتی "ہاں بیٹی! اس جواں مرگ کو مرے ۲۰ سال ہو گئے۔ زندگی بھی کیا ہے، ۲۰ سال آنکھ جھپکتے گزر گئے جیسے کل ہی وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوا تھا۔"

ماں کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ تب مجھے وہ وقت یاد آ جاتا جب ماں قبر پر دہاڑیں مارتے ہوئے بے ہوش ہو

www.paksociety.com

جاتی تھی۔ بہت فرق تھا تب میں اور اب میں۔

پھر وہ وقت بھی آگیا کہ ماں نے قبرستان جانا بالکل ہی ترک کر دیا۔ اسے یاد ہی نہ رہتا، فرصت بھی نہ ملتی۔ اگرچہ میں چھوٹی تھی مگر مجھے اب تک یاد ہے کہ اس سال بہت بارشیں ہوئی تھیں۔ شوضل کاکا نے یہ خبر پہنچائی کہ ماموں کی قبر زمین میں دھنس گئی اور تختے ٹوٹ گئے ہیں۔ مجھے اس خبر سے یوں فکر ہوئی کہ کہیں ماں کو پھر دورہ نہ پڑ جائے۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ ماں پر اس خبر نے کوئی اثر نہ کیا۔

میرے بھائی نے کہا "ماں تم کہو، تو کسی کو ساتھ لوں اور ماموں کی قبر ٹھیک کر دوں؟"

ماں نے کسی جذبے کے بغیر سرد لہجے میں کہا "کیچڑ اور پانی میں کیا اپنے آپ کو دق کرو گے۔ شوضل کاکا سے کہہ دو، مزدور لگا کر ٹھیک کرلے۔"

پھر اچانک ابا کا تبادلہ ہوگیا۔ ہم سب عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں سے گلے ملے، دعوتیں ہوئیں۔ لیکن کسی کو یاد نہ رہا کہ ماموں کی قبر پر دو پھول ہی ڈال آئیں۔ یوں تبادلے ہوتے رہے، وقت گزرتا رہا۔ دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں بدلتے گئے۔ ابا کو پنشن مل گئی اور ہم گاؤں واپس آگئے۔

میرا خیال تھا، وطن واپس ہوتے ہی ماں فوراً ماموں کی قبر پر جائے گی۔ میں انتظار میں تھی۔ ہفتہ گزر گیا، ۲ ہفتے گزر گئے، مہینا گزر گیا، ۲ مہینے گزر گئے۔ مگر کسی کو خیال نہ آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ماں سے کہا "ماں قبرستان نہیں جاؤ گی؟"

ماں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کر رہی ہو۔ پھر بولی "ہاں چلے جائیں گے نا! مگر ابھی اپنے پرایوں کی دعوتیں ختم نہیں ہوئیں۔ سامان بھی اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔ ذرا سانس لے لیں پھر جائیں گے۔"

لیکن میں نے اصرار کیا "نہیں ماں، آج جائیں گے ماموں کی قبر پر۔"

ماں چند لمحے غیر ارادی طور پر مجھے دیکھتی رہی اور پھر آخر چل پڑی۔ ہم نے حیرت سے پہلے قبرستان کو دیکھا۔

اگر وہ خودکشی کر لیتا......

جرمنی کا ایک آدمی ۲۵ برس کی عمر میں زندگی سے اتنا بیزار ہوگیا کہ سوائے خودکشی کے اسے کوئی اور ذریعہ نجات نہ سوجھا۔ اسے محبت میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس نے خودکشی کا ایک باوقار طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر جرمنی کی تاریخ میں بھی آتا ہے۔ جرمنی کے ایک بادشاہ اوتو نے ایک لڑائی میں شکست کھائی، تو اپنا خنجر دل میں گھونپ کر خودکشی کرلی تھی۔

جرمنی کے اس ۲۵ سالہ جوان نے ایک خوبصورت دستے والا چمکتا دمکتا خنجر خریدا اور رات کو اپنے پاس رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ لیٹے لیٹے خنجر اپنے دل میں اتار لے گا مگر خنجر کی نوک دل کے مقام پر رکھی تو اسے خیال آیا کہ وہ خنجر اپنے دل میں اتنا گہرا نہیں اتار سکے گا کہ وہ مر جائے۔ وہ دراصل موت سے ڈر گیا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا اور ساتھ مایوسیاں بھی ذہن سے نکال پھینکیں اور زندہ رہنے کا تہیہ کرلیا۔

وہ زندہ رہا اور علم و ادب کی دنیا میں اتنا مشہور ہوا کہ ساری دنیا میں شہرت پائی۔ اس کا نام گوئٹے تھا۔ جس کا شہرۂ آفاق ناول فاؤسٹ ہے۔ وہ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۸۲ برس کی عمر میں ۱۸۳۲ء میں فوت ہوا۔

(احمد الاریب پتوکی، حاصل پور)

اب تو بیچارے کی قبر کی ڈھیری بھی نہیں ملتی نام کیا مٹا، نشان بھی مٹ گیا آؤ واپس چلیں

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب مزید ایک قبر کی گنجائش نہیں۔ رکھ کے درخت بھی تقریباً ختم ہو گئے۔ وہ چھوٹا سا میدان بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس میں جنازے کی نماز پڑھی جاتی تھی۔

ماموں کی قبر کے قریب ایک چھوٹا سا درخت تھا، وہ بھی نظر نہیں آیا۔ تلاش کے باوجود ماموں کی قبر شناخت نہ ہو سکی۔ ماں نے اپنا سفید برقع پیچھے کی طرف ڈال لیا تھا جس کے زمین کو چھوتے کناروں سے قبرستان کی سوکھی گھاس اور کانٹے الجھ گئے۔ ماں نے برقع اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور بولی "اب تو بیچارے کی قبر کی ڈھیری بھی نہیں ملتی۔ نام کیا مٹا، نشان بھی مٹ گیا۔ آؤ واپس چلیں۔"

ماں واپس ہونے لگی۔ اس کا یہ رویہ مجھے عجیب ہی نہیں برا بھی لگا۔ میری بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ وہ سب کچھ یاد آ گیا کہ ماموں کی موت پر ماں کی کیا حالت ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے سوچا "یا اللہ، یہ وہی عورت ہے جو چند سال پہلے بھائی کی موت پر خون کے آنسو روتی رہی تھی اور کئی بار بے ہوش ہوئی۔ اب اس کا دل پتھر کا ہو چکا ہے۔"

میں نے اس سے کہا "ماں، تم تو کہتی تھی، ماموں کی قبر پکی بنواؤں گی!"

"ہاں بیٹی! لیکن اس سے کیا فرق پڑتا؟ میں سونے کی قبر بھی بنوا دیتی مگر میرے بعد کون تھا کہ اسے یاد رکھتا اور پھر قبریں بھی ایک دن مٹی ہو جاتی ہیں۔ نشان تک باقی نہیں رہتا۔"

ماں واپسی کا ارادہ کر رہی تھی، مگر میرا دل نہیں مانا۔ ماں کو وہیں چھوڑ کر میں چوکیدار کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑی۔ سوچ رہی تھی، شوشل بابا زندہ بھی ہوں گے یا نہیں؟ اسی لمحے ایک سفید باریش آدمی کو دیکھا جو ہڈیوں کا چھوٹا سا متحرک ڈھانچہ تھا۔ فوراً خیال آیا کہ یہی شوشل بابا ہوگا؟

قریب پہنچی اور غور سے دیکھا تو وہی تھا۔ پوچھا! "بابا! اگر یاد ہو، بہت عرصہ ہوا ایک نوجوان اس قبرستان میں دفن ہوا تھا۔ صبح اس کی بہن قبر پر آتی اور روتے روتے بے ہوش ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے، آپ نے اسے آنے سے منع کیا تھا کہ خواہ مخواہ روگ لگ جائے گا۔ مگر اب اس نوجوان کی قبر نہیں ملتی؟"

اس کے بعد میں نے شوشل بابا کو اپنے باپ کا نام بتایا اور یہ بھی کہ وہ میرے ماموں کی قبر تھی۔ شوشل بابا نے اوپر سے نیچے دیکھ کر میرا جائزہ لیا، پھر اطمینان سے بولا:

"بیٹی! یہاں بہت سی مائیں اور بہنیں بھائیوں اور بیٹوں کی قبروں پر بے ہوش ہوتی رہی ہیں۔ یہ سب قبریں اور مٹی کی ڈھیریاں جو آپ کو نظر آتی ہیں، ان میں دفن پیاروں کے زخمی دلوں کا درد آنسوؤں کی شکل میں بہتا رہا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے وقت کے دھاگوں نے ان گہرے زخموں کو رفو کر دیا۔ اشکوں کی جگہ آہوں نے لے لی۔ پھر یہ آہیں بھی وقت کی آندھی اڑا کر لے گئی۔ وہ لوگوں کے دلوں سے اپنے پیاروں کی یادیں بھی سمیٹ کر لے گئی۔ وقت کی یہی آندھی ان قبروں پر بھی گزری جس نے انھیں مٹی کی ڈھیریوں میں تبدیل کر دیا۔ پھر ایک وقت آئے گا یہ ڈھیریاں بھی ناپید ہو جائیں گی اور پھر لوگ پیاروں کی قبروں پر ہل چلا دیں گے......"

خدا جانے شوشل بابا اور کیا کچھ کہتا رہا، میں سن نہ سکی کیونکہ ماں بلند آواز سے مجھے بلا رہی تھی "آؤ بیٹی، بہت دیر ہو گئی ہے۔" میں نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا اور چل پڑی۔

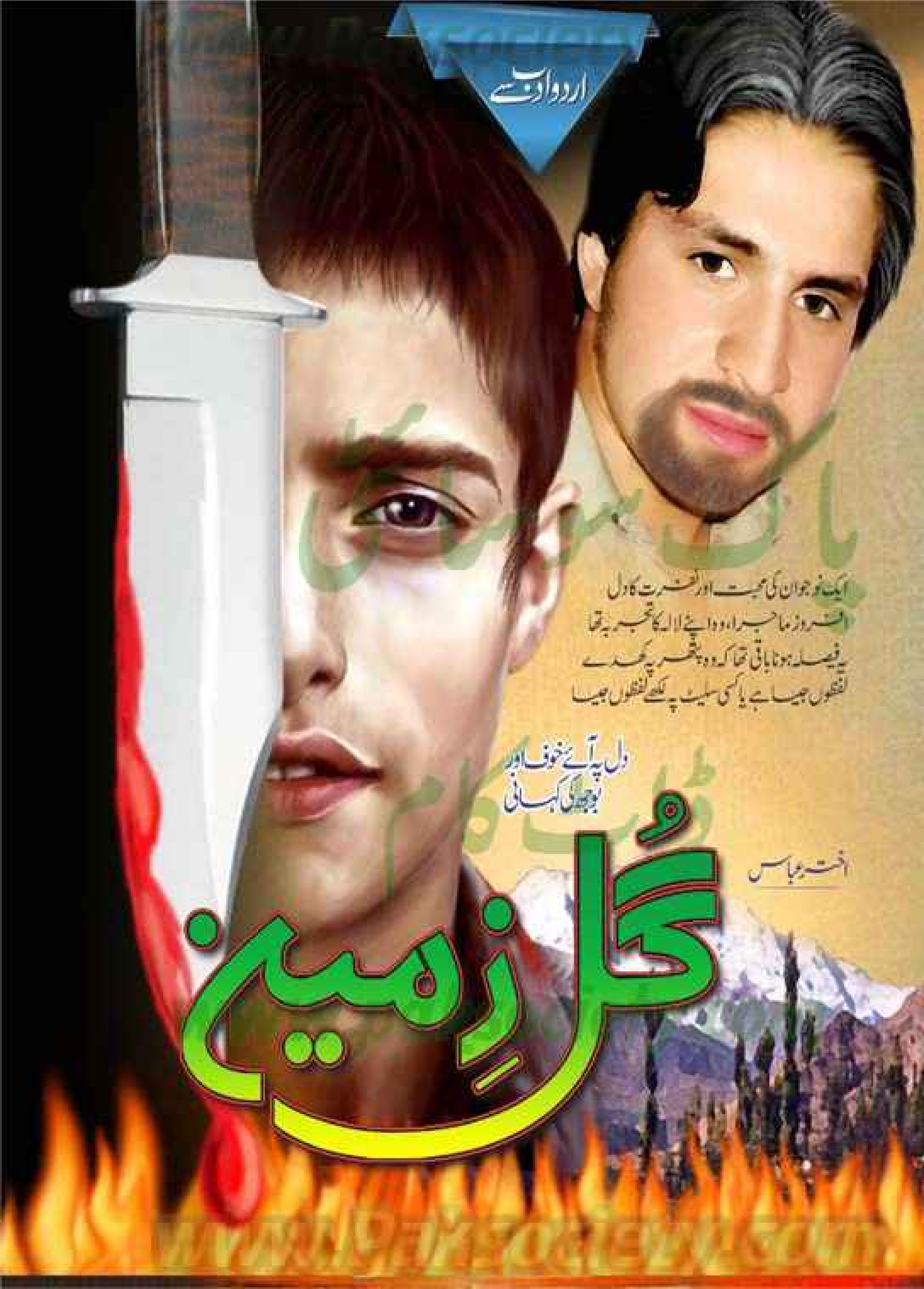
اردو ادب سے
ایک نوجوان کی محبت اور نفرت کا دل
افروز ماجرا، وہ اپنے ابا کا تجربہ تھا
یہ فیصلہ ہونا باقی تھا کہ وہ پتھر پہ کھدے
لفظوں جیسا ہے یا کسی سلیٹ پہ لکھے لفظوں جیسا
اختر عباس
گُل زمین

مجھے

چابی دینے والی گھڑی ہو یا کھلونا، کبھی اچھا نہیں لگا۔ شاید اسی لیے لوگوں کے بیچ تعلقات میں جب بھی چابی دے کر انھیں زندہ رکھنے کی صورت اور ضرورت نظر آتی ہے، مجھے افسوس سا گھیرے رکھتا ہے۔

محبت کو بھی چابی کی ضرورت کیوں ہوتی ہے، ہر تھوڑے وقفے کے بعد۔ یہ محبت کسی ڈیجیٹل (Digital) گھڑی جیسی کیوں نہیں ہوسکتی۔ محبت تو خود انسان کو ایسا بنانے پہ قادر ہے کہ زندگی بغیر چابی والے پرزوں کے بھی چلتی رہے۔ پیار اور یقین کا امر ایک عمر کے لیے کافی ٹھہرے۔ کاش یہ بات میں کسی طرح گل زمین کے کان سے بھی نکال دیتا۔ اسے یہ یقین دلا دیتا کہ وہ مجھے کس قدر محبوب ہے اور اس سے میرا تعلق کسی چابی دینے والی گھڑی جیسا نہیں۔

ہمارے بیچ میں پندرہ سال تعلقات چابی والی گھڑی کی طرح چلتے رہے۔ وہ ہمیشہ چابی دیے جانے کا ہی انتظار کرتا رہتا۔ اب بھی یقیناً وہ اسی عمل کا منتظر ہوگا مگر میں کیا کروں، وہ میرے سامنے ہے، نہ آس پاس کہ بڑھ کر اپنائیت سے، اس کی تعریف کے چند جملوں کو چابی کی طرح گھماؤں اور ایسے لگے کہ گھڑی حسب معمول چل رہی ہے اور میری تمنا اور توقع کے مطابق اس کی زندگی نکھر رہی ہے۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ ہماری پہلی ملاقات میں بھی ایک گھڑی ہی واسطہ بنی۔

میں گاڑی کا موبل آئل بدلوانے ورکشاپ گیا تھا۔ بخت خان گاڑی کے نیچے تھا، مٹی اور تیل سے بھرے ہاتھوں سے پیچ کھول رہا تھا اور میں گاڑی سے ٹیک لگائے ''ناقابل ذکر'' پڑھ رہا تھا۔ گاڑی میں رکھی کوئی نہ کوئی کتاب میری Bed Book جیسی ہوتی ہے جو فارغ لمحوں کے انتظار میں رکھی رہتی ہے۔ جب اور جو بھی کہیں آتے جاتے، راہ چلتے، جام ٹریفک میں۔ کسی کے انتظار میں مجھے وقت ملتا ہے۔ اسے کھول کے بیٹھ جاتا ہوں۔ میں نے بہت ساری کتابیں اسی طرح پڑھ ڈالیں۔ گھر جا کر آرام سے بیٹھ کر پڑھنے کی خواہش پوری ہونے کے انتظار میں رہتا تو یہ کب ہوتا تھا۔

''صاحب کیا ٹیم (Time) ہوا ہے؟'' دس بارہ سال لڑکے نے میرے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ لال سرخ چہرے پہ گریس کے بے شمار دھبوں اور میلے تیل بھرے کپڑوں کے باوجود وہ پیارا لگ رہا تھا۔

میری زندگی میں پہلی نظر ہمیشہ بہت حاکم رہی ہے۔ رہبر اور راہنما رہی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ پوری اصولی منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور یہ نظر خود ہی چیف ایگزیکٹو بن کر فیصلے شروع کر دیتی ہے۔

اس بچے کو وقت بتا کر دو چار باتیں کیں۔ وہ ٹوٹی ہوئی اُردو میں جواب دے رہا تھا۔ تب بخت خان نے اسے آواز دی۔ وہ ۹ نمبر پانا مانگ رہا تھا۔ وہ کام سے فارغ ہوا تو میں نے اس بچے کے بارے میں پوچھا۔ تفصیل بتاتے ہوئے وہ بخت افسردہ اور آزردہ تھا۔

''چھوٹا سا بچہ ہے۔ پہاڑ جیسی ذمے داری آن پڑی ہے۔ کیا کروں، نہ رہنے کو ڈھنگ کی جگہ ہے، نہ پہننے، کھانے کو۔ میں نے تو اسی طرح زندگی گزار دی، اب بھی رات کو ویگن کی پرانی نشست پر آرام سے سو جاتا ہوں۔ اس کا کیا کروں۔ پیچھے گھر والوں نے میرے سر منڈھ دیا ہے اور خیال رکھنے کا زبان لیا ہے۔ بن ماں باپ کا بیٹا ہے۔ کچھ لوگ اس کی جان کا دشمن ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ اس کا تو کسی نے پوچھنے بھی نہیں آنا۔ تو ذمے داری تو زیادہ ہوگئی نا یارا۔''

بخت خان کو بے شک ٹھیک سے گرامر نہیں آتی تھی مگر اپنا مفہوم بتانا خوب آتا تھا۔

دل پہ عجیب بوجھ سا لیے میں واپس آ گیا۔ رات نہ کام میں جی لگا، نہ پڑھنے لکھنے میں۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ اگلے ہی لمحے مسئلہ گل زمین کی صورت میں نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اللہ جانے کیا تھا کہ میں نے گھر والوں کو بتایا اور بتاتے ہوئے ایک بچے کی بے بسی

www.Paksociety.com

اور بے حسی کی حقیقی تصویر دکھائی۔ کون جانے انھوں نے میرا دل رکھنے کے لیے ہاں کر دی یا کسی یتیم کی خیال گیری نے ان کا دامن تھاما۔ بخت خان کی ورکشاپ گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اگلے ہی روز میں نے اس سے گل زمین مانگ لیا۔

"صاحب! آپ کا تو اپنا بچہ بھی ہے۔"

"اسی لیے تو اسے بھی اپنا رہا ہوں۔" تھوڑی اگر مگر کے بعد اس نے اپنا بوجھ اور ذمے داری بڑی آسانی سے مجھے منتقل کر دی اور میں اسے راحت سمجھتے ہوئے ساتھ لے آیا۔ میں نے دھلوانے کپڑے بدلوانے اور جسم پر تیل کے داغ دھبے مٹانے کے دوران ہر ہر لمحے اپنے فیصلے پر خوشی اور یکسوئی بڑھتی رہی۔

آج اتنے سالوں بعد عجیب سا دن میرے سر پہ ہے۔ بے کیف، انتظار سے بھرا۔ خدشات کی نوکیں چبھوتا ہوا۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے گل زمین سے بہت توقعات تھیں اور میں نے کوئی بہت آرزوئیں پال رکھی تھیں۔ بچپن کے کچھ مناظر کی تلخی نے مجھے اس تجربے پہ اکسایا تھا۔ آخر یتیم بچے پہ ہمیشہ کیوں سختی کی ہی نظر کرتے ہیں۔ اسے نوکر ہی کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ وہی اکیلا تو اس ورکشاپ پہ کام نہیں کر رہا تھا اور لوگ بھی تھے۔ ان پہ میری نظر کیوں نہیں گئی۔ اللہ جانے تجربے کا شوق تھا یا خود خدا نے مجھے اس آزمائش میں ڈالا تھا۔

اللہ سے میرے تعلقات کبھی ایسے نہیں رہے کہ وہ ناراض ہو کر مجھے کسی تنگی یا آزمائش میں ڈالے۔ وہ تو ہمیشہ مہربان سائے، خوشگوار جھرنے اور زندگی بخش احساس کی طرح رگ رگ میں دوڑتا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کون جانتا ہوگا اور اس سے میں نے کبھی آزمائش نہیں مانگی۔ ان دنوں شاید کسی مفکر کا بھی اثر ہوگا کہ کارلیل کی بات ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ "سب سے بڑھ کر عظمت یہ ہے کہ انسان خدا کی بنائی ہوئی زمین کا کوئی کونا زیادہ استعمال کے قابل بنائے۔ قابل کاشت، زیادہ غذا کے قابل۔"

تب گل زمین کی زبان پر بہت کانٹے تھے۔ ممکن ہے دل بھی انھی سے بھرا ہوا ہو۔ بات بات پہ وہ کوئی نہ کوئی ایسا جملہ بولتا کہ کان کی لو سرخ ہونے لگتی۔ دوسروں کے سامنے میں تو ڈرتے ہوئے اس سے بات بھی کم کرتا۔ آتے جاتے، بازار میں، صحن میں، کمرے میں، ٹی وی کے سامنے، اپنے چھوٹے سے بیٹے کے ساتھ کھیلتے، باتیں کرتے، جو وہ نہ سمجھتا بس کچھ نہ کچھ ڈھکے چھپے الفاظ میں کہنے کی کوشش کرتا پھر آہستہ آہستہ گل زمین اشارے پکڑنے لگا، پھر پوچھتا:

"ابا! یہ بات مجھے سنائی ہے ناں۔"

میں سوچا کرتا تھا، انسان کی فطرت بدل سکتی ہے۔ اس کو ہر حال میں قابل کاشت بنایا جا سکتا ہے۔ زیادہ مفید، زیادہ قابل قدر۔ بے شک تبدیلی کا عمل زمین میں بیج کے بونے اور پہلی کونپل کے سر نکالنے جیسا نازک اور بے اعتبار ہوتا ہے۔ ایسا کب ہوتا ہے، کیوں ہوتا ہے۔ آپ اپنے بوئے پودے پہ وفا کے پھل کی امید لیے بیٹھے ہوں اور پتا چلے وہاں تو بے وفائی کی کڑواہٹ والا پھل آن لگا ہے۔ یہ لمحہ مجھ پہ نہ آتا تو کبھی سمجھ نہ آتی کہ بے وفائی کیا ہوتی ہے۔ اس کی شکل، اس کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ یہ کیسی دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیسے جسم و جان سے ہوتی ہوئی روح کا حصہ بنتی ہے۔ سنا تو تھا، دیکھا نہیں تھا۔ مانا نہیں تھا۔

سوچا کرتا تھا لوگ بے وفائی کیسے کر لیتے ہیں۔ یہ کیوں ہوتی ہے، کب کب ہوتی ہے۔ آپ دریا کے کنارے خشک ہونٹوں اور پیاسے من کے ساتھ گئے ہوں اور پتا چلے دریا نے تو اپنا سارا پانی ہی روک لیا ہے۔ ساری وفا خود ہی پی گیا ہے۔ ساری تازگی، ساری شادابی خواب بن گئی ہے۔

www.paksociety.com

بے وفائی میں نے کبھی نہیں کی، کرنی ہی نہیں چاہی۔ اس کے اجزائے ترکیبی نہ دیکھنے چاہے نہ ڈھونڈنے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اپنے اندر کی کسی کمزوری یا خوف سے ڈرتا تھا۔ بس اتفاق ہی جانیے کہ جس خیال کی جڑ میں بے وفائی کی دیمک کا گمان بھی ہوتا ہے، میں اس سے دو قدم، دور سے راہ بدل لیتا رہا ہوں۔

گل زمین نے ایسا کیوں نہیں کیا، بے شک میں نے اسے کلاس روم میں بٹھا کر لیکچر نہیں دیے۔ سمجھایا نہیں۔ نوٹس نہیں لکھوائے، پر اس کی زبان بدلی، عادات بدلیں، رہن سہن میں تبدیلی آئی۔ مجھے کیا خبر تھی جین کبھی نہیں بدلتے۔ فطرت وہی رہتی ہے۔ انسانی فطرت سے کوئی کیسے لڑ سکتا ہے۔ اور میں تو بالکل نہیں کیونکہ لڑائی میرے مزاج میں ہی نہیں۔ میں نے گل زمین کو اپنے جیسا بنانے کی کوشش تو بہرحال ضرور کی تھی۔ سکول سے جب جب وہ کسی سے لڑ کر آتا، گلی محلے میں اس کی کسی سے جھڑپ ہوتی، میں اسے کبھی ہلا شیری نہ دیتا۔

ایک دن تو میں نے اس پہ بظاہر بڑا ہی ظلم کیا۔ اس کا ماتھا سوجا ہوا تھا۔ پتا چلا کہ کھیلتے میں کسی نے بڑے زور سے گیند ماری ہے۔ گل زمین کا یقین تھا کہ اس لڑکے نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے کیونکہ وہ اسے پہلے اپنے جملوں سے نشانہ بناتا تھا۔ ان کی بے اثری دیکھی تو گیند کو ہتھیار بنا لیا۔ بعض روحیں ہوتی ہیں ایسی دکھ دینے والی۔ وہ دکھوں اور اذیتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر رکھتی ہیں۔ پھر جملوں میں سجا بنا کر وہاں وہاں تقسیم کرتی ہیں جہاں جہاں دکھ کی کمی ہو رہی ہوتی ہے۔

تب میں نے اے جی۔ آر۔ ٹن کی ایک کہانی سنائی۔ یہ سچی کہانی جو ۱۹۸۳ء میں امریکہ میں چھپی تھی۔ وہ ۹ سال کا تھا تو اس کی ماں مر گئی۔ ۱۲ سال کی عمر میں اس نے اپنا باپ کھو دیا۔ پھر مسٹر اور مسز افٹن نے اسے گود لے لیا۔ اور کہا جب تک چاہو ہمارے پاس رہو۔ سکول کے بچے رٹن کی اونچی ناک کا مذاق اڑاتے۔ اس کے نام رکھتے۔ تحقیر سے اسے Orphan Brat کہتے۔ اس کا دل بہت چاہتا کہ ان سے لڑے مگر ہمیشہ مسٹر افٹن کا جملہ اس کی راہ روک لیتا۔

”یاد رکھو جنگ اور لڑائی تو ہر آدمی کر سکتا ہے مگر بڑا آدمی وہ ہے جو اس سے بچ سکے۔“

گل زمین کو یہ بات سمجھ آئی تو وہ بے اختیار بول پڑا: ”مگر مجھے بڑا آدمی نہیں بننا۔ ایسے بڑوں کو ان کے چھوٹے کھا جاتے ہیں۔“ اس کی بات کی تہ میں چھپے درد کا مجھے کل ہی پتا چلا جب میں بخت گل مستری سے عرصے بعد ملا۔ گل زمین کا دو ہفتوں سے کچھ پتا نہ تھا اور میں اسی بارے میں معلوم کرنے گیا تھا۔ بخت گل بیمار تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بولا: ”گل زمین، درخت جیسا شاندار لگا ہے۔ ۲۵ سال کا جوان آدمی ہے۔ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو گیا۔ تم نے اس کا بہت خدمت کیا۔ بہت پیار کیا، وہ تم سے بہت تنگ تھا۔“

”تنگ تھا!“ میں اس صدمے کے لیے تیار نہ تھا۔

”ہاں تنگ تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا۔ وہ دو ہفتے پہلے میرے پاس آیا تھا، کھویا کھویا تھا، کہتا تھا میرے پاؤں میں اس نے بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ اتنا پیار تو میرے باپ نے بھی نہیں کرتا تھا۔ یہ میرا اللہ کس مٹی کا بنا انسان ہے۔ اف بھی نہیں کہتا۔ مجھے ہاتھ کے چھالے کی طرح سنبھال کر رکھتا ہے۔“

”مگر وہ ہے کہاں بخت گل! وہ ہفتے سے غائب ہے۔“

”صاحب! اب صبر کر لو۔ وہ کدھر ہو گا۔ آئے آئے، نہ آئے نہ آئے۔ مجھ سے اول تو ملتا ہی کم تھا۔ جب ملتا

www.paksociety.com

اپنے ماں باپ کے بارے میں ضرور پوچھتا تھا۔ میں یہ بات اس سے چھپاتا تھا۔ پھر کسی روز ذہنی ورکشاپ میں کسی کے منہ سے کچھ الٹا سیدھا نکلا تو اس نے بولا: ''میری آنکھوں میں خون سے بھری دو لاشیں ہیں۔ ایک جلا ہوا گھر ہے۔ گھر میرا اپنا ہے۔ اور لاشیں مرے اماں بابا کی ہیں۔'' جب وہ یہ بولا تو اس کی آنکھوں میں خون بھی تھا اور آگ بھی۔ کوئی کیا کرے، ہمارے تو رسم ہی ایسی ہے۔ رواج ہی ایسا ہے۔ جو جو ہم میں سے ہے، اسے اس روایت کو نبھانا ہوتا ہے۔''

سوچتا ہوں انسان کسی پتھر سے کھدے جملے سے کیا کم ہے۔ فطرت نے تو اسے سلیٹ جیسا بنایا تھا۔ جو چاہو لکھو مٹاؤ۔ میں نے اس سلیٹ پہ دنیا کے سب سے مہربان انسان، مدینے کے والی ﷺ کی کئی باتیں لکھی تھیں۔ ان کی وہ عادتیں بھی کہ دشمنوں کے نرغے میں آتے اور پھر ان کو دوست کر لیتے۔ میں اپنے بھول پنے میں سمجھتا رہا کہ یہ ساری باتیں رزق جان ہوئیں۔

گل زمین میرے لیے بھی گود لیا بچہ نہیں تھا۔ تب تک نہ تو انسانی بچوں کے حقوق کا معاہدہ ہوا تھا اور نہ ہی یہ لکھے اور دنیا بھر میں پھیلائے گئے تھے۔ وہ تو میرا ایک تجربہ تھا۔ میری ضد تھی۔ اللہ جانے اس بات کو ضد کہنا درست بھی ہوگا یا نہیں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ کچھ ایسا کروں کہ ایک ذہن، ایک زندگی بنجر ہونے سے بچ جائے۔ اللہ کی زمین کے قابل کاشت رقبے میں اضافہ ہو جائے۔

آپ سوچیں، شادی کے ابتدائی سال ہوں۔ گھر میں ایک چھوٹا سا بچہ اور بیوی ہو۔ شروع کے سالوں میں تو خود بیویاں بھی بچوں جیسی ہوتی ہیں۔ انھیں بھی پالنا پڑتا ہے، سکھانا، بتانا اور سمجھانا پڑتا ہے۔ ایسے میں یہ تجربہ کس قدر صبر آزما رہا ہوگا۔ مجھے کیا کچھ نہ سننا پڑا ہوگا۔ کیا کچھ نہ سہنا اور برداشت کرنا پڑا ہوگا۔

عجیب بات ہے ان گزرے سالوں میں گل زمین نے مجھے کسی گہرے یا بڑے صدمے سے کبھی دوچار نہیں کیا۔ نہ تو کبھی غلط لڑکوں کی سوسائٹی میں گیا۔ نہ اس نے گھر کی چیزوں اور پیسوں کی چوری کی۔ پڑھائی بس ٹھیک تھی۔ ڈاکٹر، انجینئر اس نے بننے کا بھی سوچا تھا، نہ سوچنے پہ آمادہ تھا۔ کہتا تھا ایف۔ اے کر لوں پھر کوئی بڑا کام کروں گا۔ زیادہ پڑھائی اپنے بیٹے ''روشن ضمیر'' کو کراؤ اچھا شوق والا بچہ ہے۔

اسے گھر سے غائب ہوئے پہلا ہفتہ ہوا تو میں خوش امید رہا۔ ناامیدی کو پاس نہیں آنے دیا۔ جونہی دوسرا ہفتہ شروع ہوا، دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ تیسرے ہفتے میری جان پہ بن آئی۔ میری بیوی مجھے یوں افسردہ بیٹھے دیکھ کر خود تو افسردہ کم ہوئی، میری افسردگی بڑھانے کا باعث زیادہ بنی۔ اس نے پہلا جملہ یہی کہا:

''یہ سب آپ کی ڈھیل اور بے جا لاڈ کا نتیجہ ہے۔ اپنا کیا ہی سامنے آ رہا ہے۔''

اسے میں سمجھانا چاہتا تھا کہ دیکھو سامنے تو غلطی آتی ہے، کوتاہی آتی ہے۔ یہ ڈھیل کوئی غلطی نہیں تھی۔ یہ تو میری زندگی ہے۔ میرا طرز زندگی ہے۔ اس پہ شرمندگی کیسی۔ میں نے یہ اپنے والد سے سیکھی۔ انھوں نے اپنے والد سے وراثت میں پائی۔ اپنی زندگی کے پہلے کام (جاب) کی اطلاع، پہلی تنخواہ، میرے والد نے بھی اپنے والد کو بھجوائی تھی۔ وہی روایت میں نے نبھائی۔

گل زمین، میرا اپنا نہ سہی، میرے بیٹے جیسا تو ضرور تھا۔ میں نے اس سے کوئی توقع نہیں لگائی۔ مگر وہ ایسا کرے گا یہ بھی تو نہیں سوچا تھا۔ کتنے دن ہو گئے۔ روز صبح اخبار، اس حالت میں پڑھتا ہوں کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں اور آنکھیں کسی مصیبت میں گرفتار ہرن کی طرح یوں لفظوں پہ گھومتی ہیں جیسے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہی ہوں۔ کسی ان ہونی سے پناہ کی جگہ کی تلاش میں ہوں۔ مگر خوف، اندیشہ اور بے یقینی، سانپ بن کر لمحہ ڈرا رہی ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

مالاکنڈ کے ایک گاؤں سے کئی لاشیں ملنے کی خبر، کچھ گھر جلنے کی خبر، کسی مقابلے میں کسی سروقد نوجوان کے زمین بوس ہونے کی خبر۔ صوبہ سرحد کی چھوٹی چھوٹی

خبریں۔ ان کی چھوٹی سے چھوٹی وہ تفصیل جس سے مجھے
کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اب میری کل دلچسپی کا مرکز ہے۔
خبر کی کون سی آنکھیں ہوتی ہیں کہ پڑھنے والی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو دیکھ سکیں۔ نہ دل ہوتا ہے کہ اندیشوں سے اٹے دل کا احوال جان سکے۔ خبر تو خبر ہوتی ہے۔ کسی ان جان ملاقاتی کی طرح، جو نہ مسکرائے، نہ رلائے۔ بس احوال سفر بتائے اور پھر دور چلا جائے۔

گل زمین نہ میری تخلیق ہے اور نہ میرا خون۔ مگر جانے میرے دل میں کیوں یقین سا ہے کہ ہر تخلیق بہت بے رحم ہوتی ہے۔ اپنے مالک کے معاملے میں حلقہ، بے لحاظ اور کسی حد تک ناشکری۔ کسی عمارت کو کب اپنے معمار کی پروا ہوتی ہے۔ کوئی پل کب اپنے انجینئر کے لیے روتا ہے۔ کوئی ڈیزائن کب اپنے ڈیزائنر کے لیے سسکیاں بھرتا ہے۔ خود میں بھی کب اپنے خالق کا ویسا شکر گزار بن سکا ہوں جیسا ہونا چاہیے تھا۔ کسی میدے کے پیڑے جیسا۔ کسی گندھے ہوئے بیسن جیسا۔ گوندھنے والا جیسے گوندھتا جائے۔ اس کی شکل ویسی نکلتی آئے۔ وہ ڈھالتا جائے۔ یہ ڈھلتا جائے۔ خوشی خوشی روح اور دل کی آمادگی سے۔ چاہے مالک پوڑی بنالے، چاہے جلیبیوں کی شکل میں ڈھال دے یا گلاب جامن بنا کر شیرے سے بھر دے۔ پیڑے کی اپنی Choice کب ہوتی ہے، ہو بھی کیسے سکتی ہے! بس ڈھلنا تو اس کی خوبی ہے، اسی میں اس کی سرفرازی اور برقراری ہے۔

اولاد اور اس کا انتظار۔ یہ کیفیت کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ یہ کیفیت کوئی دستی گھڑی جیسی تھوڑی ہوتی ہے کہ جب جی چاہا اتار کر جیب میں رکھ لیا۔ جب دل زیادہ گھبرایا تو پہن لیا۔ یہ احساس تو سانسوں کے ساتھ چلتا ہے۔ نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔ انتظار میں رہنے کی کیفیت، ٹریفک کانسٹیبل سے بھی بری ہوتی ہے۔ ایک پل چین نہیں۔ ایک نگاہ سگنل پہ تو دوسری گاڑیوں کے ہجوم پہ، ایک طرف پورا سکون نہیں ہوتا کہ دوسری طرف سے جان پہ بن آتی ہے۔

میں گل زمین کے بارے میں جس متوقع خبر کی تلاش میں تھا، اور جس کے لیے فکر مند تھا، شکر خدا کا وہ نہیں ملی البتہ فکر مندی برقرار رہی۔ اس مسلسل فکر سے میری جان کی خلاصی اس وقت ہوئی جب ایک رات اچانک میری بیوی کی چیخ و پکار نے رات سوتے میں مجھے جگا دیا۔
''سنیں! گل زمین لوٹ آیا ہے۔''

اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ساتھ میں ایک صندوق تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہو نہ ہو، اس میں یہ اپنے ماں باپ کے قاتلوں کے سر رکھ کے لایا ہوگا۔ مجھ سے اپنی محبت ظاہر کرنے کے لیے اب یہ کہے گا ''دیکھو لالہ! میں کسی طور پر نہیں بھولتا۔ وفا میری سرشت میں ہے۔ تم پہ کبھی کچھ برا بھلا ہوا تو میں یہی کروں گا، تمہارے دشمنوں کے ساتھ بھی۔''

یہ کیسی وفا ہے۔ میں نے تو ایسا نہیں سوچا تھا۔ ایسا نہیں سکھایا تھا۔ اتنے سالوں میں تو کسی پتھر پہ بھی معافی تلافی کے لفظوں کے قطرے قطرے گراتا رہتا تو وہاں بھی کئی انچ گہرا نشان پڑ چکا ہوتا۔

''او گل زمین! بہت دیر لگادی آنے میں، کچھ دن ہی بہت گھبرایا تھا میرا۔ پھر جانے کیا ہوا گھبراہٹ کم ہوگئی۔ جیسے تسلی سی ہو جاتی ہے۔ کہو خیریت رہی۔'' میں نے صاف جھوٹ بولنا چاہا۔ اس نے جواب میں صندوق کھولا۔
اف میرے خدایا! سامنے کپڑے میں لپٹا ایک چھرا تھا۔
''لالہ! میں کئی روز اس سے ویرانوں میں جا جا کر درختوں کی ٹہنیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتا رہا ہوں۔ مجھے اس سے کچھ لوگوں کو کاٹنا جو تھا۔ پھر ایک روز شاید یہاں

www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

قہقہہ

فیکٹری میں ایک کارکن ایک ساتھ جڑواں بچوں کا باپ بن گیا۔ دفتر کے سربراہ نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا "پیٹر میں نے سنا ہے کہ خدا تم پر مسکرا اٹھا ہے۔"

پیٹر نے جواب دیا "نہیں صاحب! خدا نے تو مجھ پر زور سے قہقہہ لگایا ہے۔" (غلام اکبر خان، فیصل آباد)

جانے کے پچھلے دن وہ موقع آ گیا۔ میرے باپ اور ماں کا قاتل بھرے بازار میں میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں نے اسے روکا۔ تعارف کا مرحلہ چھری کی نوک پر طے کیا اور پکار کر لوگوں کو جمع کیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تب میں نے کہا۔

"دیکھو میں گل زمین ہوں، اس گل شیر کا بیٹا جسے ۱۵ برس قبل اس آدمی نے مار دیا تھا۔ قبیلے کے رواج کے مطابق جرگہ بیٹھے گا اور سزا کا اعلان کرے گا مگر میں خود جرگہ، خود ہی قبیلہ ہوں اور بھرے بازار میں سب کے سامنے سزا کا اعلان اور اس پر عمل درآمد کرتا ہوں۔"

تب قریب کھڑے لوگوں نے جلدی میں اپنے کپڑے سمیٹ لیے۔ وہ مرنے والے کی گردن سے نکلتے سرخ خون کی دھار سے اپنے کپڑوں کو سرخ ہونے سے بچانے کے آرزومند تھے۔ تب میں نے چھری اٹھائی اور کہا "میں گل زمین اپنے پورے ہوش و حواس میں اپنے باپ اور ماں کے قاتل کو اپنی طرف سے معاف کرتا ہوں۔ اس کا ظلم بہت بڑا تھا۔ پر میرا لالہ کہتا ہے معافی اس ظلم کا اس سے بھی بڑا جواب ہے اور میں یہ جواب اپنی مرضی، خوشی اور سہولت سے دے رہا ہوں۔ کسی مجبوری کے بغیر، کسی لالچ کے بغیر، کسی مصلحت کے بغیر اور کسی دباؤ کے بغیر۔"

میرے خاموش ہوتے ہی پورے بازار میں باتوں کا سیلاب آ گیا تھا۔ جب میں چھری کو اس کاغذ میں لپیٹ کر واپس روانہ ہونے والا تھا۔ کچھ بزرگوں نے مجھے روک لیا۔ یہ جرگے کے سیانے تھے۔ اسی گاؤں کے پرانے تھے۔ اب میں ان کا مہمان تھا۔ ایک ایسا مہمان جسے ان کے گاؤں میں ۱۵ برس قبل تقریباً زندہ جلا دیا گیا اور اسے اپنے ماں باپ کو دفن کرنا بھی نصیب نہ ہوا تھا۔

جس رات میں نے واپس آنا تھا، ایک بوڑھی عورت نے اس حجرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پوٹلی تھی اور ساتھ میں ایک بچہ۔ اس نے کہا۔

"گلے! یہ میرا بیٹا ہے۔ تیرے ماں باپ کے قاتل کا بیٹا..... میں خون بہا میں اسے تیرے حوالے کرتی ہوں۔ تو اگر اس کے باپ کے قابو میں آ جاتا تو وہ تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔ اس نے کبھی کسی کو معاف نہیں کیا۔ تجھے کیسے کرتا۔ جا اسے ساتھ لے جا۔ اسے بھی وہی دودھ پلا جو تو نے خود پیا ہے۔ اسے وہی خوان کھلا جو تو کھاتا رہا ہے۔ اسے تو اپنے سورج کے دن دے اور اس چاند کی راتیں جہاں سوتے سوتے تو سونا ہو گیا ہے۔" وہ بولتے بولتے چپ ہوا پھر اگلے ہی لمحے میرے گلے لگ کر رو دیا۔

"لالہ! میں اسے کیسے روکتا۔ وہ اپنا مستقبل میرے حوالے کرنے آئی تھی۔ جانے کتنے حوصلے سے، کتنی ہمت سے، میں کیسے اس کا حوصلہ توڑ دیتا۔ مجھے پتا تھا میرا لالہ، مجھے آزمائش کی گھڑی میں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ میری زمینیں مجھے واپس مل گئیں ہیں، بغیر میرے مطالبے کے، جلا ہوا گھر بھی مجھے اب بنانا ہے۔ قدرت نے انصاف کر دیا ہے، یہ لڑکا میرے نام کر دیا ہے۔ آپ کہو گے، اجازت دو گے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ مگر اسے آپ رکھ لو صرف دس پندرہ سال کے لیے۔ تب تک اس کا باپ اپنے ہی کسی ظلم کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہوگا۔ بدلے کا ایک اور میدان اس کا انتظار کر رہا ہوگا اور یہ پوری طرح ہتھیار بند ہو کر اس میں اترنے کے لیے جائے اور سرخروئی پائے۔"

کیا آنسو الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔ کسی بے وفا کی آنکھ سے نکلیں تو ان کا رنگ کیا ہوگا اور کسی وفا نبھانے والے کی آنکھ سے نکلیں تو اثر کیسا ہوگا۔ میں نہیں جانتا ان کے رنگ اور اثر میں کیسے فرق کیا جاتا ہوگا۔ ہاں اتنا مجھے یقین ہے ذائقے میں ضرور فرق ہوگا۔ جیسے گل زمین کے آنسوؤں کی سی مٹھاس میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں پائی، کبھی نہیں چکھی تھی۔

www.paksociety.com

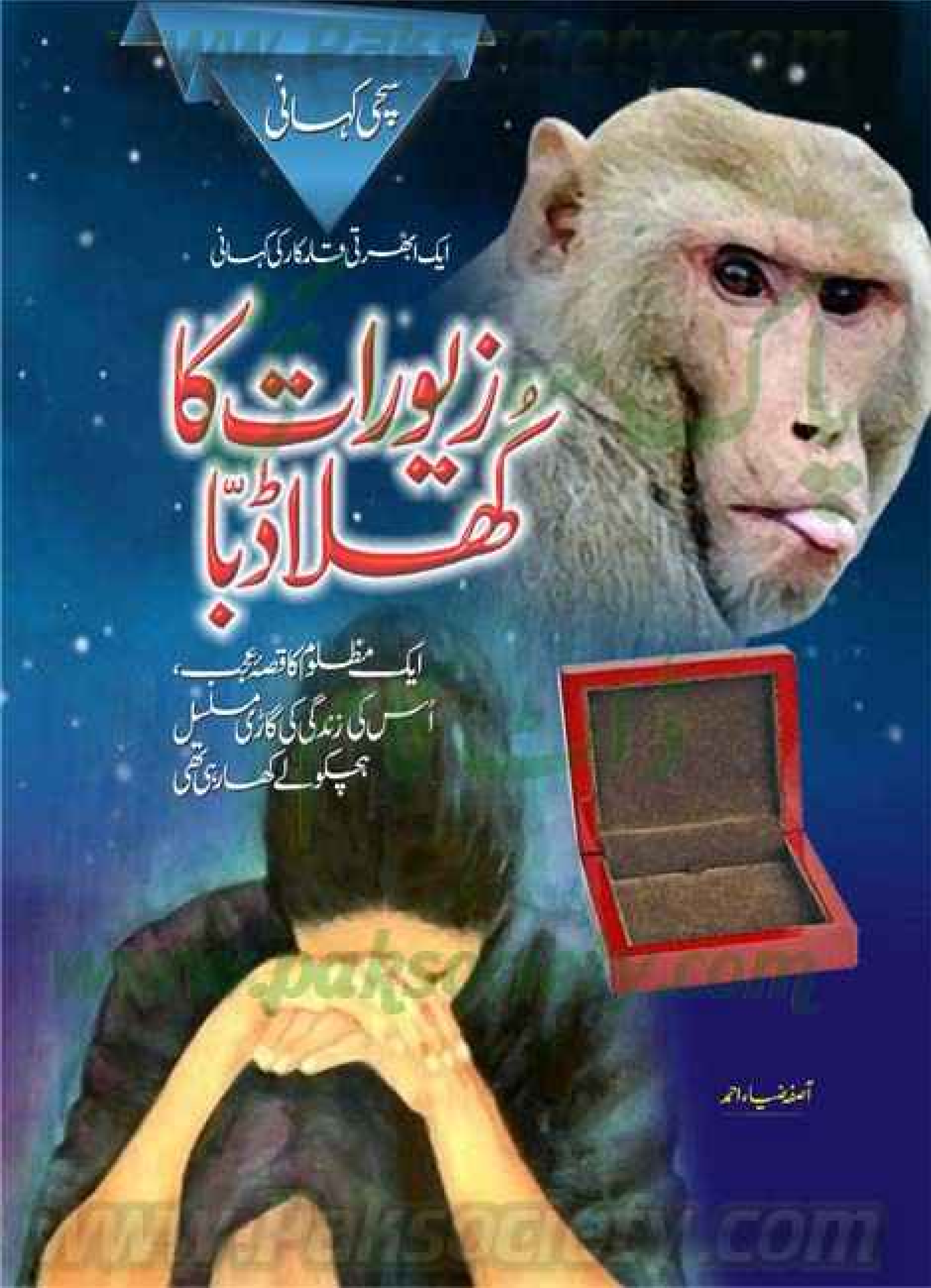

سچی کہانی
ایک ابھرتی قلمکار کی کہانی
زیورات کا کھلا ڈبا
ایک مظلوم کا قصہ جب،
اس کی زندگی کی گاڑی مسلسل
ہچکولے کھا رہی تھی
آمنہ ضیاء احمد

میرا

تعلق آسودہ حال اور خوشحال گھرانے سے ہے جبکہ میری سہیلی تہنیت کے والد ایک مالیاتی ادارے میں کلرک تھے۔

ان کا خاندان کل ۵ افراد پر مشتمل ہے۔ والدین، خود تہنیت اور اس کے ۲ چھوٹے بھائی سرمد اور سعد۔ تہنیت کے والد کی تنخواہ اخراجات کے لیے ناکافی تھی لیکن والدہ بڑی سلیقہ مند اور کفایت شعار خاتون تھیں۔ خود بھی گھر میں سلائی اور کشیدہ کاری کر کے اتنی رقم پس انداز کر لیتیں کہ وقت ضرورت کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

تہنیت اور اس کے دونوں بھائیوں کی تعلیمی حالت بہت اچھی تھی۔ حالات کے پیش نظر تینوں محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگے۔ درس و تدریس کا سلسلہ کامیاب رہا۔ تینوں بہن بھائی بہت محنت اور لگن سے پڑھاتے تھے، اسی وجہ سے بچوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ یوں آمدنی کا ایک ذریعہ نکل آیا اور ان کے معاشی حالات میں کافی بہتری آگئی۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور خاندان بھر کی لاڈلی تھی کیوں کہ ہمارے خاندان میں ماشاء اللہ بیٹے تو سب کے تھے لیکن بیٹیوں کی کمی تھی۔ جیسے ہی میرا بی۔ایس۔سی کا نتیجہ نکلا، میرے تایا ابو اور تائی اماں ہمارے گھر آن دھمکے۔ اس بار وہ اپنے اکلوتے بیٹے احمد کا رشتہ لے کر آئے تھے۔ میرے والد قطعی تیار نہیں تھے، لہٰذا انھوں نے صاف انکار کر دیا اور بغیر کسی حیل و حجت کے دوٹوک بتایا "میں اپنی بیٹی کا رشتہ دوست کے بیٹے کے ساتھ طے کر چکا۔"

تایا ابو یہ بات سن کر سخت برہم ہوئے اور کہا "خبر بھی نہ ہوئی اور سگے بھائی ہوتے ہوئے تم نے بیٹی کا رشتہ طے کر دیا۔ اس لڑکے میں کون سے لعل جڑے ہیں جو بھتیجے پر اسے ترجیح دی گئی؟"

لیکن ابو نے تایا ابو کے غصے کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ ابو دراصل تایا ابو کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ تایا ابو کا غصہ ہمارے خاندان میں مشہور تھا، لیکن اس وقت ان کا غیظ و غضب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اب وہ ہمارے یہاں مزید قیام کے لیے تیار نہیں تھے حالانکہ میری اور امی کی بہت کوشش تھی کہ وہ لوگ کچھ دن اور ٹھہرتے لیکن تایا ابو کا مزاج بہت بگڑ گیا۔ انھوں نے تائی امی کو فوری واپسی کا حکم صادر کیا۔ تائی امی بھی حکم کی تعمیل میں سامان سمیٹنے لگیں۔

اس روز موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ گرمیوں کی جلتی جھلستی مسموم ہواؤں کے بعد اچانک آسمان پر بادل چھا گئے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ لیکن گھر کا ماحول عجیب سا تھا۔ تناؤ اور کھنچاؤ کی وجہ سے سب کی زبانوں پر تالے لگے ہوئے تھے اور بڑی تکلیف دہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ باہر موسم جتنا اچھا تھا، میرے دل کا اتنا ہی خراب تھا۔ دراصل امی، ابو کے بعد اگر کسی کو ٹوٹ کر چاہتی تو وہ تھے میرے تایا ابو اور تائی امی۔ احمد بھائی کو تو میں اپنا حقیقی بھائی سمجھتی تھی، اسی لیے ابو کے فیصلے سے خوش اور مطمئن تھی۔

تھوڑی دیر بعد موسم کی پہلی بارش شروع ہوگئی۔ پہلے تو رم جھم پھوار برسی اور پھر اچانک بارش نے زور پکڑ لیا۔ اسی اثنا میں تہنیت پانی میں شرابور چھوٹے بھائی سعد کے ساتھ میرے گھر داخل ہوئی۔

دونوں بہن بھائی دراصل بازار جا رہے تھے کہ اچانک بارش نے آلیا۔ دونوں حواس باختہ تھے، اس لیے دروازے پر نہ اطلاعی گھنٹی بجائی اور نہ ہی دستک دی اور اندر چلے آئے۔ سامنے صوفے پر تائی امی براجمان تھیں اور برابر میں تایا ابو بیٹھے ہوئے تھے۔ ابو اور امی کرسیوں پر تھے۔ میں فرش پر گدی کے سہارے آرام سے بیٹھی تھی کہ یہ بن بلائے مہمان وارد ہوئے۔ تائی امی کی نظر جب تہنیت کے بھیگے بھیگے چہرے پر پڑی تو ان کی نگاہیں بس جم کے رہ گئیں۔ مجھے تب ایک گیت کے یہ بول یاد آگئے۔

تم کو دیکھا تو نظریں یہ کہنے لگیں
ہم کو چہرے سے ہٹنا گوارا نہیں

www.paksociety.com

تہنیت کافی خوش شکل اور خوش نقوش کی مالک تھی۔ تائی امی کی آنکھوں میں تہنیت کے لیے پسندیدگی کے جو سائے لہرا رہے تھے، اسے ہر شخص نے محسوس کیا۔ تہنیت نے بھی یہ بات محسوس کرلی۔ وہ شرم سے سرخ ہوگئی جس کی وجہ سے اس کا حسن دوبالا ہوگیا۔ جیسے ہی بارش تھمی، دونوں بہن بھائی بہانہ کرکے کھسک گئے۔ کمرے کے ماحول سے دونوں بھانپ گئے تھے کہ ان کے آنے سے پہلے کسی سنجیدہ موضوع پر گفتگو ہورہی تھی اور ان کی ناوقت آمد سے سب خاموش ہوگئے۔ میں نے چائے پر روکنا چاہا، امی نے بھی بیٹھنے کا کہا مگر دونوں بہن بھائی رخصت ہوگئے۔

اب اچانک تائی امی نے جانا ملتوی کردیا جبکہ تایا ابو بضد تھے کہ ابھی اور اسی وقت چلو۔ تائی امی نے علی الاعلان تایا ابو سے کہہ دیا کہ وہ ہر حال میں تہنیت کو ہی اپنی بہو بنائیں گی۔ بالآخر تایا ابو نے بھی سر تسلیم خم کردیا۔ میں اور امی بے انتہا خوش ہوئے۔ تہنیت امی کو بھی بہت پسند تھی اور میری تو خیر وہ عزیز ترین سہیلی تھی۔ ابو کے انکار کی وجہ سے تعلقات میں جو دراڑ پڑنے والی تھی، یوں اس کے بھی امکانات ختم ہوگئے۔ تائی اور امی پھر ہم دونوں ماں بیٹیوں کے ساتھ شیروشکر ہوگئیں۔ البتہ تایا ابو روٹھے روٹھے سے تھے۔ تائی امی نے احمد بھائی کو فون کیا، تو وہ بلا کسی تاخیر کے چلے آئے۔

جب انھیں پتا چلا کہ ان کی ہونے والی دلہن میں نہیں تہنیت ہے تو ان کی خوشی اور اطمینان دیدنی تھا۔ ایک دن انھوں نے خود مجھے بتایا ”گڑیا! میری کوئی بہن ہے نہیں، اسی لیے تمھیں اپنی سگی بہن سمجھتا ہوں۔ بارہا میں نے امی ابو کو سمجھایا لیکن وہ مان ہی نہیں رہے تھے چنانچہ ان کی ضد کے آگے میں نے ہار مان لی۔ ورنہ میں دل سے اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھا۔“

احمد بھائی کی بات سن کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ احمد بھائی حقیقتاً بڑے نیک اور شریف الطبع انسان تھے۔ جب رشتے کی بات تہنیت کے والدین سے کی گئی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کیوں کہ انھیں اپنے معاشی حالات کا اچھی طرح علم تھا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ انھیں تہنیت کے لیے ایسا لائق فائق اور اعلیٰ خاندان کا لڑکا اتنی آسانی سے مل جائے گا۔ آناً فاناً یہ رشتہ طے پایا اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق تہنیت میری بھابی بن گئی البتہ میرے والد آخر تک اس رشتے کے خلاف رہے۔

وہ امی سے مسلسل یہی کہتے رہے ”احمد تو واقعی ہیرا ہے لیکن میں اپنے بھائی کا مزاج اچھی طرح جانتا ہوں۔ بھائی دولت کے دلدادہ ہیں اور اس لحاظ سے تہنیت کا گھرانا ان کے ترازو میں نہیں تلے گا کیونکہ وہ لوگ نہ صرف مالی طور پر بھائی کے خاندان سے کمزور بلکہ نہایت شریف اور سیدھے ہیں۔ بھائی انھیں تگنی کا ناچ نچادیں گے۔“

ابو کی یہ باتیں میں نے اور امی نے ایک کان سے سنیں اور دوسرے سے نکال دیں اور تائی امی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر اس شادی میں حصہ لیا۔ بری کے جوڑوں کی خریداری، زیورات کا انتخاب، سب کچھ تائی امی نے ہم پر چھوڑ دیا۔ احمد بھائی بھی بے انتہا خوش تھے کیوں کہ میں

غزل

سوادِ شب کا کوئی آخری کنارا نہ تھا
جہاں سے ڈوبتے دل نے تجھے پکارا تھا

بس ایک دن کے لیے زندگی ملی تھی مجھے
وہ ایک دن جو تمھارے لیے گزارا تھا

وہ کوئی روشنی سی میرے گرد پھیلا رہا
کھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ میں ستارا تھا

کہاں تھا ہوش بھلا پھر پلک جھپکنے کا
کہ میری آنکھ میں ڈوبا ہوا نظارا تھا

وہ لفظ تیز بہت تھا سو میں نے رات گئے
کسی خیال کے سینے میں جا اتارا تھا

نوید بخاری

www.Paksociety.com

نے انھیں تہنیت کی ایک تصویر دکھائی تھی۔ تایا ابو اس رشتے سے کچھ خاص خوش نہیں تھے لیکن خواتین کے سامنے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ شادی میں ہر موقع پر میں نے تائی امی اور احمد بھائی سے دل کھول کر نیگ وصول کیا۔ اکلوتی بہن جو ٹھہری۔ شادی بڑے اچھے انداز میں انجام پائی اور تہنیت دلہن بن کر پیا کے دیس سدھاری۔

میں اور تہنیت بچپن سے ہی ایک جان دو قالب تھیں اور اب تو رشتہ داری بھی قائم ہوگئی۔ وہ جب بھی احمد بھائی کے ساتھ میکے آتی تو پہلے ہمارے یہاں آتے، اس کے بعد وہ اپنے والدین اور بھائیوں سے ملتی۔ احمد بھائی بھی سسرال والوں سے بہت عزت و احترام سے پیش آتے۔ میں اور تہنیت فون پر گھنٹوں باتیں کرتے۔ اسے سسرال میں کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ تائی امی اور احمد بھائی کی تعریف میں تو اس کی زبان خشک ہوجاتی لیکن تایا ابو کے متعلق دبے دبے الفاظ میں بتایا کہ تایا ابو کسی امیر کبیر گھرانے کی لڑکی کو اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ وقتاً فوقتاً اپنا غصہ کبھی بیوی اور کبھی بیٹے پر اتارتے۔ جب دونوں پر بس نہ چلتا تو تختۂ مشق بیچاری تہنیت بنتی۔ تہنیت سسر کا احترام تو بہت کرتی تھی لیکن ان کے سامنے بھی ڈرتی۔

تایا ابو افسر جنگلات کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ جانور پالنے کا انھیں دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ بقول تائی امی "انسانوں سے تو یہ ڈھنگ سے بات کرتے نہیں اور جانوروں کو یوں گلے لگاتے ہیں جیسے وہ ان کے اپنے ہوں۔"

تایا ابو کا باغ بھانت بھانت کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا۔ جب بھی میں تایا ابو کے گھر جاتی تو ان کے رنگ برنگ جانوروں سے مل کر بڑا مزہ آتا۔ خاص طور سے ان کی ایک پالتو بندریا مجھے بہت اچھی لگتی۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر کسی کی اتنی صحیح نقل اتارتی کہ عقل حیران رہ جاتی۔ بندریا عموماً ایک زنجیر سے بندھی ہوتی۔ زنجیر درخت کے تنے سے بندھی رہتی۔ کبھی کبھی تایا ابو کے حکم پر اسے آزاد بھی کردیا جاتا۔ پھر بندریا سارے باغ میں چھلانگیں مارتی، ایک جگہ سے دوسری جگہ کودتی پھرتی رہتی، کبھی کبھی کمروں میں بھی آجاتی۔ پھر گھر کے ملازمین اسے پکڑ دھکڑ کے پابہ زنجیر کردیتے۔ تہنیت اور احمد بھائی کی شادی کے بعد بھی میں جب تایا ابو کے گھر گئی تو ان کے جانوروں میں مجھے مزید اضافہ نظر آیا۔

اسی دوران میری بھی شادی ہوگئی اور میں اپنے سسرال ہی کی ہو کر رہ گئی کیوں کہ وہاں بھی میں اکلوتی بہو تھی۔ ماشاء اللہ میرے شوہر سفیان کی چار بہنیں تھیں جن کی شادیاں میرے ذمے تھیں۔ میری شادی کے فوراً بعد دو نندوں کی شادیاں انجام پائیں اور دو چھوٹی نندوں کی منگنیاں ہوئیں۔ مصروفیات کی بنا پر میں امی ابو سے بھی کئی کئی دن نہ مل پاتی۔ میرا اور تہنیت کا ٹیلی فونی رابطہ بھی کم ہوگیا۔ پھر اچانک یہ دھماکا خیز خبر ملی کہ تایا ابو کے گھر چوری ہوگئی ہے اور الزام تایا ابو تہنیت کے دونوں بھائیوں، سرمد اور سعد پر لگا رہے ہیں۔

بھائی اسی روز پہلی بار اپنی بہن سے ملنے اس کی

غزل

بجھے ہوئے انہی لوگوں کے درمیان ہم لوگ
تمام عمر سلگتے رہے میاں ہم لوگ

ستارا دور بہت دور ہی چمکتا رہا
کہاں ہمارا مقدر ہے اور کہاں ہم لوگ

سو چشم زیست میں نم کی طرح پہنچتے رہے
پھر ایک روز چھلک کر ہوئے بیاں ہم لوگ

پرانے خواب کبھی جھلملا کے پوچھتے ہیں
تو کس سفر میں ہوئے تم سے رائیگاں ہم لوگ

ہم ایسے لوگ تو خود سے بھی مطمئن نہ ہوئے
مثال عشق جلے اور ہوئے دھواں ہم لوگ

نوید بخاری

سسرال گئے اور کچھ دیر قیام کرکے واپس ہو گئے تھے۔ خبر سنتے ہی میں نے فوراً تہنیت سے رابطہ کیا۔ تہنیت نے روتے ہوئے بھرائی آواز میں واقعہ کچھ یوں سنایا: ”میں اور احمد ایک شادی کی تقریب میں گئے تھے۔ رات گئے واپسی ہوئی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور تمام زیورات اتار کر چوبی ڈبے میں رکھ دیے جن کی مالیت لاکھوں روپے کی تھی۔ دوسری صبح ہم دونوں دیر سے جاگے۔ اسی اثنا میں سرمد اور سعد پہنچ گئے۔ وہاں سے انھیں کسی دوست کے یہاں جانا تھا، اس لیے جلد چلے گئے۔

”جب میں تمام کاموں سے فارغ ہوئی تو یہ دیکھ کر ہکا بکا ہو گئی کہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا زیور کا ڈبا غائب ہے۔ سارا گھر تلاش کر لیا مگر نجانے اس ڈبے کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ کمرے کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جو باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ وہیں تمام جانوروں کے پنجرے تھے۔ اگر چور باہر سے آتا تو دروازے پر موجود چوکیدار اور خونخوار کتوں کی نظروں سے نہ بچ پاتا۔ اس کے علاوہ پنجرے میں بند جانور بھی شور مچا کر بنگلہ سر پر اٹھا لیتے۔ واللہ علم چور کس دروازے سے آیا تھا۔ بنگلے کی چار دیواری پھلانگنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سرمد اور سعد آئے ضرور لیکن ہم سے مل کر اسی وقت چلے گئے۔ پتا نہیں ابو کیوں میرے بھائیوں پر شک کر رہے ہیں؟“

میں نے اسے حوصلہ اور تسلی تشفی دی اور سمجھایا: ”تم، تمھارے والدین اور دونوں بھائی کس قسم کے انسان ہیں، کیا مجھے معلوم نہیں؟ میرا تمھارا ساتھ تو برسوں پر محیط ہے۔ پھر تایا ابو کا مزاج تو تمھیں معلوم ہے۔ ابو نے اسی وجہ سے میرا رشتہ اس گھر میں نہیں کیا تھا۔ وہ تو تمھارے اور احمد بھائی کی شادی کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ یقین کرو میرے ابو تمھیں بھی اتنا ہی چاہتے ہیں جتنا مجھے، اسی لیے وہ آخر تک امی سے یہی کہتے رہے، تہنیت کے والدین سے کہو کہ صاف انکار کر دیں۔ لیکن تم صرف تائی اماں کی پسند نہیں بلکہ میری اور امی کی بھی دلی خواہش تھی کہ تم ہمارے خاندان میں شامل ہو جاؤ۔ احمد بھائی ایک مثالی انسان ہیں، اس لیے ہم نے سوچا کہ وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ مگر یہ نئی افتاد آن پڑی۔ بہرحال اللہ پر بھروسا رکھو، وہ کارساز ہے۔ اس بے بنیاد الزام سے سعد اور سرمد ضرور بری ہوں گے اور چور خود اپنا جرم سب کے سامنے قبول کرے گا ان شاء اللہ۔“

میرے دلاسا بھرے الفاظ نے جادو کا کام کیا، تہنیت کا رونا دھونا کافی کم ہو گیا اور پھر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ باتوں کا سلسلہ تب ختم ہوا جب سفیان گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

دوسرے ہی روز میں اور سفیان تایا ابو کے گھر پہنچے۔ امی اور ابو بھی چوری کا سن کر وہاں آئے ہوئے تھے۔ گھر پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ گھر کے ملازمین بھی روبوٹ کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ چہروں سے خوف اور وحشت برس رہی تھی کیوں کہ پولیس ان پر بھی شک کر رہی تھی۔ اسی لیے وہ لوگ خوف زدہ تھے۔ وہ تو تائی اماں اور احمد بھائی کو اللہ جیتا رکھے، انھوں نے تفتیش کے دوران سختی سے کہہ دیا کہ ہمارے ملازمین نہایت وفادار، نمک حلال اور بھروسے کے آدمی ہیں۔ احمد بھائی نے سرمد اور سعد پر بھی کوئی آنچ نہ آنے دی۔ جب کہ تایا ابو علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ غریبی ایک لعنت ہے اور غربت سے تنگ آ کر نوجوان اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔

تہنیت کی روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ مجھ سے مل کر وہ بالکل بچوں کی طرح رونے لگی۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے سنبھالا۔ صرف تہنیت ہی نہیں احمد بھائی اور تائی امی بھی تایا ابو کی الزام تراشیاں سنتے سنتے تنگ آ گئے۔ بالآخر تائی امی سے بہو کا حال نہیں دیکھا گیا اور انھوں نے اپنی کراری آواز میں شوہر کو بولنے سے روک دیا۔ انھوں نے تہنیت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”زیورات سے زیادہ قیمتی میری بہو ہے۔ جس روز سے اس گھر میں آئی ہے، بالکل بیٹیوں کی طرح آپ اور میری خدمت کی ہے۔ اگر کسی وجہ سے اس کے ہاتھوں یہ نقصان ہو گیا تو کیا آپ اسے معاف نہیں کر سکتے؟ بیٹے اور بہو کی

خوشیوں سے زیادہ قیمتی ہیں وہ زیورات۔" تائی امی نے اتنے پرزور الفاظ میں تہنیت کی حمایت کی کہ تایا ابو کو خاموش رہنے میں اپنی عافیت نظر آئی۔

دو چار دن قیام کے بعد میں نے واپسی کا قصد کیا اور تائی امی سے اجازت طلب کی۔ امی اور ابو بھی واپس جانا چاہتے تھے۔ ہماری گاڑی کا وقت صبح چار بجے تھا، اس لیے میں نے تقریباً ۳ بجے بستر چھوڑ دیا۔ سارے گھر پر سناٹا طاری تھا۔ سب گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ خاموشی، چاندنی رات اور باغ سے آتی موتیا کے پھولوں کی خوشبو...... بڑا خوبصورت سماں تھا۔ کچی نیند کا خمار تھا اس لیے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول کر باغ کا نظارہ کرنے لگی۔ پھر اچانک میری نظریں ایک جگہ منجمد ہو گئیں۔ میری آنکھوں نے جو حیرت انگیز اور ناقابل یقین منظر دیکھا، وہ کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ تہنیت کے زیورات اور گہنوں کا چور میرے سامنے تھا۔ ڈبا کھلا پڑا تھا اور زیورات چاندنی روشنی میں اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔

تایا ابو کی لاڈلی بندریا کے سامنے ایک آئینہ رکھا تھا۔ وہ ڈبے سے گہنے نکال کر باری باری پہنتی، پھر خوش ہو کر اپنی بتیسی چمکاتی اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ اچھلتی کودتی بھی زیور پہنتی بھی اتارتی۔ میک اپ کا کچھ سامان بھی وہاں بکھرا پڑا تھا جو یقیناً تہنیت کا ہی تھا۔ ساری دنیا سے بے خبر بندریا اپنے روپ سنگھار میں مصروف تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے پل بھر میں سب کو نیند سے بیدار کر دیا۔ میں ہر ایک سے یہی کہہ رہی تھی "میں نے چور تلاش کر لیا۔"

یہ جملہ ایسا دھماکا خیز تھا کہ سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ خاص طور سے تایا ابو تو ایسا دہاڑے جیسے چور کو اسی وقت سولی چڑھا دیں گے۔ پھر جب سب نے اس چور کا دیدار کیا تو فرط حیرت سے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سب پتھر کے بت بن گئے ہوں۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ بندریا جو ابھی تک اپنے آپ کو آئینے میں سجا بنا رہی تھی، روشنی دیکھ کر فوراً چوکنا ہو گئی۔ کچھ بعد دیگرے باری باری تمام زیورات اتار کر ڈبے میں رکھے اور پنجوں سے زمین کریدنے لگی۔ اچھا خاصا گڑھا بنا کر اس نے ڈبا، سامان آرائش اور آئینہ جلدی جلدی اندر ڈالا، پھر مٹی پھیلائی اور پھر پیر پھیلا کر اپنی جگہ لیٹ گئی۔ اب سب کی سمجھ میں بات آ گئی تھی۔ ان پر جو غشی کا دورہ پڑا تو الامان الحفیظ! گھر کے نوکر چاکر بھی اپنے کمروں سے نکل آئے۔ سب ہی نے اس ڈرامے کو دیکھا، جہاں سب کے چہرے کھلے کھلے اور خوش تھے، وہیں تایا ابو بے حد نادم اور شرمسار سے لگ رہے تھے۔ بڑی ہمت کر کے وہ تہنیت کی طرف بڑھے اور اسے گلے لگا لیا۔ تہنیت جو ہمیشہ ان سے خائف اور ڈری سہمی رہتی تھی، ان کے سینے سے لگی زار و قطار رونے لگی...... مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔

گاڑی کا وقت نکل چکا تھا، لیکن ہم دونوں میاں بیوی کو اس کا قطعاً افسوس نہیں ہوا۔ بلکہ خوشی اس بات کی تھی کہ تہنیت کی زندگی کی گاڑی جو ہچکولے کھا رہی تھی، وہ دوبارہ خوشیوں کی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

باراتی گھوڑا

ایک تانگے میں بہت سی سواریاں بیٹھی تھیں۔ گھوڑا اچانک چلتے چلتے رک جاتا اور کوچوان نیچے اتر کر اس کے سامنے ناچنے گانے لگتا تو گھوڑا فوراً چل پڑتا۔ جب دو تین بار ایسا ہوا تو سواریوں نے تنگ آ کر پوچھا "بھئی تانگے والے، یہ کیا معاملہ ہے تمہارا گھوڑا گانا سن کر کیوں چل پڑتا ہے؟"

تانگے والے نے نہایت اطمینان سے کہا "دراصل یہ گھوڑا باراتی گھوڑا ہے اور گانا سن کر ہی چلتا ہے۔"

(واجد علی شاہ، لاہور)

www.Paksociety.com

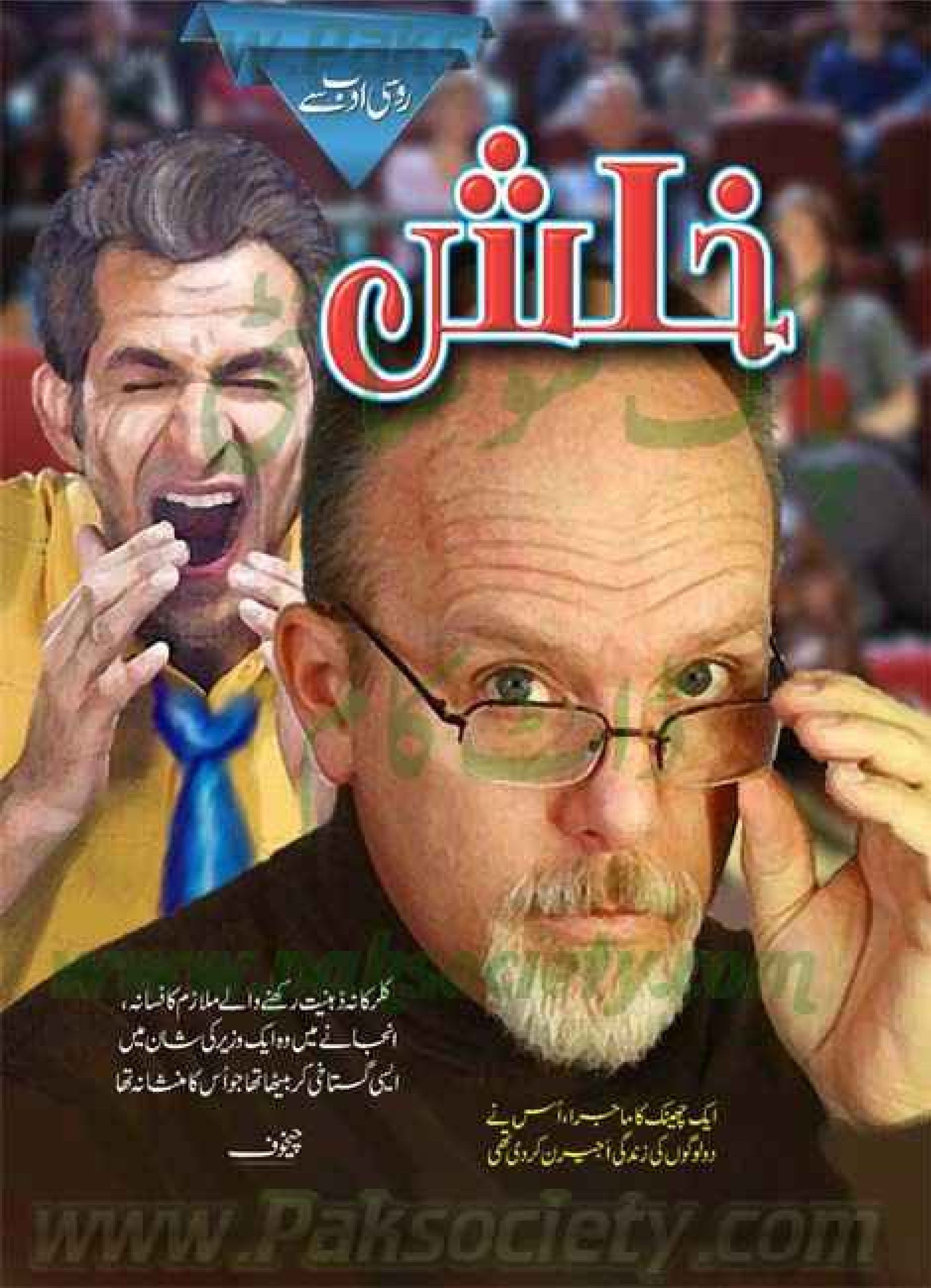
روسی ادب سے
خلش
کلرکانہ ذہنیت رکھنے والے ملازم کا فسانہ،
انجانے میں وہ ایک وزیر کی شان میں
ایسی گستاخی کر بیٹھا تھا جو اس کا منشا نہ تھا
چیخوف
ایک چھینک کا ماجرا، اس نے
دو لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی
www.Paksociety.com

رات

بہت خوبصورت تھی۔ ایک سرکاری محکمے کا کلرک، آئی وان تھیٹر میں بیٹھا ڈراما دیکھ رہا تھا۔

اس کی نظریں سٹیج پر جمی ہوئی تھیں اور وہ خود کو دنیا کا سب سے حسین انسان سمجھ رہا تھا کہ اچانک اس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے۔ گردن کی رگیں تن گئیں۔ آنکھیں اوپر کی طرف اٹھیں۔ سانس رک گیا۔ درد کے مارے وہ اپنی نشست پر دوہرا ہو گیا اور پھر "آخ چھو" اسے بڑے زور کی چھینک آئی۔

ہر بشر کو چھینکنے کا حق حاصل اور وہ جب چاہے، جہاں چاہے، اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے...... پولیس انسپکٹر ہو یا کسان، گورنر ہو یا وزیر، اس ضمن میں سب برابر ہیں۔ لیکن چند شرفا جمع ہوں تو وہاں چھینکنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ تاہم آئی وان اس قدر شرمندہ نہ تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے رومال نکالا۔ اپنی لمبی ناک پونچھی اور تسلی کے لیے دائیں بائیں دیکھا۔ ڈر تھا کوئی بُرا نہ مانے اور پھر وہ جھینپ سا گیا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے ایک چھوٹے قد کا آدمی، اگلی قطار میں بیٹھا اپنے گنجے سر کو رومال سے صاف کر رہا ہے۔ آئی وان نے غور سے دیکھا تو یہ جان کر بڑا افسوس ہوا کہ وہ شخص وزیرِ مواصلات تھا۔ گو وہ اس کا براہِ راست افسر نہ تھا، پھر بھی ایک وزیر کی چندیا پر چھینکنا یقیناً بری بات تھی۔ آئی وان نے فیصلہ کیا کہ اس حرکت پر معافی مانگ لینی چاہیے۔

"جنابِ عالی" "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ یقین جانیے میرا مطلب ہرگز یہ نہ تھا۔ میں تو......" آئی وان نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا۔

"بس بس، اس کا ذکر جانے دو" وزیرِ مواصلات نے بیزاری سے کہا۔

"مگر جناب مجھ سے گستاخی ہوئی ہے۔ آپ ...... ضرور مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اچانک......"

"افوہ، میں کہتا ہوں خاموش ہو جایئے"...... پھیکی سی مسکراہٹ آئی وان کے چہرے پر پھیل گئی۔

بادلِ ناخواستہ اس نے اپنی نظریں سٹیج پر مرکوز کر دیں، لیکن اب اسے کھیل سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ ڈرامے کا وقفہ ہوا اور نوجوانوں میں بیٹ کر تمام لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ آئی وان اپنی جگہ سے اٹھا اور کچھ سوچتے ہوئے وزیرِ مواصلات کے پاس پہنچا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"میرے آقا، مجھ پر کرم فرمائیں اور معاف کر دیں، میں نے ابھی ابھی آپ پر گند چھینکا تھا۔ ویسے میرا منشا ہرگز یہ نہ تھا۔ میں تو"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں رہا۔" وزیرِ مواصلات نے معنوی اخلاق سے کہا۔

آئی وان نے سوچا، کہتا تو یہی ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں، لیکن مجھے اس کا گھورنا پسند نہیں۔ شاید وہ ابھی تک ناراض ہے اور بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ مجھے تفصیل کے ساتھ ساری بات سمجھانی چاہیے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا۔ چھینکنا فطری فعل ہے اور میں اس ضمن میں بالکل بے قصور ہوں۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سوچ رہا کہ میں نے اس پر تھوکا ہے۔ ہو سکتا ہے اس وقت یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئے لیکن بعد میں وہ اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتا ہے۔

گھر پہنچ کر آئی وان نے سارا واقعہ اپنی بیوی کو سنایا۔ بیوی نے غور و خوض کے بعد کہا: "گو وزیرِ مواصلات تمہارا براہِ راست افسر نہیں، پھر بھی وہ خیال کر سکتا ہے کہ تمہیں شریف آدمیوں میں بیٹھنے کی تمیز نہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم جا کر اس سے معافی مانگ لو۔"

آئی وان بیوی سے بولا: "معافی تو میں نے وہیں مانگ لی تھی، لیکن اس نے ڈھنگ سے جواب نہ دیا۔ پھر اتنا وقت بھی نہ تھا کہ تفصیل سے بات ہو سکتی۔"

دوسرے روز آئی وان نے اپنا بہترین سرکاری کوٹ پہنا، شیو بنائی، جوتے پالش کیے اور یوں سج دھج کر اپنی صفائی پیش کرنے وزیرِ مواصلات کے ہاں پہنچا۔ وزیر صاحب کا گھر ملاقاتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ باری باری لوگوں سے مل رہے تھے۔ آئی وان بڑے ادب سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر بات کر کے فارغ ہوا تو اس نے سوالیہ نظروں سے آئی وان کی طرف دیکھا۔ وہ بولا:

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

آرکٹک

آرکٹک زمین کے اس حصے کو کہتے ہیں جو قطب شمالی کے ارد گرد واقع ہے۔ یہ جگہ امریکہ، کینیڈا، ناروے، سویڈن، فن لینڈ، روس اور گرین لینڈ کی مشترکہ ملکیت اور اس کا کل رقبہ ۸۰ لاکھ مربع میل کے قریب ہے۔ سردیوں میں یہاں درجہ حرارت صفر سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جس کے متعلق آپ بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ یہاں ۲۴ گھنٹے کا دن ہوتا، لیکن ایسا صرف گرمیوں میں ہوتا ہے اور وہ بھی تھوڑے عرصے کے لیے۔ یہاں برف گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں جنھیں کتے کھینچتے ہیں۔ اس علاقے کے برفانی ریچھ بہت مشہور ہیں بلکہ اسے سفید ریچھوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں دن اور رات کا دورانیہ چھ چھ ماہ تک طویل ہو جاتا ہے۔

(آصف مسعود، ملتان)

"جناب، پچھلی رات شاید آپ کو یاد ہو، میں نے تھیٹر میں آپ کے اوپر چھینکا تھا......"

"عجب احمق آدمی ہو۔" یہ کہہ کر وزیر ایک اور شخص سے بولا: "فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ تو بات ہی نہیں سنتا، آئی وان نے سوچا اور پھر اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ناراض ہے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جا سکتا جب تک ساری بات تفصیل سے نہ کر لوں۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وزیر مواصلات سب لوگوں سے مل چکا تو اپنے ذاتی کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ آئی وان بھی اس کے ساتھ ہو لیا اور دبے لفظوں میں بولا "مجھے معاف کر دیجیے حضور، مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اس قدر تکلیف دی۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔ قصہ یہ تھا کہ......"

وزیر مواصلات نے آئی وان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ پھر اپنے اوپر ضبط کرتے ہوئے بولا "تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

مذاق...... آئی وان نے سوچا۔ میرے خیال میں تو مذاق ہرگز نہ تھا، سمجھ میں نہیں آتا، مواصلات کا وزیر ہوتے ہوئے بھی وہ معمولی سی بات نہ سمجھ سکا۔ خیر، اب میں معافی مانگ کر اسے زیادہ شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ خدا غارت کرے۔ اچھا، ایک اور تدبیر ہو سکتی ہے۔ میں اسے ایک خط لکھوں گا۔ خود اس کے ہاں جانا مناسب نہیں، بس ٹھیک ہے...... اب مجھے گھر جانا چاہیے۔

گھر پہنچ کر آئی وان خط نہ لکھ سکا۔ وہ سوچتا رہا۔ خط لکھنے کے لیے اس کے پاس الفاظ ہی نہ تھے، ورنہ وہ ضرور لکھتا، چنانچہ دوسرے دن وہ از خود وزیر مواصلات کے گھر پہنچ گیا تاکہ معاملے کو سلجھا سکے۔

"میں نے آپ کو کل بھی تکلیف دی تھی"۔ آئی وان نے بات شروع کی۔ وزیر نے پلٹ کر دیکھا۔ آئی وان فوراً بولا "جناب، میں آپ کا مذاق نہیں اڑانا چاہتا بلکہ میں تو آپ سے معافی مانگنے آیا تھا۔ میری چھینک کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف ہوئی، اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ جہاں تک مذاق اڑانے کا تعلق ہے تو جناب، میں ایسی جسارت کیسے کر سکتا ہوں؟ ایسا ہونے لگے تو بڑوں کی عزت کیونکر رہ سکتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ......"

"میں کہتا ہوں یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ...... ورنہ"

وزیر کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔

آئی وان کی نظروں میں کمرا گھومنے لگا۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک مشین کی طرح چلتا وہ گھر پہنچا، سرکاری کوٹ اتارے بغیر صوفے پر لیٹ گیا...... اور پھر کبھی نہ اٹھ سکا۔

www.Paksociety.com

سائنسی کہانی
بنی نوع انسان کے ایک
پراسرار بیری کا قصہ عجیب
مرض سرطان اس کی
ارتقا

اُس روز کے اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع کی "ایک ڈاکٹر نے سرطان کا کامیاب علاج دریافت کر لیا۔"

خبر میں بتایا گیا کہ طویل عرصے تحقیق کے بعد ویسٹ کوسٹ اسپتال میں ایک ایسی دوا دریافت ہوئی ہے، جس سے سرطان کا مرض اسی طرح ختم کیا جائے گا جس طرح ملیریا کا سدِ باب کر دیا گیا۔ تیسری جنگِ عظیم کے بعد یہ اسپتال زیادہ تر فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا تاہم اس کے ایک معروف معالج اور سائنسدان ڈاکٹر بریٹ کی نگرانی میں مدتوں سے سرطان پر تحقیق جاری تھی۔ اب اس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے، جن کے مطابق ایسا موثر علاج دریافت کر لیا گیا ہے، جس کے ذریعے بہت کم خرچ میں مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ خبر میں اُمید ظاہر کی گئی کہ ڈاکٹر بریٹ بہت جلد اس سلسلے میں ایک پریس کانفرنس میں تفصیلات کا اعلان کریں گے۔

☆☆

تاریکی اور دھند میں جہاز کی آواز تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ شاید وہ بلندی سے نیچے آ رہا تھا لیکن دکھائی نہ دیا۔ ویسٹ کوسٹ اسپتال کے محافظ بل ڈاسن نے آسمان کی طرف نگاہیں جما کر دیکھا مگر اُسے کچھ نظر نہیں آیا۔ دورانِ جنگ اسپتال کی فوجی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر ہر وقت بمباری کا خطرہ رہتا تھا، اسی لیے وہاں محافظوں کی تعداد خاصی تھی۔ لیکن جنگ کے بعد بھی اسپتال کی حفاظت کے لیے بوجوہ کافی انتظامات کیے گئے۔ جارج نے اپنے ساتھی کو آواز دی۔ "بل دیکھو! کوئی شخص پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اتر رہا ہے۔"

بل ڈاسن نے فوراً اپنی سرچ لائٹ کا رُخ آسمان کی طرف کیا تو اندھیرے میں روشنی کی لکیر اس پیراشوٹ پر مرکوز ہو گئی...... "ارے جارج! یہ پیراشوٹ کیسا ہے، اس کے ساتھ تو کوئی آدمی ہی نہیں۔" آواز حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"ہاں، واقعی!" جارج نے جواب دیا۔ "یہ بھی ہمارے دشمنوں کا کوئی خفیہ ہتھیار معلوم ہوتا ہے۔ تم خبردار رہو، میں زمین پر اترتے ہی اُسے دبوچ لوں گا۔"

بل ڈاسن تیزی سے درمیانی میدان پار کرتا ہوا اُس طرف بڑھا جہاں پیراشوٹ نیچے اتر رہا تھا۔ لیکن اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی پیراشوٹ درختوں کے جھنڈ کے عقب میں اتر گیا۔ بل فوراً پہنچا لیکن وہاں تو دُور دُور تک کسی پیراشوٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے دُور دُور تک اپنی ٹارچ سے روشنی ڈالی لیکن کچھ نہیں دکھائی دیا۔ بل حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک قد آور کتا اپنی دُم اوپر اٹھائے قریب سے گزرتا اسپتال کی طرف چلا گیا۔ بل نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "میں نے کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟ اگر کوئی شخص اترا تھا تو اس کے قدموں کے نشان تو ہونے چاہئیں پھر پیراشوٹ اتنی جلد کیسے اور کہاں چھپایا جا سکتا ہے؟"

اسپتال کے استقبالیے میں نرس دیر سے بیزاری کی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے دروازے سے باہر ایک سایہ سا دیکھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی قد آور کتا اس کی طرف دوڑتا آ رہا ہے۔ وہ کتوں سے بہت ڈرتی تھی، اس لیے تیزی سے دروازہ بند کرنے بڑھی۔ لیکن پھر اُسے خود پر غصہ آنے لگا کیونکہ وہ تو ایک اچھا خاصا آدمی تھا، جو باوقار چال سے اُس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اُس نے بڑی شائستگی سے نرس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میرا نام پیٹر گرینجر ہے۔ کیا میں ڈاکٹر بریٹ کے معاون سے مل سکتا ہوں؟"

نرس نے اُسے سامنے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور ڈاکٹر بریٹ کے معاون ڈاکٹر کارٹر کا نمبر ملانے لگی۔

☆☆

ڈاکٹر کارٹر نے جب ڈاکٹر بریٹ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اُسے کاغذات پر نگاہیں جمائے کام کرتے پایا۔ ڈاکٹر کارٹر کے لہجے سے اضطراب کی کیفیت ظاہر تھی "وہ بالآخر یہاں پہنچ گیا...... ڈاکٹر......!"

بریٹ نے اس کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے تھکی آواز میں پوچھا "کون یہاں آپہنچا ہے، کارٹر...... تم شاید سونے گئے تھے؟"

"ہاں! میں سونے لگا تھا لیکن اس سے ملنے کا موقع کسی طرح بھی نہیں کھو سکتا، چاہے کوئی لاکھوں ڈالر کیوں نہ دے...... اور اب تو مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ ڈاکٹر بریٹ! آپ کو اسی وقت اس سے ملنا چاہیے۔" کارٹر نے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم کس کی بات کر رہے ہو کارٹر...... مجھے کس سے فوراً مل لینا چاہیے، وہ کون ہے اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

"میں نے ابھی ابھی اسے اسپتال میں مریض کی حیثیت سے داخل کیا ہے۔ اس کا نام پیٹر گرینجر ہے۔"

"میں اب بھی تمھاری بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آخر یہ شخص ہے کون، جسے تم نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر فوراً داخل کر لیا؟ آخر ہے کون! اور ہاں مجھے یاد آیا، اسپتال میں تو کوئی بستر بھی خالی نہیں پھر تم نے اسے کس طرح داخل کر لیا؟"

"ڈاکٹر! ہم اس شخص کو داخل کرنے کا موقع کسی قیمت پر ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے۔ آپ کو یاد ہے، میں نے آپ کو ایک ایسے مریض کے متعلق بتایا تھا جو گزشتہ سال نیویارک کینسر انسٹیٹیوٹ میں داخل ہوا تھا۔ وہی جو دنیا میں سرطان کے ہر اسپتال میں جا چکا ہے، جو فٹ پاتھ کے ڈاکٹروں تک سے علاج کرا چکا۔ اس نے سیکڑوں آپریشن کرائے ہیں۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعے سرطان دور کرنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ وہ اب بھی زندہ ہے۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ وہ مستقل طور پر سرطان کا مریض ہے اور ابھی تک زندہ، حالانکہ ڈاکٹروں کی پیش گوئی کے مطابق اسے چھ ماہ قبل مر جانا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں وہ دنیا میں سرطان کا واحد مریض ہے جسے عجیب وغریب کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر! اگر آپ نے اس کا علاج کر لیا تو پھر دنیا آپ کے طریق علاج کی قائل ہو جائے گی۔" ڈاکٹر کارٹر نے ہانپتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر بریٹ نے معاون کی جذباتی کیفیت نظرانداز کرتے ہوئے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "ہاں ڈاکٹر! مجھے یاد آرہا ہے، تم نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ڈاکٹر سیمسن بھی اس کا علاج کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ جو کچھ تم نے مجھے ڈاکٹر سیمسن کے بارے میں بتایا تھا، اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ سرطان کی دوا تلاش کرنے کے سلسلے میں ہم دونوں کا ایک ہی طریق کار تھا۔ اگرچہ وہ مجھ سے زیادہ

عالی شان عمارتیں اور شاہجہان

مغل شہنشاہ جہانگیر کا تیسرا بیٹا شاہجہان اپنے تدبر اور دینِ اسلام سے بے حد محبت کرنے کے علاوہ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں بنانے کے لیے بھی مشہور ہے۔ ۵ جنوری ۱۵۹۲ء کو پیدا ہونے والے شاہجہان کے دادا اکبر بادشاہ ابھی زندہ اور اپنے پوتے کو بے حد پسند کرتے تھے۔

شاہجہان نے علوم اور فنون سپہ گری کی تعلیم حاصل کی۔ وہ شہزادوں کی طرح عیش و عشرت کا دلدادہ نہ تھا بلکہ بڑے پسندیدہ کردار کا مالک تھا۔ اپریل ۱۶۱۲ء میں ارجمند بیگم سے شادی ہوئی۔ تخت نشین ہوتے ہی شاہجہان نے شریعت اسلامی اختیار کی۔ اس کے دور میں دکن اور گجرات میں قحط پڑا تو لاکھوں روپے لوگوں کی امداد پر صرف کیے۔ دکن کو فتح اور قندھار پر قبضہ کیا۔ غرض یہ کہ سلطنت کی توسیع اور حسن انتظام پر خاص توجہ کی۔

شاہجہان فن تعمیر کا دلدادہ تھا۔ "تخت طاؤس" بنوایا جس کی تعمیر میں لعل، ہیرے، زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر اور بے اندازہ سونا صرف کیا۔ اس تخت کی تیاری میں ۷ سال لگے اور ایک کروڑ روپے صرف ہوا۔ دہلی کا لال قلعہ اور نئی شہر پناہ اور جامع مسجد اسی کی بنائی ہوئی ہے جو عظمت اور خوبصورتی کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں بے نظیر ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت خواجہ معین الدین کے مزاروں پر شاندار گنبد بنوائے اور سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ممتاز محل کا مقبرہ "تاج محل" آگرہ میں تعمیر کروایا، جو ۲۲ سال میں مکمل ہوا اور اس پر ۳ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ یہ عمارت اپنے حسن و جمال اور اپنی عظمت کے اعتبار سے دنیا بھر کی عمارتوں میں بے نظیر ہے۔ عالموں، شاعروں اور مصوروں کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ آپ نے ۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء کو ۷۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(شیخ محمد طارق، ملتان)

"ذہین اور تیز تھا۔ کاش! وہ افسوس ناک طریقے سے ہلاک نہ ہوتا تو اب تک دنیا سے سرطان کا خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن اب میں بھی اُسی کے راستے پر چل رہا ہوں۔" ڈاکٹر برینٹ نے جواب دیا۔

"جی ہاں ڈاکٹر! کاش وہ زندہ ہوتا۔ وہ دھماکا جس سے لیبارٹری تباہ ہوئی اور ڈاکٹر تھیمسن ہلاک ہو گیا، اُسی رات ہُوا جب پیٹر گرینجر اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ میں اپنی ملازمت ترک کر کے آپ کے پاس آ رہا تھا، جب اسی رات پیٹر سے میری بھی ملاقات ہوئی۔ شاید اسی لیے اُسے میں یاد رہا تھا اور اُس نے استقبالیہ پر میرا ہی حوالہ دیا۔"

"وہ خوش قسمت تھا کہ ڈاکٹر تھیمسن کے ساتھ دھماکے میں ہلاک نہیں ہوا۔"

"ہم بھی خوش قسمت ہیں۔" ڈاکٹر کارٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر پیٹر بھی مر جاتا تو ہمیں دُنیا کے سب سے بڑے سرطانی مریض کو تندرست کرنے کا موقع کیسے ملتا؟ شاید وہ دُنیا کا واحد شخص ہے، جسے یہ معلوم ہے کہ دُنیا کے تمام بڑے بڑے اسپتالوں میں سرطان کے متعلق کیا تحقیق ہو رہی ہے۔ وہ تو کئی ڈاکٹروں سے بھی بڑھ کر سرطان کے بارے میں جانتا ہے۔ کیا میں اُسے اندر بھجوا دوں؟"

"ہاں! لیکن تم جا کر سو جاؤ، تمہیں نیند کی سخت ضرورت ہے۔"

☆☆

ڈاکٹر برینٹ نے اپنے ذہن میں مریض کے بارے میں جو خاکہ بنایا تھا، پیٹر گرینجر اس سے بالکل مختلف نکلا۔ وہ تو ایک صحت مند اور طاقتور شخص دکھائی دیا۔ اُس نے کافی مضبوط لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا "ڈاکٹر! کیا آپ کا طریق علاج بھی غذا کے ذریعے ہے؟"

"جی ہاں۔"

"میں اس طریق علاج سے بخوبی واقف ہوں، یعنی آپ مریض کو غذا میں وٹامن کے ذریعے سرطان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بخشتے ہیں۔ اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ وٹامن اے، بی، سی اور ڈی کو کس تناسب سے غذا میں شامل کرتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اس کا رابطہ کسی عام مریض سے نہیں، یہ شخص تو خود اسی کا انٹرویو لے رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا "جناب! آپ تشریف تو رکھیے، میں اپنے طریق علاج کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔"

پیٹر باوقار چال سے آگے بڑھا اور بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے حیرت اور تعریف کی ملی جلی نگاہ سے دیکھا۔ پھر کہنے لگا۔ "آپ تو بالکل تندرست دکھائی دیتے ہیں مسٹر پیٹر! بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ سرطان آپ کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ اکثر مریض تو تھک کر چلتے ہیں اور ان کی آواز اور چال ڈھال سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ وہ مرض کے کس مرحلے میں ہیں؟"

"آپ کو حیران کرنے کے لیے میرے پاس اور بھی بہت کچھ ہے ڈاکٹر!" پیٹر نے طنزیہ اور خشک انداز میں کہا۔

اس کے انداز بیان سے ڈاکٹر کو غصہ آیا لیکن پھر پیشہ ورانہ احساس فرض غالب آ گیا۔ وہ پیٹر کو اپنے طریق علاج کے بارے میں مختصراً بتانے لگا:

"میں نے میڈیکل کالج میں داخلے کے وقت ہی یہ سوچ لیا تھا کہ سرطان کی لعنت پر قابو پانے اور اُس کا علاج دریافت کرنے کے لیے وسیع تر بنیادوں پر کام کروں گا۔ اس مقصد کے لیے دوسرے سائنس دان اور ڈاکٹر تو پیچیدہ مشینیں ایجاد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ جس مریض کو آپریشن سے بھی آرام نہ آئے، اس کا علاج کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے لیکن میرا اندازِ فکر مختلف تھا۔ میرا بنیادی نظریہ تھا کہ کوئی ایسی دوا ایجاد کروں کہ اس کی مدد سے خاص عرصے میں مریض کو مرض سے نجات دلا سکوں۔

چنانچہ سب سے پہلے میں نے اس بنیادی بات پر غور کیا کہ آخر وہ کون سا عمل ہے، جس سے مریض کی صحت پر خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔ اس کا جواب بڑا آسان تھا۔ انسان زندہ رہنے کے لیے غذاؤں کے حساب سے مختلف

اشیائے خوردنی استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر میں نے بغرضِ علاج یہ اصول مرتب کیا کہ انسانی جسم کو روزانہ کتنی مقدار میں کون کون سے وٹامن درکار ہوتے ہیں جن سے کوئی بھی شخص اپنے بدن کی خاص حد تک نشوونما کر سکے۔ یوں میرا بنیادی مقصد جسم میں سرطان پیدا ہونے کی وجہ ختم کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جسم کے ہر خلیے کو ضرورت کے مطابق خوراک ملے تو اس میں مطلوبہ توانائی پیدا ہوتی رہے گی۔ یوں سرطان اوّل تو ہوگا نہیں اور ہوا تو اس طریق علاج کے بعد ختم ہو جائے گا۔“

”ہاں ڈاکٹر! آپ بالکل درست کہتے ہیں۔“ پیٹر نے بھاری لہجے میں کہا۔ ”آپ اس مرض کا علاج بخوبی سمجھ چکے، اس لیے نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کو مرنا ہوگا۔ بلکہ ان سبھی لوگوں کے مقدر میں مرنا لکھا ہے، جو اس حقیقت سے واقف ہو چکے۔“

”کیا مطلب؟“ ڈاکٹر نے چونک کر دریافت کیا۔ جوں جوں پیٹر کے الفاظ کا مفہوم ڈاکٹر کی سمجھ میں آیا اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔ وہ خوفزدہ نہیں تھا لیکن سوچنے لگا کہ یہ مریض تو پاگل لگتا ہے اور پاگل اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے میں نتائج کی پروا نہیں کرتا۔

”تم شاید پاگل ہو پیٹر۔“ اس نے بڑے سکون سے کہا ”میں دنیا بھر میں واحد ڈاکٹر ہوں، جو تمھیں اس مرض سے نجات دلا سکتا ہوں۔ تم بھلا مجھے کیسے ہلاک کر سکتے ہو؟“

”نہیں، میں پاگل نہیں ہوں۔“ پیٹر نے باوقار لہجے میں کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، ہاں! آپ کو بہرحال مرنا پڑے گا۔ آپ کی بدقسمتی کہ سرطان کا کامیاب علاج دریافت کرنے کے باعث ہی میں آپ کو ہلاک کرنے پر مجبور ہوں۔ لیکن کیا آپ ایک سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟“

”کیسا سوال؟“ ڈاکٹر اب بھی خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔

”آپ کے خیال میں مکمل طور پر صحت مند جسم کیسا ہوتا ہے؟“ پیٹر نے سوال کیا۔

ڈاکٹر برینٹ نے سوچا کہ اگر میں کسی طرح اس پاگل کو باتوں میں لگائے رکھوں تو شاید جان بچانے کا کوئی موقع مل جائے۔ اس نے بڑے محتاط الفاظ میں جواب دیا ”مکمل طور پر صحت مند جسم اپنے کسی عضو کو خطرے میں ڈالے بغیر تغیر پذیری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یوں وہ اپنی جسمانی ہیئت تبدیل کرنے پر بھی قادر ہو سکتا ہے۔ اس صلاحیت کا پیدا ہونا اسی صورت ممکن ہے اگر ریشے فوری تبدیلی پر قادر ہو جائیں اور......!“

اچانک پیٹر اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: ”آپ تو میری توقع سے بھی زیادہ ذہین نکلے۔ اگر واقعی کوئی اپنے ریشے اور خلیے تبدیل کرنے پر قادر ہو جائے تو دائمی طور پر زندہ رہ سکتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ سرطان کا بڑھنا مرض نہیں بلکہ یہ تو انھی ریشوں اور خلیوں کی ترقی کا دوسرا نام ہے جس سے انسان اپنی ہیئت تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ ترقی انسان کے لیے اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ وہ اس کے ذریعے ہوا میں اڑ، خلا میں تیر اور کسی بھی جگہ کسی

نمک پارے

وہ رنگ و روپ کا اتنا خیال رکھتے ہیں
تماشا گاہ میں قد بحال رکھتے ہیں

جو گر پڑے تو سنبھلنے نہ پائے کوئی بھی
وہ شاخ شاخ کو محوِ زوال رکھتے ہیں

خیالِ خیر کہاں، پاس سے گزر جائے
مزاجِ شر میں وہ اوجِ کمال رکھتے ہیں

بڑے بڑوں نے طلب لے لیے کرپشن کے
حرام خوری کے تمغے سنبھال رکھتے ہیں

گریز صبح کی بھی ساعتوں میں عیاں
فروغِ شب میں وہ اپنی مثال رکھتے ہیں

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
کمان و نیزہ و شمشیر و ڈھال رکھتے ہیں

گزرتی جاتی ہیں سب ساعتیں یونہی بے کار
اگرچہ پاس کئی ماہ و سال رکھتے ہیں

(خالد ناز)

www.paksociety.com

www.paksociety.com

بھی ہیئت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے ریشوں اور خلیوں کو ہوا میں ریت کے ذروں کی طرح بکھیر اور دوبارہ انھیں جوڑ کر کوئی بھی صورت اختیار کر سکتا ہے۔''

ڈاکٹر بریٹ نے کہا ''پیٹر! تم پاگل ہو گئے ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ ذرا تم اپنی حالت پر غور کرو، سرطان سے تمھاری کیا حالت ہو گئی ہے، تم مدتوں سے اس خدشے میں مبتلا ہو کہ کسی بھی وقت تمھاری موت واقع ہو سکتی ہے۔ سرطان کے خلیے تمھارے جسم میں نشوونما حاصل کر کے تم پر مسلط ہو چکے ہیں۔''

''نہیں ڈاکٹر ہرگز نہیں۔'' پیٹر نے کہا۔ ''انسان اپنے شاندار ارتقا کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے۔ جوں جوں دنیا میں سرطان زیادہ پھیلے گا، شاندار مستقبل کی منزل قریب ہوتی جائے گی۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ اکثر سائنس دانوں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا، حتیٰ کہ آپ نے بھی نہیں کہ سرطان واحد مرض ہے جو جراثیم نہیں خلیوں کے ذریعے پھیلتا ہے۔ اب آپ شاید سمجھ سکیں کہ آپ کی موت اتنی ضروری کیوں ہو گئی۔

''اب دنیا کا کوئی لالچ اور خوف ایسا نہیں جو مجھے اس ارادے سے باز رکھ سکے۔ آپ کو مرنا ہی ہو گا کیونکہ اس خلیاتی قابلیت کو جسے آپ سرطان کا مرض قرار دیتے ہیں اور جسے تباہ کرنے کا کام آپ کے ذمے ہے، انسانیت کی بقا اور ترقی کے لیے زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر ہونا ہے۔ آپ اگر زندہ رہے تو مستقل طور پر اس تغیر پذیری کی صلاحیت کے مخالف رہیں گے کیونکہ مذہب اور اخلاقیات کی رو سے آپ لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ آپ کو اس عظیم قوت کا دشمن ہونے کی وجہ سے مرنا ہی ہو گا۔ بالکل ڈاکٹر کیمسن کی طرح! اسی طرح جیسے سرطان ختم کرنے کے مدعی پہلے بھی مرتے رہے ہیں۔

''میں اپنی اس عظیم صلاحیت کو ختم کرانے نہیں بلکہ اپنے اور دوسرے سرطانی انسانوں کو آپ جیسے شدید خطرے سے نجات دلانے آیا ہوں۔ میں نے محض اتفاقاً وہ اخبار دیکھ لیا جس میں آپ سے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ پھر میں دنیا کی مخالف سمت سے تیز ترین ہوائی جہاز کی صورت اختیار کر کے یہاں پہنچا۔ پھر پیراشوٹ میں تبدیل ہو کر نیچے اترا، محافظ سے بچنے کے لیے میں نے کتے کا روپ دھار لیا اور پھر دروازے تک پہنچتے پہنچتے پیٹر گرینجر بن گیا۔ میں زمین پر صرف اس لیے آیا ہوں کہ آپ جیسے سائنسی دیوانوں سے انسانی نسل کی ایک اہم صلاحیت تباہ ہونے سے بچا لوں۔''

''زمین پر! کیا تم زمین کے باشندے نہیں؟''

''میں ہر جگہ کا باشندہ ہوں، زمین کا، پورے نظام شمسی کا اور اس نظام شمسی سے پرے بھی جو دنیائیں ہیں، وہاں کا بھی...... اب میں ہر شکل اختیار کر سکتا ہوں اور آپ مجھے اسی صلاحیت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اب آپ مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

ڈاکٹر بریٹ سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ وہ بالکل بے بس ہو چکا تھا، پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پیٹر گرینجر کسی اور شکل میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ چمکنے لگا اور پھر...... پھر فرش پر پیٹر گرینجر کی بجائے ایک بہت بڑا بم دکھائی دینے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بچاؤ...... بچاؤ......!'' وہ بے ساختہ چیخ اٹھا۔ مگر آواز کا رد عمل معلوم کیے بغیر وہ ایک خوفناک دھماکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

پیٹر گرینجر کے منتشر خلیوں کو دوبارہ متحد ہونے اور انسانی ہیئت اختیار کرنے میں چند لمحے لگے۔ پھر وہ جیسے آیا تھا، اسی طرح رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ فوجی محافظوں نے دوبارہ کسی جہاز کے اڑنے کی آواز سنی اور وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

☆☆

اگلی صبح وزارت داخلہ کی طرف سے اخبارات میں یہ بیان شائع ہوا ''آج رات ایک انتہا پسند گروہ نے ویسٹ کوسٹ اسپتال پر بم مار کر اسے تباہ کر دیا۔ چند نرسیں، ڈاکٹر اور مریض ہلاک ہو گئے۔ اسپتال کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

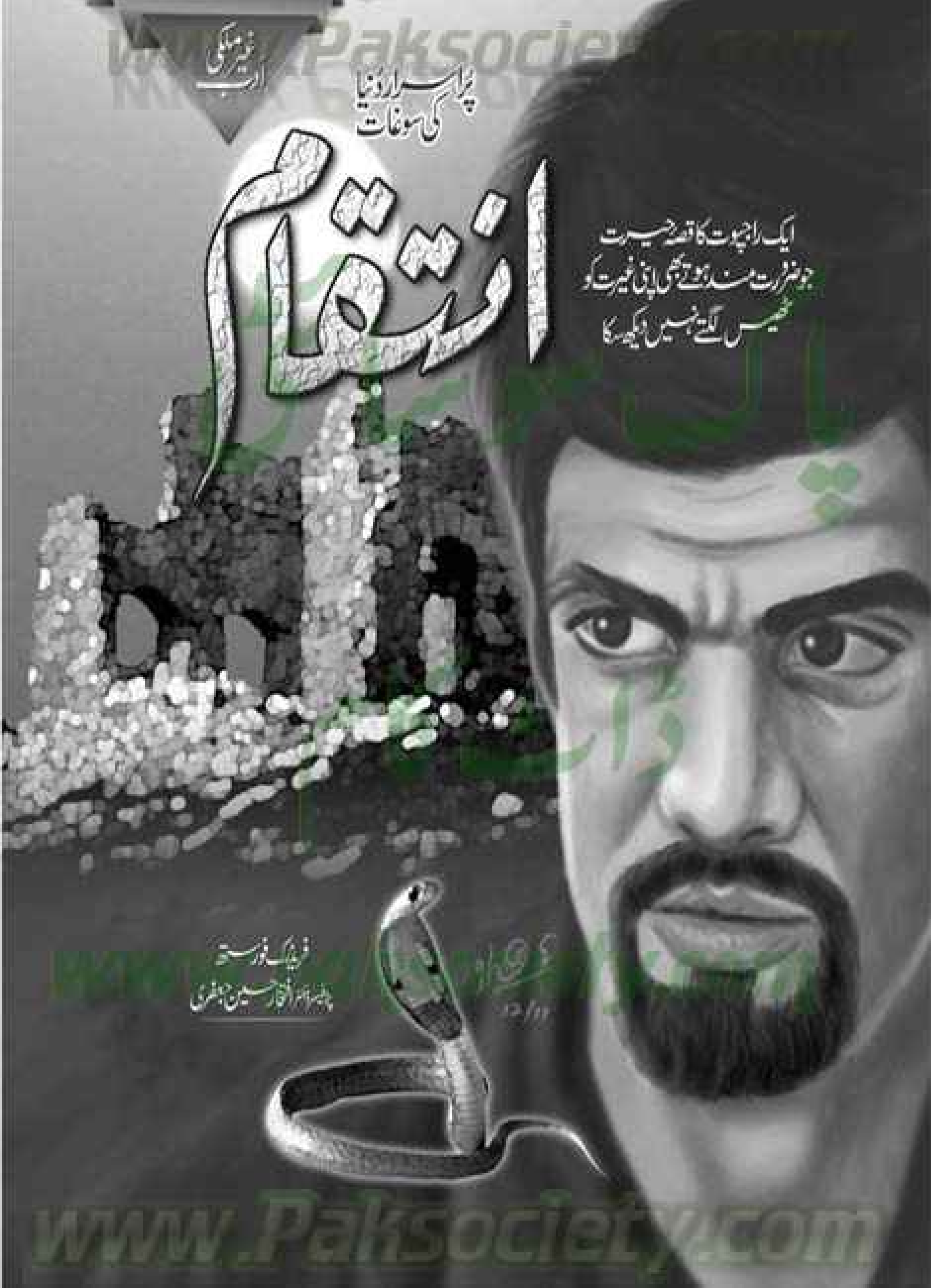

انتقام
ایک راجپوت کا قصہ حسرت
جو عزت مند ہوتے بھی اپنی غیرت کو
ٹھیس لگتے نہیں دیکھ سکا
www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

میکوٹن

نے سامنے بیٹھے امیدوار کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ دبلا پتلا گندمی رنگت کا آدمی کام کی تلاش میں آیا تھا۔ میکوٹن نے اُسے بتایا کہ یہ کام بہت مشقت والا اور عارضی ہے، تمھیں نقد ادائیگی کی جائے گی۔ یہ پرانی عمارتیں گرانے کا کام ہے جس میں خطرہ بھی ہے لیکن بیمہ یا صحت کے علاج کے سلسلے میں ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔

رام لعل نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کا تعلق بھارتی علاقے راجستھان کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ وہ طب کی تعلیم پانے آئرلینڈ آیا تھا۔ اس کا آخری سال تھا، اپنی ضروریات پورا کرنے کی خاطر اُسے مزید آمدن درکار تھی۔ اسی لیے وہ ٹھیکیدار کے دفتر عارضی ملازمت حاصل کرنے آیا تاکہ موسم گرما کی چھٹیوں میں کچھ آمدن حاصل کر سکے۔

میکوٹن نے رام لعل سے کہا، وہ کل سے کام پر آجائے۔ اوقات صبح ۷ بجے سے شام کے ۷ بجے ہیں۔ تمام مزدوروں کو ٹرک صبح ۶ بجے اسٹیشن کے سامنے سے لیتا ہے۔ ان کا انچارج مل کیمرون ہے، میں اُسے بتا دوں گا۔

رام لعل دفتر سے باہر آیا اور ایک کمرا تلاش کرنے لگا۔ کوشش کے بعد اسے اسٹیشن کے قریب ایک کمرا مل گیا۔ اتوار کے روز وہ اپنے مختصر سامان کے ساتھ اس کمرے میں منتقل ہو گیا۔ دوپہر کے وقت وہ بستر پر لیٹا اپنے گاؤں کی پہاڑیوں، کھیتوں اور کسانوں کو یاد کرتا اور سوچتا رہا کہ جلد اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر بن کر گاؤں چلا جائے گا۔

پیر کی صبح رام لعل جلدی اٹھا اور ۶ بجے کے قریب مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ٹرک پہنچ گیا۔ اس وقت تک ۱۲ افراد جمع ہو چکے تھے۔ رام لعل کچھ دور ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں گروپ انچارج بھی پہنچ گیا۔ اس کے پاس مزدوروں کی فہرست تھی اور وہ سب کو جانتا تھا۔ رام لعل اس کے قریب پہنچا تو فورمین نے پوچھا "کیا تم وہی کالے آدمی ہو جسے میکوٹن نے ملازم رکھا ہے۔"

اس نے کہا "ہاں میں ہی ہری کشن رام لعل ہوں۔"

فورمین مل کیمرون کا رویہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار تھا۔ اس کا قد ۶ فٹ ۳ انچ اور جسم طاقتور تھا، شکل سے بھی وہ ایک پہلوان معلوم ہوتا۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور رام لعل سے کہا "جاؤ ٹرک میں بیٹھو"۔ دوران سفر ایک شخص نے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو؟"

اس نے کہا "بھارت کے علاقے راجستھان سے۔"

آدمی نے پوچھا "کیا تم عیسائی ہو؟"

رام لعل نے کہا "میں ہندو ہوں۔"

اس شخص نے پھر جس کا نام برٹس تھا، باقی لوگوں سے رام لعل کا تعارف کرایا۔ ایک شخص نے کہا "تمھارے پاس کھانا نہیں ہے؟"

رام لعل نے کہا "میں کل سے لاؤں گا۔"

دوسرے شخص نے پوچھا "کیا تم نے ایسا مشقتی کام پہلے کیا ہے؟"

رام نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس شخص نے کہا "تمھیں مضبوط جوتے اور دستانے بھی خریدنے ہوں گے"۔ باتوں باتوں میں رام لعل نے بتایا کہ وہ طب کا طالب علم ہے اور اسے مجبوراً یہ کام کرنا پڑ رہا ہے تاکہ کچھ زائد آمدن حاصل کر سکے۔

ٹرک ڈوبلنڈ روڈ پر ایک کچے راستے پر درختوں کے قریب رک گیا۔ وہاں گومبر کے کنارے شراب کی ایک پرانی فیکٹری تھی جسے گرایا جانا تھا۔ عمارت کے مالک کی خواہش تھی کہ کم سے کم رقم خرچ ہو۔ لہٰذا اس نے کسی بڑی کمپنی کے بجائے ٹھیکیدار میکوٹن سے بات کی جو مناسب رقم میں بغیر مشینری کے عمارت گرانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میکوٹن کے مزدوروں نے یہ کام بھاری ہتھوڑوں اور کدالوں کی مدد سے کرنا تھا۔ میکوٹن کو یہ بھی لالچ تھا کہ عمارت ٹوٹنے سے نکلنے والی لکڑی اور سیکڑوں ٹن اینٹیں

www.Paksociety.com

تعارف

فریڈرک فورسیتھ ۱۹۳۸ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ ابتدا ہی سے اسے مہم جوئی کا شوق تھا۔ ۱۷ سال کی عمر میں وہ بل فائیٹر بن گیا اور اسپین چلا گیا۔ ۱۹ سال کی عمر میں واپس آ کر برطانوی فضائیہ میں پائلٹ بنا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ پیرس چلا گیا اور صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کا پہلا ناول The Day of Jackal تھا جو بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد مزید ناول آتے رہے لیکن ہر ناول لکھنے سے پہلے تفصیلی تحقیق اور واقعات کی چھان بین اس کا مخصوص طریقہ کار تھا۔

No Come Back اس کی ۱۰ مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ ان کہانیوں میں سے ایک کہانی "انتقام" کے عنوان سے آپ ان صفحات میں پڑھ رہے ہیں۔

فروخت کر کے اضافی آمدنی حاصل ہوگی۔

مزدور اوزار اٹھائے عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس بڑے ہتھوڑے، لمبی چھینیاں اور رسّے تھے۔ فورمین نے کہا "چلو بھئی کام شروع کرو۔ ہم سب سے پہلے چھت کی ناکیں توڑیں گے۔" رام لعل نے اندر چھت دیکھی جو کسی چار منزلہ عمارت کے برابر اونچی تھی۔ اسے اونچائی سے خوف آتا تھا۔ ایک آدمی نے پرانی لکڑی کا دروازہ توڑا اور آگ جلا کر چائے کا پانی رکھا۔ سب لوگوں نے تام چینی کے مگ نکالے اور چائے پینے لگے۔ رام لعل نے سوچا کہ کل وہ مگ بھی خریدے گا۔ تاہم برنس نے اپنے مگ میں رام لعل کو چائے دی۔

چھت پر کام شروع ہو گیا۔ ناکیں اکھاڑ کے نیچے پھینکی جانے لگیں۔ ۱۲ بجے کے بعد کھانے کا وقفہ ہوا اور سب لوگ نیچے آ گئے۔ چائے بنی اور رام لعل کے سوا سب مزدوروں نے کھانا کھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو جگہ جگہ سے چھل گئے تھے اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ برنس نے رام لعل سے کہا "لو تم بھی سینڈوچ کھا لو، میرے پاس کافی ہیں۔"

ٹم کیمرون سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے برنس سے کہا "تم کیا کر رہے ہو۔ کالے کو اپنا کھانا خود لانے دو۔ تم صرف اپنی فکر رکھو۔" برنس نے اپنی نظریں جھکا لیں کیونکہ کوئی بھی فورمین کے آگے نہیں بول سکتا تھا۔

پورے ہفتے کام چلتا رہا۔ عمارت کی چھت، دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں نیچے ملبے کے ڈھیر پر گرتی رہیں۔ رام لعل کے لیے یہ سخت محنت کا کام تھا، ہاتھ زخمی ہو گئے لیکن رقم کی خاطر وہ محنت کرتا رہا۔ اس دوران فورمین ٹم کیمرون جسے لوگ "بگ ٹم" بھی کہتے تھے، رام لعل کے پیچھے لگا رہا۔ مشکل سے مشکل کام اسے دیا جاتا اور وہ بے عزتی کرنے کا بھی کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔

ہفتے کے روز تک اندر کا کام پورا ہو چکا۔ اب باہر کی دیواریں باقی تھیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دیواروں میں نیچے ڈائنامائٹ لگایا جاتا تو ایک ساتھ پورا ملبہ نیچے آ گرتا۔ لیکن میکوئن کے لیے یہ طریقہ ناقابل عمل تھا۔ اس کے لیے لائسنس کی ضرورت تھی جو شمالی آئرلینڈ میں مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ محکمہ ٹیکس اور انشورنس والوں کو بھی ادائیگی کرنا پڑتی۔ لہٰذا یہ سارا کام مزدوروں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ خود کو خطرہ میں ڈالتے دیواریں ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔

کھانے کے وقت فورمین نے ادھر ادھر گھوم کر کام کا جائزہ لیا اور پھر کہا کہ اس طرف کی دیوار کا بڑا حصہ پہلے توڑنا ہے۔ پھر وہ رام لعل کی طرف مڑا اور کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم اوپر چڑھو اور جب دیوار گرنے لگے تو اسے باہر کی طرف دھکا دو۔" ٹم کیمرون جانتا تھا کہ رام لعل اونچائی سے ڈرتا ہے۔

رام لعل نے جواب دیا "اس پوری دیوار میں دراڑ پڑی ہوئی ہے۔ جو بھی اوپر گیا، وہ اس کے ساتھ ہی گرے گا۔"

ٹم کیمرون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، وہ چیخ کر بولا "تم مجھے میرا کام مت سمجھاؤ۔ کالے آدمی جیسا تم سے کہا، وہی کرو۔"

رام لعل اٹھا اور فورمین کے سامنے جا کر بولا "مسٹر کیمرون! ایک بات صاف ہونی چاہیے۔ میرا تعلق راجپوت قبائل سے ہے۔ گو اس وقت میرے پاس تعلیمی اخراجات کے لیے رقم کم ہے لیکن میرے آباو اجداد میں دو ہزار سال قبل راجہ، مہاراجہ، شہزادے اور فوج کے سپہ سالار گزرے ہیں۔ اس وقت تم لوگ بندروں کی طرح چاروں ہاتھ پیر پر چلتے اور کپڑوں کی جگہ کھال پہنتے تھے۔ براہِ مہربانی آپ میری بے عزتی کرنا بند کریں۔ ہر انسان کی اپنی عزت ہوتی ہے جس کی حفاظت اس کا فرض ہے۔"

رام لعل کی یہ مختصر تقریر سب لوگوں نے دم بخود سنی۔ بل کیمرون کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے چیخ کر گالی دی اور کہا "اچھا تو تم واقعی عزت دار ہو"۔ ساتھ ہی اس نے رام لعل کے منہ پر الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ بیچارا رام لعل زمین سے اڑ کر کئی فٹ دور جا گرا۔

برنس کی آواز آئی "لڑکے زمین سے اٹھنا مت، ورنہ بگ بل تمھیں جان سے ہی مار دے گا۔" رام لعل نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو دیوزاد بل کیمرون مٹھیاں بند کیے اس کے اٹھنے کا منتظر تھا۔ رام لعل کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی سے پڑا رہا۔ دکھ اور بے عزتی کی تکلیف سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

بند آنکھوں سے رام نے خود کو وطن میں پایا جہاں اس کے آباو اجداد گھوڑوں پر سوار، تلواروں اور نیزوں سے لیس آس پاس سے گزرتے اسے صرف ایک لفظ کہہ رہے تھے "انتقام، انتقام۔ تمھیں اپنی بے عزتی کا انتقام لینا ہوگا۔" رام لعل خاموشی سے اٹھا اور کام میں لگ گیا۔ سارا دن نہ وہ کسی سے بولا اور نہ کوئی بات کی۔

اس رات جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو باہر گرج چمک ہو رہی تھی اور طوفانی بارش کے آثار تھے۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا جس سے انتقام لے سکے۔ تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہونے لگی۔ اس کی نظر کھڑکی کے شیشے پر پڑی جہاں بارش کی بوندیں ایک قطار کی شکل میں بہنے لگی تھیں۔ شیشے پر پڑی مٹی کی وجہ سے پانی کی قطار سیدھی ہونے کے بجائے لہراتی ہوئی بہنے لگی۔ اچانک رام لعل کی نظر کونے پر پڑی ڈریسنگ گاؤن کی ڈوری پر گئی جو ہوا سے نیچے گر گئی تھی۔ گری ڈوری ایسی لگتی تھی کہ چیتلا سا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ رام لعل سمجھ گیا کہ اسے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔

اگلے روز رام لعل بذریعہ ریل بیلفاسٹ گیا اور اپنے سکھ دوست سے ملا۔ رنجیت سنگھ بھی اس کی طرح طالب علم تھا لیکن اس کے والدین دولت مند تھے اور اسے ماہانہ اچھی رقم اخراجات کے لیے بھیجتے۔ رام لعل نے اس سے کہا کہ مجھے گھر سے اطلاع ملی ہے، میرے والد بستر مرگ پر ہیں۔ میں سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے واپس ہندوستان جانا ہوگا۔ رنجیت سنگھ نے کہا کہ ہاں یہی روایت ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بڑا بیٹا اس کے پاس ہو۔ رام لعل نے کہا، میرا مسئلہ ہوائی سفر کے ٹکٹ کا ہے۔ میں کام بھی کر رہا ہوں لیکن میرے پاس کافی پیسے نہیں۔ کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے دو گے؟ میں لوٹ کر کام کر کے تمھاری رقم لوٹا دوں گا۔ سکھ نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں کل بینک سے رقم نکلوا کر تمھیں دے دوں گا۔

اس روز شام کو رام لعل اپنے ٹھیکیدار مسٹر میکولٹن سے ملا اور اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے۔ "میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا مذہبی طریقہ ہے کہ مرنے والے کی آخری رسوم اس کا بڑا بیٹا ادا کرے۔" رام لعل نے یہ بھی کہا "میں نے ہوائی کرایے کی رقم دوست سے اُدھار لی ہے۔ اگر میں کل کی پرواز سے روانہ ہو جاؤں تو اگلے ہفتے واپس آ سکتا ہوں۔"

ٹھیکیدار نرم دل آدمی تھا، اس نے کہا "ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔ اگر تم وعدے کے مطابق واپس پہنچ جاتے ہو تو انھی شرائط پر دوبارہ کام شروع کر دینا"۔

رام لعل نے شکریہ ادا کیا اور واپس آ گیا۔ اگلے روز اس نے اپنے سکھ دوست سے رقم ادھار لی اور بذریعہ ریل لندن پہنچ کر بھارت جانے کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ اس

www.paksociety.com

طرح ۲۴ گھنٹوں کے اندر وہ بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایک دکان پر پہنچا جہاں پالتو پرندے، سانپ اور دیگر جانور فروخت ہوتے تھے۔ اسے دراصل ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی تلاش تھی۔ دکاندار نے بتایا کہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ کل ہی میرے پاس ایک چھوٹا سانپ آیا ہے جو آرا کھپرا ناگ (Saw Scaled Viper) کہلاتا ہے۔ یہ سانپ مغربی افریقہ سے عرب، ایران، پاکستان اور بھارت کے خشک اور نم علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۰۔۱۵ سینٹی میٹر تک، رنگ گہرا بھورا اور جسم پتلا ہوتا ہے۔ زہریلے دانت شکار کی جلد پر سوئی جیسے دو سوراخ چھوڑتے ہیں۔ زہر اتنا تیز اثر ہوتا ہے کہ دو تین گھنٹوں میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ موت کا سبب دماغ میں خون کا اخراج ہوتا ہے۔

رام لعل نے دکان کے مالک سے پوچھا کہ اس سانپ کی کیا قیمت لوگے؟ کچھ دیر بحث کے بعد سودا ۳۵۰ روپے میں طے ہو گیا۔ رام لعل سانپ کو ایک ڈھکن والی بوتل میں بند کرکے گھر چلا آیا۔ لندن سفر کے لیے رام لعل نے ایک سگار بکس خریدا۔ اسے خالی کر کے اس میں پندرہ چھوٹے سوراخ کیے اور سانپ نرم پتوں کے ساتھ سگار بکس میں بند کر کے اسے اچھی طرح ٹیپ سے بند کر دیا۔ اس طرح لندن واپسی کا سفر شروع ہوا۔ شام تک رام لعل اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے سگار بکس نکال کر دیکھا۔ سانپ بالکل صحیح حالت میں سیاہ چمک دار آنکھوں سے رام لعل کو گھور رہا تھا۔

رام لعل نے شیشے کا ایک ڈھکن دار مرتبان خالی کیا تاکہ صبح استعمال کیا جائے۔ صبح جلدی اٹھ کر اس نے انتہائی احتیاط سے سانپ کو سگار بکس سے مرتبان میں منتقل کیا۔ مضبوطی سے ڈھکن لگایا اور اسے اپنے لنچ بکس میں حفاظت سے رکھ دیا۔ مقررہ وقت وہ اسٹیشن پہنچا جہاں سے ٹرک سب مزدوروں کو لے کام کی جگہ جاتا تھا۔

بل کیمرون کی یہ عادت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ اپنی جیکٹ اتار کر کسی شاخ پہ اُتار دیتا تھا۔ کھانے کے وقفے میں وہ جیکٹ کی جیب سے اپنا پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکال کر پائپ ضرور پیتا۔

رام لعل کا ارادہ تھا کہ وہ موقع پا کر سانپ کو بل کیمرون کی جیکٹ کی جیب میں چھوڑ دے گا۔ پھر وہ جیکٹ کی جیب سے پائپ اور تمباکو نکالے گا۔ اس دوران سانپ بل کیمرون کو ڈس لے گا۔ بل کیمرون گھبرا کر ہاتھ جیب سے نکالے گا، تو سانپ اس کے ہاتھ سے لٹکا ہوگا کیونکہ اس کے دانت گوشت میں گڑے ہوں گے۔

منصوبے کے مطابق رام لعل کسی بہانے ۱۱ بجے کے قریب اٹھا۔ اپنا لنچ بکس کھول کر سانپ کا مرتبان نکالا، ڈھکن کھول کر بل کیمرون کی جیکٹ کی داہنی جیب میں الٹا اور فوراً واپس آ کر کام میں لگ گیا۔ کھانے کے دوران سب لوگ دائرے میں بیٹھ کر سینڈوچ کھانے لگے۔ رام لعل کا دل کھانے میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بدوقت سب کے ساتھ بیٹھا۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر فورمین کی جیکٹ کی طرف دیکھتا۔ آخرکار بل کیمرون نے کھانا ختم کیا، اٹھ کر اپنی جیکٹ کی طرف گیا اور داہنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے پائپ اور تمباکو کی تھیلی نکالی، پائپ بھر کر جلایا اور پینا شروع کر دیا۔

رام لعل مایوسی اور ناامیدی کا شکار تھا کہ اس کی چال

انتخاب

افریقہ کے ایک شہر میں بار کونسل کے ارکان کا انتخاب ہو رہا تھا۔ مختلف جماعتوں کے امیدوار انتخابات لڑ رہے تھے۔ انہی میں ایک گورا وکیل بھی تھا۔ اس نے شہر کے باشندوں کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے ایک اشتہار چھپوایا جس میں اس نے اپنے حق میں دلیلیں دیتے ہوئے یہ بھی لکھوایا ”ہر چند کہ میری جلد کا رنگ سفید ہے لیکن میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل بالکل آپ لوگوں کی طرح کالا ہے۔“

(منصور اشرف، کراچی)

www.paksociety.com

نے اپنا کام نہیں دکھایا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بے یقینی سے جیکٹ کی طرف دیکھا۔ اسے چند سیکنڈ کے لیے جیکٹ کے ایک کنارے پر کوئی چیز چلتی نظر آئی۔ جیکٹ کی جیب میں پائے جانے والے چھوٹے سے سوراخ سے سانپ نکل کر اندرونی سلائی میں چھپ گیا تھا۔

شام کو واپسی کے وقت فورمین نے اپنی جیکٹ اتار کر اپنے برابر رکھ لی اور مقررہ مقام پر سب لوگ اتر کر اپنے گھر جانے لگے۔ رام لعل نے برنس سے پوچھا کہ کیا بل کیمرون کے بیوی بچے ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

رام لعل اپنے کمرے پہنچا اور دل سے دعا کرنے لگا کہ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ بل کیمرون سے لینا چاہتا تھا لیکن اس کے بیوی بچوں کو نقصان پہنچانا میرا مقصد ہرگز نہیں۔ اتوار کا دن بھی انھی سوچوں میں گزر گیا۔

پیر کی صبح بل کیمرون اور اس کے بیوی بچے صبح ۶ بجے کے قریب اٹھے اور ناشتا کرنے باورچی خانے میں جمع ہو گئے۔ بل کیمرون کام پہ جانے کے لیے تیار ہوا۔ اس نے بیٹی سے کہا کہ ذرا میری جیکٹ تو لانا۔ وہ الماری سے نکال کر لائی۔ بل نے کہا: "اسے دروازے کے پیچھے ٹانگ دو۔ میں ابھی لیتا ہوں۔" جب بچی نے جیکٹ ٹانگی تو وہ پھسل کر باورچی خانے کے فرش پر گر پڑی۔ بل نے غصے سے کہا: "تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ جیکٹ اٹھا کر اچھی طرح ٹانگو۔"

"بابا، یہ آپ کی جیکٹ سے کیا چیز گری۔" بگ بل کی بیوی، بیٹے اور سب نے اس طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جاندار فرش پر پڑا چمکیلی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ باریک دو شاخہ زبان لہراتی نظر آ رہی تھی۔ بل کی بیوی بولی: "خدا ہمیں محفوظ رکھے، یہ تو کوئی سانپ ہے۔"

بل کیمرون غصے سے بولا: "پاگل نہ ہو، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آئرلینڈ میں قدرتی طور پر کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔" پھر اس نے بیٹے سے پوچھا: "بوبی، تم تو اسکول میں سائنس پڑھتے ہو، تمھارے خیال میں یہ کیا چیز ہے۔"

لڑکے نے سانپ کی طرف غور سے دیکھا اور کہا: "یہ یقیناً کیچوا ہے جو موٹا جنگل کی گھاس میں پایا جاتا ہے۔"

بگ بل نے اپنے بیٹے سے کہا: "یہ جو کچھ بھی ہے، اسے مار کر باہر پھینک دو۔"

بوبی اٹھا اور اپنا جوتا نکال کر اس جانور کو مارنے چلا۔ بل کیمرون کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا: "ذرا رک جاؤ اور مجھے ایک ڈھکن والا مرتبان دو۔" مرتبان آیا تو بل اٹھا اور بہت احتیاط اور پھرتی سے سانپ کو مرتبان میں منتقل کر دیا۔ سانپ بھی آئرلینڈ کے سرد موسم سے کچھ سست ہو گیا تھا۔ بل کے بیٹے نے پوچھا: "ابو آپ اس کا کیا کریں گے؟"

بل نے کہا: "ہمارے گروہ میں ایک کالا بھارت سے آیا ہے، وہاں بہت سانپ ہوتے ہیں۔ میں ذرا اس کے ساتھ مذاق کروں گا۔ وہ تو شاید خوف کے مارے مر ہی جائے گا۔"

اس نے جیکٹ پہنی، کھانا لیا اور بیگ میں پھر سانپ والے مرتبان کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر وہ اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہاں سب لوگ مع رام لعل موجود تھے۔ ٹرک میں سوار ہو کر یہ پارٹی کام والی جگہ پر روانہ ہو گئی۔ وہاں کام شروع ہونے سے پہلے چائے کے دوران بل کیمرون نے چپکے چپکے دیگر لوگوں کو بھی بتا دیا کہ وہ اس کالے کے ساتھ کیا مذاق کرنے والا ہے۔

اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ یہ ایک بے ضرر کیڑا ہے، رام لعل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لہٰذا ایسے مذاق میں کوئی حرج نہیں۔ کھانے کے وقفے میں سب لوگ حسبِ معمول دائرے کی شکل میں بیٹھے۔ رام لعل نے کچھ خیال نہ کیا لیکن باقی لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہو گا۔ اس نے اپنا لنچ باکس گھٹنوں پر رکھا اور اسے کھولا۔ سینڈوچ اور سیب کے بیچ چھوٹا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ رام لعل کی زبردست چیخ سے علاقہ گونج اٹھا اور ساتھ ہی سب مزدور بے ساختہ زوردار قہقہے لگانے لگے۔ رام لعل نے گھبرا کر اپنا لنچ باکس زور سے ہوا میں اچھال دیا۔

www.Paksociety.com

سانپ اور سینڈوچ تمام چیزیں چاروں طرف گھاس میں گر پڑیں۔ رام لعل چیختے ہوئے کھڑا ہوگیا اور بولا "یہ سانپ بہت زہریلا اور خطرناک ہے۔" سب لوگ پھر سے ہنسنے لگے۔ رام لعل نے ان سے کہا "یقین کرو، یہ انتہائی زہریلا سانپ ہے۔"

بل کیمرون کی آنکھوں میں ہنستے ہنستے آنسو آگئے۔ وہ رام لعل سے کہنے لگا "کالے آدمی، تم تو بہت ہی بے وقوف ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پایا جاتا۔"

بل ہنستے ہنستے کچھ تھک گیا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر گھاس پر لیٹ گیا کہ چند منٹ آرام کرلے۔ تب اسے معمولی چبھن کا بھی احساس نہیں ہوا۔ اس کی داہنی کلائی پر سوئی کی نوک کے برابر دو انتہائی باریک سوراخ ہوچکے تھے۔ کھانا ختم ہوچکا تھا۔ سب لوگ کام کے لیے اٹھ گئے۔ عمارت توڑنے کا کام تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ سارا ملبہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا۔ دو گھنٹے بعد بل کیمرون نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، اسے کچھ پسینہ آرہا تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ہتھوڑا ہاتھ سے رکھا اور اپنے ساتھی سے کہا "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں ذرا دیر سایے میں آرام کرلیتا ہوں۔" پھر وہ درخت کے نیچے بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سر میں شدید درد ہورہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے پورے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ کر گرا۔ سب سے پہلے برنس نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پیٹرسن کو آواز دی اور کہا: "بل بہت بیمار لگ رہا ہے۔ میری بات کا اس نے جواب بھی نہیں دیا۔"

سب مزدوروں نے کام چھوڑ دیا اور اس درخت کے پاس آگئے جہاں بل کیمرون زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پیٹرسن نے رام لعل کو آواز دی کہ ادھر آؤ اور اسے دیکھو۔ تم طب کے طالب علم ہو، تمھارا کیا خیال ہے؟

رام لعل کو کسی معاینے کی ضرورت تو نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے جھک کر نبض دیکھی اور پیٹرسن سے کہا کہ یہ تو مر چکا۔ پیٹرسن نے کہا "سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں ایمبولینس بلاتا اور ٹھیکیدار میکوئن کو بھی مطلع کرتا ہوں۔" وہ پھر پیدل سڑک کی طرف روانہ ہوا تاکہ بوتھ سے فون کرسکے۔ ایمبولینس کے پہنچنے پر بل کیمرون کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے معاینہ کیا اور بتایا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس شخص کی موت واقع ہوچکی۔ میکوئن بھی پریشانی کے عالم میں ہسپتال پہنچ گیا۔

پولیس اور عدالتی کارروائی میں چند روز لگے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق بل کیمرون کی موت قدرتی طور پر ہوئی۔ وجہ دماغ میں شدید اخراج خون تھا۔ عیسائی مذہب کے طریقے کے مطابق تدفین ہوئی جس میں اس کے خاندان، میکوئن اور دیگر ساتھی بھی شریک ہوئے۔

رام لعل نے تدفین میں شرکت نہیں کی بلکہ وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ گھاس میں کھڑے ہوکر دل ہی دل میں کچھ کہنے لگا "اے زہریلے سانپ! کیا تم میری بات سن سکتے ہو۔ تم نے وہ کام کردکھایا جس کے لیے تمھیں راجستھان کی پہاڑیوں سے یہاں لایا گیا تھا۔ میرا انتقام پورا ہوگیا۔ میرے منصوبے کے مطابق تمھیں کام کرنے کے بعد مر جانا تھا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ ابھی نہیں تو کچھ عرصے بعد تم مر جاؤ گے۔ بغیر مادہ کے تمھاری نسل آگے نہیں چل سکتی کیونکہ آئرلینڈ میں کوئی سانپ نہیں پائے جاتے۔"

☆☆

آرا کھیرا سانپ رام لعل سے چند قدم کی دوری پر گھاس میں دبکا بیٹھا تھا۔ رام لعل کی باتیں تو اس تک نہیں پہنچیں لیکن وہ اپنا فطری کام کرنے میں مصروف تھا۔ یہ دراصل سانپن تھی جس کی دم اٹھی ہوئی تھی، جسم ہلکے ہلکے ہل رہا تھا۔ جلد ہی اس کے جسم سے ایک کے بعد ایک انچ لمبائی والے ایک درجن بچے دنیا میں آگئے...... آئرلینڈ میں سانپ آچکے تھے......

www.paksociety.com

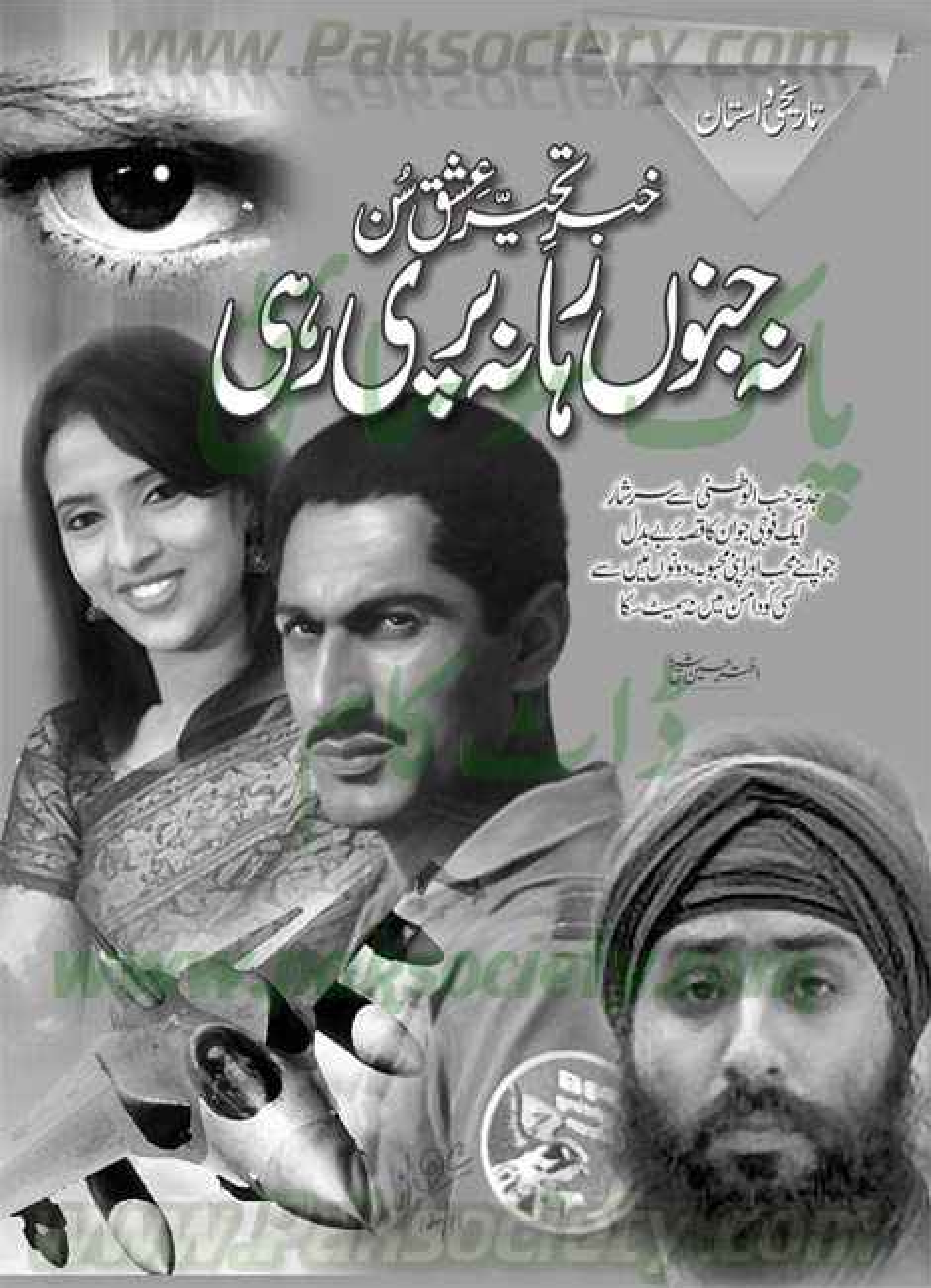
www.Paksociety.com
تاریخی داستان
خبرِ تحیرِ عشق سُن
نہ جنوں رہا نہ پری رہی
جذبہ حب الوطنی سے سرشار
ایک فوجی جوان کا قصہ بے بدل
جو اپنے محب اور اپنی محبوبہ دونوں میں سے
کسی کو دامن میں نہ سمیٹ سکا

میں جنوری ۱۹۷۱ء کے آخری ہفتے ڈھاکا گیا تو خیال تھا کہ پندرہ بیس دن بعد واپس آجاؤں گا۔ مگر چند یوم بعد بھارت نے فوکر فرینڈشپ جہاز کا ڈراما رچا کر فضائی راستہ بند کر دیا لہٰذا مجھے وہاں رکنا پڑا۔ بوریت کے عالم میں پھر سوچا کہ جادوئی سرزمین بنگال کی سیاحت کی جائے۔ مجھے اس سے سنہرا موقع پھر شاید بھی نہیں ملتا۔ چنانچہ چٹاگانگ جانے کے لیے اسٹیشن پہنچا اور انتظار گاہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت میں اکیلا ہی تھا۔

تھوڑی دیر بعد نورانی چہرے والا ایک بزرگ داخلی دروازے پر آیا، ساتھ ہی اس نے مجھے دیکھ کر بلند آواز سے السلام علیکم کہا۔ میں نے فوراً اٹھ کر دروازہ کھولا اور وعلیکم السلام کہہ کر ایک طرف احترام سے کھڑا ہو گیا۔ بزرگ آدمی کی رنگت عام بنگالیوں کے برعکس سرخ و سپید تھی۔ داڑھی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ تین خواتین تھیں۔ ایک اس کی ہم عمر اور دو نوجوان لڑکیاں۔ میں نے ایک نظر میں سب کا مکمل جائزہ لے لیا۔ ایک لڑکی تو حسین و جمیل تھی جبکہ دوسری عام سے نقوش کی مالک تھی۔ بس چہرے پر بڑی جاندار قسم کی آنکھیں تھیں۔

بوڑھے نے مسکرا کر سب کی جانب سے ''دھنو واد'' (شکریہ) کہا اور سارا خاندان آرام سے بیٹھ گیا۔ خاتون کی شکل و صورت بھی بس واجبی سی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ایک لڑکی ماں پر گئی تھی اور دوسری نے باپ کا حلیہ پایا۔ جب ہم بیٹھ گئے تو تعارف کا سلسلہ شروع ہوا جس کا آغاز نورانی چہرے والے بزرگ نے کیا۔ میں نے مختصر طور پر اپنا تعارف کرایا اور نام صرف ''ایچ'' بتانا ہی مناسب سمجھا کہ ہم بے تکلف نہیں تھے۔ بزرگ نے اپنے خاندان کا تعارف کراتے ہوئے بے تکلفی سے کام لیا۔

''بیٹا! میرا نام دیوان کرم علی ہے۔ یہ میری بیوی رقیہ خاتون اور یہ میری بیٹیاں فخرن اور زیبن ہیں۔ تم کھل کر ہم سے بات کر سکتے ہو کہ ہم سب سچے پاکستانی ہیں۔'' اس نے اپنے خاندان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ زیبن عام سے نقوش والی لڑکی تھی۔ عربی خوبصورت ناموں کا یہ بگاڑ مجھے پسند نہ آیا تو میں نے فوراً کہا ''جناب عالی! آپ گویا کرم علی ہیں اور آپ کی یہ بیٹیاں فخر النسا اور زیب النسا ہیں۔''

''جی! بالکل ایسا ہی ہے۔''

میری بنگالی چونکہ اچھی نہیں تھی لہٰذا گفتگو انگریزی میں شروع کر دی۔ دیوان صاحب بھی اس زبان غیر سے واقف تھے۔ زیبن ڈھاکا یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ اس طرح رقیہ خاتون کے علاوہ سب لوگ باتیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ پاک فضائیہ کی تو زبان ہی انگریزی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ بنگال میں اس دور خرابی میں بھی سچے پاکستانی موجود ہیں۔

''کیا آپ دیوان خاندان کی تاریخ سے واقف ہیں؟'' میرے اس غیر متوقع سوال پر انھوں نے ذرا چونک کر مجھے دیکھا۔ اسے غیر ضروری جسارت بھی کہا جا سکتا تھا مگر بزرگ نے مسکرا کر کہا:

''کیا آپ اس تاریخ سے واقف ہیں؟''

''جی جناب! میں آپ کے خاندان کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

''پہلے بتائیں کہ آپ کس شہر کے رہنے والے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا تعلق چاندپور سے ہے۔''

''بہت خوب، ہونا بھی چاہیے تھا۔'' میں نے مزید کہا۔

''کیا آپ نے چاندپور دیکھا ہے؟''

''دیکھا تو نہیں مگر دیکھنے کی تمنا ضرور ہے۔ کیا ایشاتی ندی اب بھی پہلے کی طرح زور و شور سے بہتی ہے؟''

''کیا آپ اس ندی کو جانتے ہیں؟'' سوال ہوا۔

میں نے کہا ''محترم! قصہ یہ ہے کہ جب میں بنگال کی سرزمین کے پریم میں گرفتار ہوا تو اس کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر مجھے اس کے متعلق تحقیق کرنا پڑی۔ آغاز چاندپور سے ہوا۔ لہٰذا میں بہت کچھ جان گیا۔ اس طرح آپ کے خاندان کے متعلق بھی مجھے جاننا پڑا۔ اگرچہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے مگر سچ یہی ہے کہ محبت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔''

اس بیان کے بعد ان کی دلچسپی دیدنی تھی اور وہ سارے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ دیوان صاحب کے چہرے پر البتہ حیرت بھی چھا گئی کہ ایک مغربی پاکستانی اتنا بڑا دعویٰ کر رہا تھا۔ اب میں سوالیہ نگاہوں کا مرکز تھا، لہٰذا میں نے جواباً کہا" آپ کے روحانی مرشد حیدر علی نے تری پورہ کے دامن میں ایک ایسی بستی بسائی جو حیدر پور کہلائی۔ ۱۷ ویں صدی میں یہاں چکرورتی خاندان بڑا طاقتور تھا۔ یہ بستی حیدر علی صاحب کی وجہ سے پھلنے پھولنے لگی۔ پہلے قصبہ بنی، پھر شہر آباد ہوا پھر اس کی حدود سندر بن تک پھیل گئیں۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف گھنا جنگل۔ یہاں کے باسیوں نے دونوں مقامات کی خصوصیات اپنے اندر جذب کر لیں۔ حیدر پور کا چوتھا چکرورتی حکمران چندر دیج تھا۔ جب وہ راج گدی پر بیٹھا تو اس نے اپنے نام کی مناسبت سے اس ریاست کے مشرقی حصے کا نام چاند پور رکھ دیا۔

اسی چاند پور میں آپ کا جد اعلیٰ سید عمر دراز علی رہتا تھا جس کے بیٹے حسن علی کے ہاں رقیہ عابدہ خاتون کے بطن سے وہ لڑکا پیدا ہوا جس نے اس علاقے کے گھپ اندھیرے میں اسلام کی نوری شمع روشن کی۔ اس کا نام نثار علی ہے۔ شاید آپ اس نام سے واقف ہوں۔ بہرحال حیدر پور کے چاند پور بن جانے والی بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی۔" یہ کہہ کر میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا تاکہ ان کا ردعمل دیکھ لوں۔ زیب خاتون کی دلچسپی واقعی دیکھنے والی تھی۔ وہ اس کا اظہار اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے کر رہی تھی۔ اس طرح میں نے لاشعوری طور پر اسے ہی مخاطب کیا" بچپن میں نثار علی کڑوی سے کڑوی دوا بڑی رغبت سے پی لیتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ زہریلی چیزوں تک کو بھی آرام سے پکڑ لیتا۔ لہٰذا اس کی والدہ رقیہ خاتون اسے تیتا میاں کہنے لگی۔ جب نثار علی مشہور ہو گیا تو لوگ تیتا میاں کو تیتو میاں کہنے لگے۔ اس کی ایک وجہ تھی کہ ہندی میں تیتا زہریلی بھڑ کو کہتے ہیں اور نثار علی تو بہت بڑی روحانی ہستی بھی تھا۔"

"ادھر جب اس خاندان کے روحانی پیشوا ہندو ریاست کے میر انصاف یا چیف جسٹس مقرر ہوئے تو ان کے عقیدت مند اپنے ناموں کے ساتھ میر لکھنے لگے۔ گویا اب نثار علی "تیتو میر" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ہندو ریاست کے چیف جسٹس (میر انصاف) کو ریاست نے مالیات کا محکمہ بھی تفویض کر دیا۔ اس طرح وہ بیک وقت میر اور دیوان کہلانے لگے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے میر جعفر کے گھناؤنے کردار کی وجہ سے لفظ میر پر دیوان کو ترجیح دی۔ اگرچہ تیتو میر نے اس داغ رسوائی کو اپنے لہو سے دھونے کی کوشش کی مگر عوام کے مزاج کی تشکیل ازخود ہوتی ہے، اس میں دھونس دھاندلی نہیں چلتی۔ اسے انگریزی زبان میں "کلاسک" (Classic) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ حسن جو وقت کے امتحانوں سے گزر کر اپنی خوبصورتی برقرار رکھے۔"

یہ سن کر زیب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، گویا اسے یہ بات بہت پسند آئی تھی۔ "آپ کون ہیں؟" اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہم نے ایسے جہازوں سے لڑی جو اپنی عمر پوری کر چکے تھے۔ اس طرح ۱۹۶۹ء میں پاک فضائیہ کی حالت اتنی اچھی نہ رہی مگر مشکل کی اس گھڑی میں چین نے روسی ساختہ مگ ۱۹ کے مقامی ماڈل ہمیں سستے داموں فروخت کر کے اقوام عالم کو حیران کر دیا۔ اسی سال جرمن فضائیہ بھی اپنے سیبر طیارے فارغ کر رہی تھی کہ وہ بھی اپنی عمر پوری کر چکے تھے۔ اس طرح ہم نے ۹۰ عدد جہاز جو فارغ ہو رہے تھے سستے داموں خرید لیے۔ ان جہازوں کا ماڈل ذرا دوسرا تھا۔ یعنی ای "E"۔ ہمارے پہلے جہازوں کا تکنیکی نام (F86F) تھا۔ اب ہمارے پاس "F86-E" آئے تو ہمیں اپنی ورکشاپوں کو ان کے مطابق بنانا پڑا۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

"جی ہاں! میں کوئی بھی ہوں۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

پھر میں نے بڑی سنجیدگی سے دیوان صاحب کو مخاطب کیا "دیوان صاحب! آپ کی بیٹی زیب النسا نے کیا اپنے اندر کوئی بجلی کا بٹن لگا رکھا ہے جسے آن کر کے یہ یک دم روشن ہو جاتی ہے اور پھر اسے آف کر کے بجھ جاتی ہے۔ اس نے یہ کون سا روگ پال رکھا ہے؟"

"بیٹا! روگ تو ہے۔ اصل میں زیب حد سے زیادہ حساس ہے۔ چند برس پیشتر اس کی شادی ہونے والی تھی مگر اس کے دولہا نے شادی سے چند روز پہلے ہمارے گھر میں آ کر نہ صرف شادی سے انکار کر دیا بلکہ اس کی زبردست توہین بھی کر ڈالی۔ دولہا کے رویے نے اسے گویا برباد کر ڈالا۔ اس سے پہلے یہ ایسی نہ تھی۔"

اس نے زمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"مقام سوز پر سورج کرے خیرات کرنوں کی۔"

"تو مطلب ہوا کہ آپ اگر پاکستان سے محبت کرتی ہیں تو آپ کو کچھ نہ کچھ نفرت تو ملے گی۔ لہٰذا اگریا رانی! اپنے اندر کی شمع روشن رکھیں پروانے خود لپکے گا۔ یہ بھول جائیں کہ کسی نے آپ کے متعلق کیا کہا تھا۔"

زیب نے مجھے بڑی میٹھی مسکراہٹ سے دیکھا۔ میں نے لپک کر کیمرا اٹھایا اور اس کی مسکراہٹ کو مقید کر لیا۔

اتنے میں کسی نے دروازہ کھولا اور بڑے اکھڑ سے لہجے میں کہا "دیوان صاحب! میں سلام بولتا ہوں۔" اندر جھانکنے والا قد آور اور بہت موٹا آدمی تھا۔ پھر اس نے مجھے دیکھا تو اشارے سے میرے متعلق پوچھا۔

دیوان صاحب نے مسکرا کر کہا "کیا بھوتیاں! یہ لاہور سے ڈھاکا والوں کے بلاوے پر آئے ہیں۔ اچھے اور باخبر انسان ہیں۔ انھوں نے ہمارے متعلق بڑی اچھی باتیں کیں۔"

"چھوڑیں دیوان صاحب! آپ تو بس ایسے ہی فضول آدمیوں کے جھانسے میں آ جاتے ہیں۔" اس نے دیوان صاحب کا فقرہ اچک کر کہا اور مزید اضافہ کیا: "میں سب لاہوریوں کو جانتا ہوں۔ سب لچے لفنگے لٹیرے ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "میں ذرا ذلیل شاب (جلیل صاحب) کو لے آؤں۔ آپ سامان سمیٹ لیں تو گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ طوفان غائب ہو گیا۔

دیوان صاحب نجات بھری مسکراہٹ سے مجھے دیکھنے لگے اور پھر باہر نکل گئے۔ فخر النسا سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ البتہ زیبی فوراً اٹھ کر دوسرے کونے میں چلی گئی اور اپنی ڈائری میں کچھ لکھنے لگی۔

لکھنے کے بعد اس نے ڈائری کے اوراق پھاڑ کر بڑی نفاست سے تہ کیے اور میرے قریب آ کر کہنے لگی: "آپ یہ تحریر پڑھ لیں۔ اگر کوئی بات رہ گئی ہو تو بتلا دیں۔"

میں دوسرے کونے میں جا کر وہ تحریر پڑھنے لگا تو حیران رہ گیا۔ اس نے آغاز ہی میں دھماکا کرتے ہوئے لکھا تھا:

"جان من!

www.paksociety.com

ان جہازوں کا ایک سکواڈرن ڈھاکا تعینات ہوا۔ اس طرح ہمیں ہنگامی حالات میں حکم ہوا کہ وہاں جا کر مناسب اقدام کریں۔ خیال یہی تھا کہ ایک دو ہفتے میں کام ختم کر کے ہم واپس آ جائیں گے مگر حالات کی وجہ سے ہمیں وہاں رکنا پڑا۔ پھر فروری ۱۹۷۱ء میں راستے بند ہو گئے۔ اس طرح میں وہاں رکنے پر مجبور ہو گیا۔ میں چونکہ بنگال کی سرزمین کا گرویدہ تھا لہٰذا یہ حکم دلی رغبت سے بجا لایا۔ جب مجھے وہاں رکنا پڑا تو اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے سوچا کہ اس وقت سے استفادہ کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ سرزمین کو دیکھ لوں اور اس کے حسن کو دل و دماغ پر نقش کر لوں۔ اس طرح میں نے چٹا گانگ تک جانے کا فیصلہ کر لیا۔

www.Paksociety.com

یہ شخص جو ابھی آیا تھا بڑا خطرناک اور ظالم ہے۔ اس کی سگائی قمر النساء سے ہو چکی ہے مگر یہ پاکستان کا شدید دشمن اور بھارت کا ایجنٹ ہے۔ اس کے سامنے کوئی بات نہ کریں۔ ہم اس شادی پر مجبور ہیں۔ یہ ظالم آدمی تاج الدین (عوامی لیگ کے مشہور لیڈر) کا چہیتا ہے۔ لہٰذا جو چاہے کر سکتا ہے۔ آپ نے انجانے میں میرے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر کے سخت غلطی کی ہے مگر اس غلطی کے لیے میں آپ کی مشکور ہوں۔ آپ مجھے ایک شریف آدمی لگتے ہیں اور میں آپ کو پسند کرنے لگی ہوں۔ میں نے اپنے خواب دریچے میں بند کر دیے تھے مگر انھیں پھر کھولنے کا سوچ رہی ہوں۔ اگر آپ مجھے ذرا بھی پسند کرنے لگے ہیں تو ابھی بتا دیں تاکہ اپنے دریچے دوبارہ کھول سکوں۔ وقت نہیں ہے لہٰذا تاخیر نہ کریں۔

نوٹ: خط پڑھنے کے بعد فوراً ضائع کر دیں ورنہ خرابی ہوگی۔ فوراً قریبی غسل خانے میں جائیں اور وہی کریں جو میں نے کہا ہے۔

میں ہوں آپ کی داسی، زیب النساء"

میں فوراً اٹھ کر غسل خانے گیا اور خط کے پرزے کر کے کموڈ میں بہا آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھوتیاں صاحب، زکیل صاحب کوئی خطرناک شے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بھوتیاں صاحب واپس آئے تو ان کے ساتھ دوسری باجی تھی۔ تب تک دیوان صاحب بھی آچکے تھے۔ وہ سامان لے کر کمرے سے باہر جانے لگے۔

میں نے ازراہِ مروت پوچھا "اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی مدد کروں؟"

مگر بھوتیاں نے میری پیش کش بدتمیزی سے رد کرتے ہوئے کہا "آپ ہمارا پیچھا چھوڑیں، ہم اپنا کام خود کر سکتے ہیں۔ بلکہ آپ فوراً لاہور چلے جائیں ورنہ یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔"

دیوان صاحب جلدی سے انھیں لے نکل گئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں شرمسار ہو رہے ہوں گے۔ زیب غالباً عمداً سب سے پیچھے رہی۔ موقع پاتے ہی سرگوشیانہ لہجے میں بولی "بند دریچوں سے کھلے دریچے بہتر ہوتے ہیں جانے کب خوشگوار ہوا کا جھونکا اندر آجائے۔"

اس نے پھر مسکرا کر مجھے دیکھا اور سب لوگ باہر نکل گئے۔

اب میرے لیے یہی مناسب تھا کہ ان لوگوں سے گریز کروں۔ میرا ارادہ لڑائی جھگڑے کا نہیں تھا۔ ویسے بھی میں اس پوزیشن میں کہاں تھا کہ ان واہیات لوگوں سے لڑتا رہوں لہٰذا ایرکلاس کے دو ڈبے چھوڑ کر تیسرے میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے دو ڈبے چونکہ قریب تھے لہٰذا میرا خیال تھا کہ وہ لوگ ان ہی میں بیٹھے ہوں گے۔ مگر جونہی میں نے تیسری بوگی کے اندر قدم رکھا تو مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔ ایک طرف دیوان صاحب کا خاندان تھا جس کے ساتھ بھوتیاں اور زکیل شاب (جلیل صاحب) بھی براجمان تھے۔ مگر دوسری سمت چار بھارتی فوجی جوان بھی موجود تھے۔

یہ غالباً مکتی باہنی کے ہراول دستے کے افراد تھے جنھیں بنگالی خود بلا رہے تھے۔ تاہم یہ حضرات کھل کر پاک فوج

واضح رہے کہ چٹاگانگ مشرقی سرحد پر خلیج بنگال کی مشہور بندرگاہ ہے اس کے بعد کاسلطین بازار اور پھر سندر بن کے بعد خلیج بنگال دریائے گنگا کا دہانہ بھی یہی ہے۔ لہٰذا میں نے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔

فوجی ہونے کے ناتے ملکی سیاست میں ملوث ہونا تو میرے لیے ممنوع تھا تاہم ملکی حالات سے باخبر رہنے پر قدغن نہ تھی۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان میں کیا ہوا تھا اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں تاکہ آپ زیرِ نظر کہانی کو سمجھ سکیں۔ میرا بس چلے تو ۱۹۷۱ء کا سارا سال اپنی زندگی سے خارج کر دوں کہ اسی سال پاکستان کے ساتھ ساتھ میرے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔

www.paksociety.com

کے سامنے نہیں آئے تھے۔ ان میں ایک تو سکھ تھا جو واقعی مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ اپنی شاندار پگڑی میں وہ بالکل گروارجن لگ رہا تھا۔ بس ذرا داڑھی کا فرق تھا۔ میں دیر تک اسے غور سے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ یا خدا، یہ تقدیر آج میرے ساتھ کیسا کھیل رچا رہی ہے۔ یہ میرا منہ بولا بھائی مہندر سنگھ تو نہیں ہو سکتا۔ مگر کون جانے؟ حیران کن بات یہ تھی وہ بھی مجھے بڑے انہماک سے دیکھنے میں مصروف تھا۔ یہ چند پل کا کھیل تھا پھر ہم دونوں گویا سنبھل گئے۔ اس نے خاص سکھ لہجے میں بلند آواز سے کہا ''بادشاہو! اندر آجاؤ، اپنا ہی گھر ہے کوئی پردہ نہیں۔''

''اچھا جی جو مولا کی مرضی۔'' یہ کہہ کر میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔

سردار نے فوجی برانڈی پہن رکھی تھی جس پر کپتان کا رینک سج رہا تھا۔ پھر اس نے رسماً اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ ''یہ حوالدار چندو لال ہے۔ میری پلاٹون کے اچھے جوانوں میں سے ہے مگر ہے ذرا منہ پھٹ۔ غصے میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کے ساتھ امی چند اور بدری پرشاد ہیں۔''

''کپتان صاحب! یہ سارے چاند ہی چاند ہیں تارا کوئی بھی نہیں۔''

میری بات سنتے ہی اس نے اپنی کلائی میرے سامنے رکھ دی جسے دیکھ کر میں مزید حیران ہو گیا۔ کلائی پر مہندر سنگھ تارا صاف الفاظ میں کھدا ہوا تھا۔ ''یہ تو وہی مہندر سنگھ ہے، میری بھابھو (ماتا جی) کا بیٹا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے اگرچہ زیرلب کہا مگر شاید اس نے سن لیا۔

''کیوں جی اب کیا ہوا؟'' اس نے میری حیرت کو دیکھ کر پوچھا۔

''بس سردار جی! ایسے ہی ایک خیال آ گیا مگر یہ بتائیں کہ یہ تارا آپ کی گوت ہے؟'' میں نے اس لفظ پر انگلی رکھ کر پوچھا۔ ''لگتا ہے میں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔''

''او وہ سمجھ گیا جی'' اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''اصل میں میری شکل گروارجن دیو جی سے ملتی ہے اور لوگ اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ میری سورگ باشی بھابھو کہا کرتی تھیں کہ مہندر! تو بڑا ہو کر بالکل گروارجن جی جیسا لگے گا۔''

''سردار جی! میری بھابھو بھی مجھے یہی کہا کرتی تھی۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ مگر میں نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ ''اصل میں ہر ماں کو اپنا بیٹا گرو جی جیسا خوبصورت لگتا ہے۔''

''آپ کی بھابھو؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، ''آپ تو مسلمان ہیں۔''

''تو کیا مسلمان بغیر ماں کے پیدا ہوتے ہیں؟''

یہ سن کر وہ خجل سا ہو گیا۔

اتنے میں دو مریل سے بنگالی لڑکے اندر آئے۔ ایک کے پاس صفائی کا سامان تھا۔ دوسرے نے بیگ اٹھا رکھا تھا جس میں لوہے کے اوزار تھے۔ انھیں دیکھ کر چندو لال نے تحکمانہ لہجے میں کہا ''اوئے بانگڑو! ادھر آؤ۔''

وہ دونوں جی شاب کہہ کر اس کے قریب آ گئے۔

www.paksociety.com

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل یحییٰ خان نے حکومت ایوب خان سے چھین کر اسے چلتا کیا۔ اسی سال ۴ اگست کو موصوف نے اپنی نئی کابینہ کا تقرر فرمایا جس میں (۱) نواب مظفر علی قزلباش (۲) سردار عبدالرشید (۳) نواب زادہ شیر علی (۴) ڈاکٹر اے۔ ایم مالک (۵) اے۔ کے۔ ایم حفیظ الدین (۶) محمد شمس الحق اور (۷) احسان الحق صاحب کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا۔ امن و امان بحال ہو جانے کے بعد فوج کی بیرکوں میں واپسی کا وعدہ ہوا اور ساتھ ہی سپریم کورٹ کے جسٹس عبدالستار کو چیف الیکشن کمشنر مقرر کر کے انتخابات کا اعلان بھی کر دیا۔

www.Paksociety.com

(بنگالی حضرات صاحب کو شاب کہا کرتے تھے)۔ چندو نے صفائی والے کو جگہ صاف کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے غریب کا تھیلا رکھوا لیا اور کہا، جاؤ شکل گم کرو۔ میں نے مداخلت کی کوشش کی تو مہندر نے مجھے منع کر دیا" اس منہ پھٹ کے منہ نہ لگیں، یہ بڑا ذلیل ہے۔" یہ باتیں اس نے سرگوشی میں کہیں۔

اُدھر چندو تھیلے میں سے ہتھوڑی نکال کر اس سے کھیلنے لگا۔ ہتھوڑی کا سرا وہ اپنی ہتھیلی پر آہستہ سے مار کر مسکراتا جا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے اشتعال دلانے لگی۔

میں نے آغاز ہی میں بُرائی مٹانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنا بریف کیس کھولا۔ پہلے احتیاط سے دستانے پہنے، پھر اپنا خصوصی خنجر نکال کر کپتان سے کہا: "سردار جی! اس خاص چیز کے درشن کریں۔" اس خنجر کا پھل دو رنگا تھا اور بڑے پاپڑ بیل کر میں نے اسے زہریلی آب دی تھی۔ چندولال اسے دیکھ کر واقعی چونک اٹھا۔

اسے چونکتے دیکھ کر میں مسکرانے لگا۔ پھر سردار جی کو مخاطب کر کے کہا "مہندر جی! کیا آپ مہاراج تلیہ چانکیہ کی مہان پستک "ارتھ شاستر" سے واقف ہیں؟"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا "ارتھ شاستر سے کون واقف نہیں؟"

"اس کتاب میں ایک مہا مہان منتر تھا جسے "راکھشس منتر" کہا جاتا ہے۔ میں نے بڑی کٹھنائیوں کے بعد وہ منتر حاصل کیا اور اس پر عمل کر کے خنجر زہر میں ڈبو لیا۔ اب یہ موت کا ہرکارہ بن گیا ہے۔ بس ذرا سی خراش اور سمجھو دشمن کا "بولو رام" ہو گیا۔ پھر اہم بات یہ کہ زخم کھانے والے کی چتا کا انتظام بھی فوری ہونا چاہیے ورنہ اس کا "کریا کرم" (تدفین) مصیبت بن جاتا ہے۔"

میری باتیں چندولال بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ گویا وہ بھی اس منتر سے واقف تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے جھنجلا کر کہا "مہاراج! آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ منتر اب تو شاستر سے نکال دیا گیا ہے۔"

"اوش ایسا ہی ہے مگر اس نسخے سے نہیں جو ٹیکسلا کی لائبریری میں موجود ہے۔ کیونکہ ہم اس کی حفاظت کرتے ہیں۔" یہ سن کر اس نے سر جھکا لیا مگر اس کی پریشانی دیدنی تھی۔

میں نے دیکھا کہ مہندر سنگھ زیرلب مسکرا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس بات پر حیران ہونے لگا کہ اس نے میری یاد کو کیسے سینے سے لگا رکھا تھا۔

ہم دونوں نے بچپن میں اپنی کلائیوں پر ایک دوسرے کا نام گُدھوایا تھا۔ مگر میں اس کی نمائش نہیں کرتا تھا جبکہ وہ سرِعام اس لفظ کی نمائش کر رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی جب میں نے اس کی ماتا کو بھابو کہنا شروع کیا تو وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ وہ سرِعام کہتا کہ میرا جگری یار بلکہ سگا بھائی ہے۔

اس کی ماتا، مدن جیت کور نے مجھے ممتا کے حقیقی روپ سے روشناس کرایا تھا۔ وہ واقعی مجھ پر قربان ہو جانے والی ہستی تھی۔ ایک بار دورانِ گفتگو لاشعوری طور پر

www.paksociety.com

۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے اور انھوں نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی کیونکہ ۱۹۶۶ء میں شیخ صاحب نے عوامی لیگ کے پلیٹ فارم سے ۶ نکات کا اعلان کر کے دھماکا کر دیا تھا۔ اس اعلان کو مغربی پاکستان کے سیاستدانوں نے علیحدگی قرار دے کر شور مچا دیا۔ تاہم شیخ صاحب کے چیلنج کا جواب نہ دے سکے بلکہ جی۔ ایم سید صاحب نے شیخ صاحب کی بھرپور حمایت کی اور بھاشانی صاحب نے اس سلسلے میں مغربی پاکستان کا دورہ بھی کیا۔

یحییٰ اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ملاقات ہوئی تو شیخ صاحب نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ مارشل لا نہیں چلے گا۔

www.Paksociety.com

مہندر کے منہ سے ''سورگ باشی'' نکل گیا جس کا مطلب ہے کہ وہ ہستی اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ یہ سن کر مجھے بے حد دکھ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد تینوں فوجی پاکستان کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ ان کا موضوع یہی تھا کہ پاکستانی بنگالیوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ یوں میں ان کی توپوں کا ہدف بن گیا۔ میں چاہتا تو جواب دے سکتا تھا، مگر یوں شر و فساد کا امکان بہت روشن تھا۔ پھر اچانک وہ ہوا جو شاید نہیں ہونا چاہیے تھا۔ زیب یک دم اٹھ کر گرجنے لگی۔ دیوان صاحب اسے منع کرتے ہی رہ گئے۔ مگر لگتا تھا کہ اس کا جنون بے لگام ہو چکا تھا۔

''آپ سب کو شرم آنی چاہیے'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''آپ ہمارے پاکستانی مہمان کی توہین کر رہے ہیں۔ ان کے پاس ہر بات کا جواب ہے مگر وہ حکمت سے کام لے کر خاموش ہیں۔ مگر میں چپ نہیں رہ سکتی۔'' اب رقیہ خاتون نے بھی اسے بیٹھ جانے کو کہا مگر وہ بدستور کھڑی رہی اور ان سوالات کا جواب دینے لگی۔

''لاہور میں سرسوں کا تیل سستا ہے کہ سرسوں وہاں پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تو سرسوں کا نام و نشان تک نہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہاں کے پان کے ایک پتے کو لاہور میں ۶ ٹکڑوں میں کاٹ کر فروخت کیا جاتا ہے مگر وہ شکایت نہیں کرتے۔ کیونکہ وہاں پان پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اور آپ مہاراج! ہماری مدد کرنے تشریف لائے ہیں بہت خوب؟ آپ تو پہلے بھی ہماری مدد فرماتے رہے ہیں۔

جب ۱۹۰۵ء میں بنگال تقسیم ہوا، تو آپ نے وہ شور مچایا کہ رہے نام اللہ کا۔ آپ کے ایک نرکھ باشی نیتا ''بینرجی......'' یہاں وہ رک گئی تو میں نے فوراً اسے یاد دلایا ''سریندر ناتھ بینرجی'' لہٰذا وہ فوراً سنبھل کر بولی:

''جی ہاں سریندر ناتھ بینرجی اپنے چیلوں کا ٹولہ لے کر برطانیہ پہنچ گئے اور آخر اس تقسیم کو ختم کر کے انھوں نے دم لیا۔'' پھر وہ آپ کے چیٹر جی!'' یہاں پھر میں نے لقمہ دیا: ''بینکم چیٹر جی۔''

اس نے فوراً کہا ''ہاں جی! بینکم چیٹر جی نے اپنا ناول لکھ کر سارے ہندوستان میں آگ لگا دی۔ بندے ماترم کا شوشا چھوڑا، پھر لکھا کہ مسلوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو۔ ان کو مار مار کر عربستان روانہ کر دو۔ مہاراج آپ کی امداد تو ہر دور میں ہمارے ساتھ رہی ہے۔ اور تقسیم کے وقت کیا ہوا تھا، آپ کے پنڈت جی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جورو ایڈوینا پر ڈورے ڈالے اور وہ ان کے جھانسے میں آ گئی۔''

''اوئے بدزبان چھوکری! وہ روحانی تعلقات تھے، سب جانتے ہیں۔'' بدری پرشاد نے چیخ کر کہا۔

''جی ہاں ویسے ہی روحانی تعلقات ماؤنٹ بیٹن نے کاشی پنڈت سے قائم کیے۔ اس طرح ماؤنٹ بیٹن کو رام کر کے بھارتی نیتاؤں نے پاکستان کے سارے اثاثے ہڑپ کر لیے۔ کچھ اور سننا پسند کریں گے آپ......؟

۵۶۲ ریاستیں تھیں اصولاً ان کو کسی بھی ملک سے الحاق کرنے کا حق تھا مگر آپ نے یہ حق ماننے سے انکار

اس پر جرنیل صاحب اپنا سا منہ لے کر لوٹے۔

جب میں ڈھاکا ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو حسب توقع وہاں ہجوم بالکل نہیں تھا۔ گاڑی چلنے میں کچھ دیر تھی کیونکہ اگلے اسٹیشن نارائن گنج اور اس کے بعد حداری پور کے درمیان لائن خراب تھی۔ فوجی ہونے کے ناتے میں ملکی سیاست میں ملوث نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میں نے صرف تعمیل سیکھی تھی۔ احکامات پر واویلا کرنا میرا کام نہیں تھا۔

کر دیا۔ کشمیر کو اس لیے ہڑپ کیا کہ وہاں کا راجہ غیر مسلم تھا جونا گڑھ اس لیے کہ وہاں کی عوام کی اکثریت غیر مسلم تھی اور حیدر آباد کو اس لیے کہ وہاں کے اثاثے آپ کو پسند آگئے تھے۔ یہ کیسے آپ کی مدد کا کیا چھتا آپ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے مہاراج؟ کل کو آپ کہیں گے کہ موتی مسجد آپ کے موتی لال نہرو نے بنائی تھی لہٰذا یہ ہمیں دے دو۔"

میں اس کے جوشِ خطابت پر حیران ہو رہا تھا مگر اس نے باتیں سچی کی تھیں، مگر اس سے فساد کی آگ بھی بھڑک سکتی تھی کیونکہ وہ شیرنی پاکستان کی محبت میں بہت آگے نکل گئی تھی۔ ان کے نیتاؤں کو وہ ترکی بہ ترکی کہہ چکی تھی اور یہ بات چندو لال کو ہضم نہیں ہو سکتی تھی اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ پہلے تو حکمت سے کام لیتے ہوئے چندو نے جلیل سے کہا:

"دیکھا مہاراج! یہ بدزبان چھوکری ہمارے نیتاؤں کا کیسے اپمان کر رہی ہے۔"

"دیدی! آپ حد سے گزر رہی ہیں، بیٹھ جاؤ ورنہ؟" جلیل نے گرج کر کہا تو چندو لال کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب اسے پورا یقین تھا کہ وہ زیب کی مدد کو نہیں آئے گا۔ لہٰذا وہ شیر بن گیا اور اس نے گرج کر کہا:

"بدزبان چھوکری، تو نے ہمارے نیتاؤں کو ترکی بہ ترکی کہا اور ان پر بدکاری کا الزام لگایا، میں تیرا خون پی جاؤں گا۔"

کپتان نے اسے خاموش ہو جانے کو کہا تو اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "کپتان صاحب! آپ اس لفڑے سے دور رہیں، یہ دھرم یدھ (مذہبی جنگ) ہے۔ مجھے اپنے دھرم کی رکھشا کرنے دیں۔ اس نے اپمان کی حد کر دی ہے۔ اب جہاں دھرم کی بات ہو وہاں دلیل کی بات کی ہی نہیں جا سکتی لہٰذا مہندر کو خاموش ہو جانا پڑا۔ یہ محاذ خاموش ہوا تو چندو لال نے اچھل کر زیب کی گردن دبوچ لی۔ اس کی سانس پہلے ہی پھولی ہوئی تھی۔ بول بول کر نڈھال ہی ہو رہی تھی۔ پل بھر میں اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔ اسی پر بس نہیں اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑی ہتھوڑی بلند کر کے، سر پر مارنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

میرے نزدیک بنگال کے گھپ اندھیرے میں وہ پاکستان کی روشن شمع تھی۔ اسے گل نہیں ہونا چاہیے تھا ورنہ تو اندھیرا ہو جاتا۔ میں نے وہی کیا جو اس وقت مناسب معلوم ہوا۔

پیشتر اس کے کہ چندو لال کا ہاتھ نیچے آ کر زیب کا سر پاش پاش کر دیتا، میں نے اپنا زہریلا خنجر اس کی بغل میں گھونپ دیا۔ مہندر کے منہ سے بے اختیار نکلا "او وچ اگرق۔"

ادھر چندو لال ہائے رام کہہ کر اپنی نشست پر گر گیا مگر گرتے گرتے اس نے اپنے حواریوں کو چیخ کر کہا: "اوئے بدری، اوئے چند دھرم کی رکھشا کرو، سیدھے سورگ میں جاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے ہتھوڑی ان کی طرف اچھال دی۔ اب وہ ہتھوڑی امی چند کے ہاتھ میں تھی اور بدری کے ہاتھ میں لمبا چچ کس جس کے دستے کو بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں دھرم یدھ (مذہبی جنگ) میں شرکت کو تیار تھے۔ دین دھرم پر عمل بے شک نہ ہو، اس کی خاطر جان قربان کی جاتی رہی ہے۔ ادھر زیب نڈھال ہو کر نشست پر گری اور اپنے گلے کو دونوں ہاتھوں سے ملنے لگی۔ دیوان صاحب اور رقیہ خاتون اس کی مدد کر رہے تھے۔ فرزانہ مسلسل چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔

بدری اور امی چند اپنے ہتھیار سنبھالے زیب کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میرا خنجر جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بہرحال وہ وقت خنجر کی تلاش نہیں نورانی قندیل کو بچانے کا تھا۔ بدری اور امی چند نے بیک وقت اس کو نشانہ بنایا تو میں اچھل کر زیب کی ڈھال بن گیا۔ دونوں وار میری کمر پر لگے۔ مجھے یوں لگا کہ میری پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ ان ناہنجاروں نے اپنے ہاتھ نہیں روکے اور مسلسل میری کمر پر مشق ستم کرتے رہے۔ ہر وار کے ساتھ میری منہ سے آہ نکل جاتی مگر زیب میرے نیچے مکمل چھپ کر محفوظ ہو چکی تھی۔ اتنے میں کسی نے چیخ کر کہا "اوئے احمقو، اس کے سر پر وار کرو۔" یہ آواز یقیناً اس باتھی بھوتیاں کی تھی۔ تب میرے سر کی پشت پر قیامت ٹوٹ پڑی مگر حیرت انگیز طور پر چیخ زیب کی نکلی۔ اس پگلی نے

اپنے دونوں ہاتھ میرے سر کی پشت پر جما دیے تھے یوں چوٹ کی شدت بانٹ لی۔

میری بینائی مدھم پڑ چکی تھی۔ جیسے میں اندھے کنوئیں میں ڈوب رہا تھا۔ مگر تاحال میرے حواس قائم تھے۔ میں نے غصیلے لہجے میں کہا "زیب میرے پیچھے چھپ جاؤ ہاتھ اندر کرلو ورنہ میں اٹھ جاؤں گا اور وہ تمھیں مار ڈالیں گے۔"

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ ایک اور وار میرے سر پر ہوا تو میری ہمت جواب دے گئی۔ اسی وقت کسی نے چیخ کر مجھے پکارا "اوئے ظالم آدمی، بتا تیری بھابھو کا نام کیا ہے؟"

بھلا یہ کون سا وقت تھا سوال و جواب کا، مگر وہ آواز تو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی، میں نے صاف طور پر ماتا مدن جیت کور کو دیکھا۔ وہ نہ زمین پر تھی نہ آسمان پر، ہوا میں تیرتی ہوئی کھڑکی کے راستے اندر آئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی "وے تاریا، بتا کیوں نہیں دیتا میرا نام؟ گھبرانے والی بات نہیں تیرا انگت ابھی نہیں کٹا۔"

ایک بار پھر جب وہ کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں نے پوری ہمت کر کے کہا "مدن...... جیت ...... کور۔ اب خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اس کے بعد میں وقفہ تسلیم و رضا میں چلا گیا جسے عام لوگ بے ہوشی کہتے ہیں۔ اب ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ کیا اسے ہی موت کہتے ہیں؟ شاید ایسا ہی ہو، وثوق سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میرے منہ سے اپنی ماتا جی کا نام سنتے ہی مہندر کا جنون بے لگام ہو گیا۔ اس کے حلق سے وحشی درندے کی سی دہاڑ نکلی۔ امی چند، بدری، بھوتیاں اور جلیل سب دم دبا کر بھاگ گئے ورنہ وہ ان سب کو قتل کر دیتا۔ پھر وہ پستول لہراتا مجھے لے کر ہسپتال آیا۔ مجھے وی۔ آئی۔ پی روم میں داخل کروانے کے بعد اس نے ایک معقول رقم ہسپتال میں جمع کراتے ہوئے کہا: "کسی دوا کی ضرورت پڑے اور وہ دوا آپ کے پاس نہ ہو تو اسے مقامی مارکیٹ سے خرید کر

انداز گفتگو

ایک سردار نے پہلی مرتبہ انگلینڈ جانے سے قبل اپنے دوست سے پوچھا "وہاں خواتین سے عموماً کس طرح بات کرنی چاہیے؟"

"بس اس قسم کی کہ آپ کے بچے کتنے ہیں؟ یا آپ کی شادی ہو چکی ہے وغیرہ۔"

وہاں ایک محفل میں سردار صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھی خاتون سے پوچھا "محترمہ! آپ کے بچے کتنے ہیں؟"

خاتون بولیں "پانچ۔"

"آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

سردار نے فوراً اگلا سوال پوچھا۔

(ملک محمد نعیم، ملتان)

مریض کا علاج کیا جائے۔ یاد رکھو اگر کسی نے علاج معالجے میں سستی کا مظاہرہ کیا تو وہ جان سے جائے گا۔ میں اپنی پوری پلاٹون لا کر سب کا بُرا حشر کر دوں گا۔" ہسپتال کے عملے نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف یس سر، یس سر کہا اور اپنی جان بچائی۔ ویسے بھی وہ کوئی خلاف قانون کام نہیں کر رہا تھا۔

میں سوچتا ہوں کہ مہندر نے واقعی دوستی کا حق ادا کیا اور اپنی بھابھو مدن جیت کور کی اچھیا کا پالن کرتے ہوئے عملی ثبوت پیش کر دیا۔ ایک ثبوت وہ پہلے ہی پیش کر چکا تھا کہ اس نے اپنی گوت (ذات) میرے نام پر رکھ لی تھی۔ یعنی "مہندر سنگھ تارا۔"

رات کے کسی پہر میرا احساس بیدار ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی جسم سے اٹھنے والی ٹیسیں بھی جاگ اٹھیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ ٹیسوں سے الگ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو، گدگدی کا احساس، درد پر غالب تھا۔ پہلے مجھے مدھم آوازوں کا احساس ہوا پھر باتوں کا مفہوم صاف ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں کھولی تو عجیب منظر دکھائی دیا، زیب نے اپنی کلائی کی پشت میرے پیٹ پر لگا رکھی تھی "اوئے پاگل لڑکی یہ کیا کر رہی ہو؟ اٹھاؤ ہاتھ، مجھے گدگدی ہو رہی ہے۔"

وہ آنسو بہاتے بہاتے یک دم مسکرانے لگی۔ بولی: "میں اپنی کلائیاں آپ کے پیٹ کی حرارت سے سینک رہی ہوں۔ کیا آپ بچے ہیں جو آپ کو گدگدی محسوس ہو رہی ہے۔"

یہ سن کر میں خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنی دوسری کلائی میرے پیٹ پر رکھ دی تب میں نے کہا "پاگل لڑکی! یہ میرا پیٹ ہے انگیٹھی نہیں، اگر کلائیوں کو ٹکور کرنی ہے تو ہیٹر استعمال کرو۔"

زیب کے پیچھے مہندر کھڑا تھا یہ سن کر وہ بھی مسکرانے لگا۔ پھر اچانک سنجیدہ ہو کر کہا "یار تارڑ! تم نے بڑی زیادتی کی، بھابھو کا نام پہلے کیوں نہ بتا دیا۔ خیر! جو ہونا تھا سو ہو گیا، مگر یار اب تجھے پچھتانا نہیں ہوگا۔ چند روز میں تو پھر بنا کستانا ہو جائے گا۔ پھر باتیں ہوں گی۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اس نے میرا مفہوم پا کر کہا "دیوان صاحب کو میں نے رخصت کر دیا تھا۔ وہ گھر میں آرام کرنے کے بعد صبح آ جائیں گے۔ انھوں نے دھان منڈی میں رہائش کا انتظام کر رکھا ہے۔ اس دورِ خرابی میں وہی جگہ محفوظ تر ہے۔" یہ کہہ کر باورچی خانے کو چل دیا۔

زیب نے مسکرا کر اپنی کلائیوں کو لہرایا اور کہا "دیکھا! آپ نے میرا درد تک چوس لیا اب میرے دونوں ہاتھ بھلے چنگے ہو گئے ہیں۔"

"مبارک ہو" میں نے زیرِ لب کہہ کر آنکھیں بند کر لیں کیونکہ بند آنکھوں سے مجھے سکون مل رہا تھا۔

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو قومی اسمبلی کی ۳۱۳ نشستوں کے لیے الیکشن ہوا۔ اس میں ۱۳ سیٹیں خواتین کی اور ۳۰۰ مرد حضرات کی تھیں۔

بالغ رائے دہی کے اصول کے مطابق مشرقی پاکستان کی کل ۱۶۹ نشستیں تھیں اور مغربی پاکستان کی ۱۴۴ اور (۶+۱۳۸) اور (۷+۱۶۲)۔ چوٹ اگرچہ مقابلے کی تھی تاہم اہلِ دانش جانتے تھے کہ پلہ مشرقی پاکستان کا بھاری رہے گا چنانچہ جب نتیجہ آیا تو عوامی لیگ نے ۱۶۰ نشستیں حاصل کیں اور بھٹو صاحب ۸۱ پر کامیاب قرار دیے گئے۔ اس طرح ۱۶۰ اور ۸۱ کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ مغربی پاکستان میں بھٹو صاحب نے سب کو چت کر دیا اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے میدان مارا۔ بڑے بڑے سیاسی برج الٹ گئے۔ مثلاً فضل القادر، چودھری خواجہ خیر الدین، مولوی فرید احمد (مشرقی پاکستان سے) پنجاب سے میاں طفیل محمد، نواب زادہ نصر اللہ خاں، محمد حسین چٹھہ، عبدالستار خاں نیازی، اصغر خان اور یوسف خٹک (سرحد سے) پٹ گئے۔ یہ گویا پورے پاکستانی عوام کا فیصلہ تھا جس کی رو سے عوامی لیگ کے راہنما شیخ مجیب الرحمٰن کو وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کے پاس ۱۶۷ سیٹوں کی اکثریت تھی۔ مگر ہوا یہ کہ بھٹو صاحب نے ایک نیا فارمولا پیش کر کے اقتدار میں شرکت کا مطالبہ کر دیا کیونکہ وہ مغربی پاکستان میں فاتح قرار دیے گئے تھے۔ اس مطالبے کو شیخ مجیب الرحمٰن نے فوراً مسترد کر دیا اور کل کل کا آغاز ہوگیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا مطالبہ ہر لحاظ سے غلط تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے جب دستور کے عین مطابق منتخب شدہ اراکین کا اجلاس طلب کیا تاکہ اسے وزیراعظم بنا دیا جائے تو ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو بھٹو صاحب نے اقبال پارک لاہور میں ایک بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے دو اعلانات کیے۔ (۱) انھوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "او شیخ! تم اُدھر (مشرقی پاکستان میں) حکومت کرو اور میں اِدھر یعنی مغربی پاکستان میں۔" اس اِدھر اور اُدھر والی بات کو آج اکثر حضرات بے شک تسلیم نہ کریں مگر یہی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا اعلان زیادہ خطرناک تھا۔

۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکا میں اجلاس طلب کیا تھا مگر ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان فرما دیا کہ اگر پیپلز پارٹی کا کوئی منتخب شدہ رکن ڈھاکا گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اس طرح جس اجلاس میں شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیراعظم بنایا جانا تھا وہ منعقد ہی نہ ہو سکا اور سیاسی تعطل پیدا ہوگیا۔ بلکہ صاف ظاہر تھا کہ اب

www.paksociety.com

مشرقی اور مغربی پاکستان کے راستے الگ ہو گئے تھے۔ لوگ یہی کہتے ہیں کہ علیحدگی کا نعرہ بنگالیوں نے لگایا حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ یہ نعرہ بھٹو صاحب نے سرِعام لگایا تھا۔ کیونکہ وہ صرف اور صرف اقتدار میں آنا چاہتے تھے۔ یہ کہہ کر دیوان صاحب سر جھکا کر خاموش ہو گئے اور ہمیں سوچوں کے سپرد کر گئے۔''

دیوان صاحب خاموش ہوئے تو کمرے پر سکوت مرگ طاری ہو گیا۔ ہسپتال سے باہر قیامت برپا تھی۔ مگر اس کمرے میں ہم سب پاکستانی تھے۔ مہندر کی ہمدردیاں بوجوہ میرے ساتھ تھیں۔ آخر یہ مہر سکوت مہندر نے توڑی اور کہا ''دکھ دینے والی بات یہ ہے کہ اب اگر پاکستان چاہے بھی تو اس عدم توازن کو اپنے حق میں نہیں کر سکتا کہ بھارت نے مکمل ناکہ بندی کر رکھی ہے اور اب تو خیر! مسافر جہازوں کی پرواز بھی ممنوع قرار دی جا چکی ہے۔''

ان باتوں سے ہم سب واقف تھے اور مہندر کی تردید نہیں کر سکتے تھے۔ گویا ہمارے پاس کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ اتنی ناخوشگوار باتیں سن کر میری طبیعت بگڑنے لگی تو زیب نے سب کو خاموش کرا دیا اور موضوع بدلتے ہوئے عجیب بے تکا سوال داغ دیا۔

''پرتیم! یہ تو بتاؤ کہ تمھو میر شہید نے شادی کی تھی؟'' اس نے ایک تاریخی سوال داغ دیا۔

''ارے پگلی، اگر وہ لوگ شادیاں نہ کرتے تو آپ لوگ کہاں سے آتے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی! یہ تو ہے۔'' زیب نے سر جھکا کر کہا ''مگر اس کا حال تو بیان کریں کہ وہ کون خوش نصیب تھی جو ہماری دادی ماں بنی۔''

''ہوا یہ تھا کہ ایک روز تمھو میر اپنے دادا عمر دراز علی کے پاؤں داب رہا تھا کہ فضا میں ایک بھجن یا گیت سنائی دینے لگا۔ مجھے وہ گیت بھی یاد ہے مگر شاید میری بنگالی کا تلفظ اچھا نہ ہو۔'' میں نے ٹالنے کی خاطر کہا۔

''تلفظ کی کوئی بات نہیں میں سمجھ جاؤں گی۔'' زیب نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''ایشو شا ملواتر، گروہ دھاری (آؤ تو لے گروہ دھاری)
نندو لال برجو گوپال گوکلو چتو بہاری (تم نند لال
برجو گوپال اور دلدار بہاری بھی ہو)
بوشی بجاؤ تو پیاری (تمھاری بانسری پیاری لگتی ہے۔)''

یہ گیت سن کر عمر دراز علی نے حیرت سے دیکھا کہ ان کا پوتا پاؤں دابتے دابتے اس گیت کو غور سے سن رہا

جب جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں

دسمبر ۱۹۷۱ء کو کرمی ٹولہ (ڈھاکا) کے ریڈار کا انچارج میرا رفیق کار فلائٹ سارجنٹ ریاست علی تھا جو جنگی قیدی بنا۔ پھر وہاں سے نجات پانے کے بعد ہمارے ساتھ آملا۔ میں اس زمانے میں شورکوٹ ریڈار کا وارنٹ آفیسر انچارج تھا۔ ایک روز ریاست نے سب کے سامنے بتایا کہ سقوط ڈھاکا کے بعد بھارتی افسروں نے کرمی ٹولہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک روز ایک بھارتی فوجی افسر نے پاکستانی فوجیوں کو غلیظ گالیاں دیتے ہوئے کہا ''آج مسلوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی فوج کی تعریفیں کرنے لگا۔ بنگالی مسلمان افسر عالم بے بسی میں یہ باتیں سن رہے تھے۔ اس افسر نے جب خاموش ہونے کا نام ہی نہ لیا تو ایک مسلمان بنگالی افسر یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اٹھ کر ہرزہ سرائی کرنے والے ہندوستانی افسر کے منہ پر پوری قوت سے زناٹے دار تھپڑ مارا۔ کمرے میں سکوت مرگ چھا گیا۔ مگر اس اشتعال انگیزی کے بعد بنگالی افسر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

تھپڑ کھانے والے افسر نے کچھ کہنا چاہا تو وہاں موجود ایک سینئر بھارتی افسر نے اسے ڈانٹ کر منع کر دیا۔ یہ تھپڑ کیا ثابت کرتا ہے؟ یہی کہ بہتی ندی کے پانی پر لاٹھی مار کر اسے ۲ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ وقتی طور پر اس جگہ پانی کا بہاؤ تو بدل جاتا ہے مگر آخر فوراً ہی منہ زور پانی اس تبدیلی کو بھی ساتھ بہا لے جاتا ہے۔

تھا۔ وہ چنانچہ بہت خوش تھے۔ انھوں نے بڑے پیار سے پوچھا "بیٹا تجھے یہ کون گا رہا ہے اور کیا یہ تم کو پسند ہے؟"

"دادا ابو! یہ پاربتی دیوی گا رہی ہے اور ان کا گانا مجھے اچھا لگتا ہے۔" دادا جان سب کچھ سمجھ گئے۔ انھوں نے اپنے پوتے سے کہا "بیٹا! اب جا کر آرام کرو اور اپنے ابو امی کو میرے پاس بھیج دو۔"

"جب ان کا بیٹا اور بہو آئے تو عمرو دراز علی نے کہا: "بیٹا تم بیٹے کی شادی کر دو۔ میرے خیال میں کمال پورے صوفی رحیم اللہ کی بیٹی میمونہ خاتون بڑی مناسب رہے گی۔ اس طرح تمھارے میر کی شادی میمونہ سے ہوگئی اور ان کی تیسری یا چوتھی پشت نے لفظ دیوان اپنے ناموں کا جز بنا لیا۔"

اس دوران رقیہ خاتون اور دیوان صاحب بھی آ پہنچے تھے۔ وہ میری باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ اس کے بعد باتوں باتوں میں رات بیت گئی لہٰذا محفل برخاست ہوگئی۔ باقی باتیں دوسرے دن تک ملتوی ہوگئیں۔ دیوان صاحب اور ان کی بیگم جانے سے پہلے آپس میں کھسر پسر کرکے مسکراتے رہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے اور زیب کو بھی دیکھ لیتے۔

دوسرے روز شام سے پہلے مہندر اور دیوان صاحب آگئے اور آتے ہی بے تکے موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ دیوان صاحب نے کہا "بیٹا تم جانتے ہو کہ اسلام میں تعدادِ ازدواج کی اجازت ہے؟"

"جی دیوان صاحب اسلام میں ایک سے زائد شادیاں جائز ہیں۔" میں نے حیرت سے ان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسلام کے اس اصول پر اعتراض کرنے والے ہندو ہیں۔" مہندر نے کہا۔ "حالانکہ ان کی اپنی پشتوں میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ شری رام جی کے والد دسرتھ کی تین رانیاں تھیں اور چھوٹی رانی کیکئی نے ان کو بن باس دلایا تھا۔ شری کرشن مہاراج کی تو ایک ہزار ایک سو آٹھ بیویاں زندہ سلامت بیان کی جاتی ہیں۔ یعنی اسلام پر اعتراض کرنے والے اپنے دھرم سے بھی واقف نہیں۔"

دیوان صاحب نے مہندر کی تائید کی اور پھر اپنی بات کا مقصد بھی بتا دیا "بیٹے اصل بات یہ ہے کہ ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا ہے، تمھارا نکاح زیب النسا سے کر دیا جائے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے ہو۔ تم نے عملاً ثابت بھی کر دیا۔ تم میری بیٹی کے لیے موزوں ترین خاوند ثابت ہو گے۔ اسلامی تعلیمات کو زیر بحث لانے کا یہی مقصد تھا۔ کیا تمھیں اس رشتے پر اعتراض ہے؟"

"آپ میرے جواب سے اچھی طرح واقف ہیں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "زیب کو اپنانا تو میرے لیے بڑے اعزاز والی بات ہوگی مگر میں اس کے قابل ہوں بھی یا نہیں، اس کا فیصلہ زیب کو کرنا ہے۔ آپ اس سے پوچھ لیں۔ کیونکہ میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں اور میرے بچے بھی ہیں۔"

"مجھے آپ کا ساتھ ہر حال میں منظور ہے۔" زیب نے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا تو سب ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ تب دیوان صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا "بیٹا! ہمارے ہاں یہ رسم ہے جسے آج پورا کرنا ضروری ہے۔" رقیہ خاتون پھر اٹھ کر زیب کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور اس کے گھنے بالوں کی نمائش کرنے لگی جیسے کپڑا پھیلا کر دکھایا جاتا ہے۔ دیوان صاحب زبانی تبصرہ کرنے لگے:

"بیٹا جی! میری بیٹی زیب النسا میں بڑے گن ہیں۔ اس نے رقص، موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کر رکھی ہے۔ ذہانت میں بے مثال ہے۔ صحت مند اور وفا میں لاجواب۔ یہ دکھ سکھ میں تمھارا ساتھ دے گی۔ تم کہو تو ابھی رقص و موسیقی کا مظاہرہ ہو سکتا ہے۔"

"جناب! آپ پہلے ہی یہ نمائش کرکے زیب النسا کی توہین فرما چکے۔ رقص کے سلسلے میں گزارش ہے کہ میں اس کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ بشرطیکہ آپ اسے میرا استحقاق سمجھیں۔"

"جیسے تمھاری مرضی!" دیوان صاحب نے جواب دیا۔ "بنگال میں یہ گویا ہمارے ہاں کی رسم" "منہ دکھوا"

www.paksociety.com

جیسی رسم تھی جہاں دولہا کے بجائے دلہن کو پسند کر لیا جاتا ہے۔ تاہم اب تو یہ دکھاوا بعض رسوم بھی متروک ہو چکی ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۷۱ء کا سورج طلوع ہوا۔ اس روز میری حالت قدرے بہتر تھی۔ زیب میری پسند کا کھانا پکا کر لانے والی تھی۔ مہندر نے دیوان صاحب کے گھر ۲ مسلح محافظ مقرر کر دیے تھے۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ چین کی بانسری بجا رہے تھے۔ کافی کے تین پیالے ہمارے سامنے تھے۔ اتنے میں ایک زخمی سپاہی اندر داخل ہوا۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ پگڑی سے اس نے اپنا شدید زخمی بازو لپیٹ رکھا تھا۔ اس حالت میں بھی اندر داخل ہوتے ہی کپتان کو سلیوٹ مارا اور جلد جلد بے ربط باتیں کرنے لگا:

''سر جی! وہ بہت زیادہ تھے، انھوں نے سب کو جلا ڈالا۔ میں مار دھاڑ کرتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ عوامی لیگ کے بلوائی باغی ہو چکے ہیں۔''

''امریک سنگھ! آرام سے ساری بات بتاؤ کیا ہوا؟'' مہندر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''سر جی! ہم مستعد کھڑے تھے، اچانک جیکاروں کی آواز آئی اور ہزاروں بلوائی حملہ آور ہو گئے۔ ہم نے فائر کھول دیا مگر وہاں تو لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح ابلے پڑ رہے تھے۔ ان کا سرغنہ ایک چھوٹے ہوئے چہرے والا بھوتیاں تھا اور دوسرا زبیل۔ ان ہی ناموں سے وہ ایک دوسرے کو پکارتے تھے۔ زبیل نے میرے بائیں بازو پہ چھرا مارا تو میں نے اسے گولیوں سے بھون دیا۔ پھر جب بھوتیاں آگے آیا تو میں نے اسے بھی ختم کر دیا پھر آپ کو بتانے ادھر آ گیا۔''

''سر جی! جب انھوں نے مکان کو آگ دکھائی تو اندر کہرام مچ گیا۔ کوئی چیخ چیخ کر دہائی دے رہا تھا، 'اے ہمارے پیارو! ہمیں بچاؤ، دیکھو دشمن ہمیں زندہ جلانے آ گیا۔'''

یہ خوفناک خبر سن کر دیوان صاحب اور میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مہندر نے پہلی بار ذرا کرخت لہجے میں کہا:

''آرام سے بیٹھے رہو۔ تم لوگ وہاں جا کر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔'' اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ ہم دونوں گم صم بیٹھ گئے۔

مہندر اٹھ کر اندر سے پانی لایا اور اس نے ہم دونوں کو زبردستی پلا دیا۔ دیوان صاحب نے پہلی بار انا للہ پڑھا تو مجھے بھی اس کا خیال آیا۔ آخر ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ بقول اس محافظ کے، اگر ہم بھی وہاں ہوتے تو شاید کچھ نہ کر سکتے۔ بپھرے ہوئے بلوائیوں کا مقابلہ مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔

۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو اقبال پارک میں بھٹو نے دو باتوں کا اعلان کیا تھا: ''او شیخ اُدھر تم حکومت کرو اِدھر ہم'' مگر کوئٹہ میں کھاج والی بات بھی اس نے کہہ دی تھی جس کو ڈھاکے کے اخبارات نے سرخیاں لگائی تھیں۔

اگر پیپلز پارٹی کا کوئی رکن ڈھاکے گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور وہ اجلاس جس میں شیخ مجیب الرحمن کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان سونپا جانا تھا وہ منعقد ہی نہ ہو سکا۔ دوسرے روز یعنی ۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمن نے رمنا پارک میں عام بغاوت کا اعلان کر دیا اور اس طرح بلوائیوں کو کھلی چھٹی مل گئی۔ وہ آزادی کے جیکارے لگاتے ہوئے بہاریوں، پنجابیوں اور پاکستانیوں پر پل پڑے۔ اس قتل و غارت گری کا حساب نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ سارا فساد غیر منظم تھا۔ کوئی اسے ۳۰ ہزار اور کوئی ۵۰ ہزار کہتا ہے۔ درست اعداد و شمار کا علم صرف قادر مطلق ہی کو ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو دیوان خاندان کے قتل والی بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کوئی ۱۵ منٹ تک ہم سب سر جھکائے بیٹھے رہے۔ یہ حادثہ اتنا بڑا تھا کہ کسی میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ آخر مہندر نے خاموشی توڑتے ہوئے سپاہی سے پوچھا:

''گاڑی ہے؟''

''جی سر! میں گاڑی لے کر وہاں سے غائب ہوا تھا ورنہ تو وہ میرا بھی قیمہ کر دیتے۔''

''اب آپ لوگ میری باتوں پر عمل کریں، اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ میں اپنی ساری پلٹن بھی لے آؤں تو ان

بچھڑے ہوئے لوگوں کو نہیں روک سکتا۔" ہم دونوں جانتے تھے کہ مہندر ٹھیک کہہ رہا تھا۔

ہم خاموشی سے اس کے پیچھے چلنے لگے۔ منزل کی ہمیں خبر نہ تھی۔ سوال کرنے سے پہلے ہی مہندر نے کہا: "ہم محفوظ ترین جگہ پر جا رہے ہیں۔ جو بچ گیا ہوا سے بچا لینا ہی بہترین ہے۔ ہم آرام سے بیٹھ کر منصوبہ بندی کریں گے۔"

فوجی گاڑی چل رہی تھی میں نے محسوس کیا کہ وہ راستہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم پاکستان کے ریفارا اسٹیشن کرمی ٹولہ پہنچ گئے۔ جہاں پاک فضائیہ کا عملہ رہائش پذیر تھا۔ اس عمارت پر اب مکتی باہنی کا قبضہ تھا۔ یہ اور بات بھی ہے کہ وہ سب لوگ مہندر کے اپنے تھے۔ اس طرح ہم جنوری کی آنکھ میں محفوظ ہو چکے تھے۔ میری شکل چونکہ مہندر سے ملتی جلتی تھی لہٰذا اس اتفاق کا فائدہ اٹھانے کا وقت آ گیا۔ یہی بات ہماری ماتا جدن جیت کور بھی کہا کرتی تھی کہ تم دونوں جڑواں بھائی لگتے ہو۔ وہاں مہندر نے میرا تعارف بھی چھوٹا بھائی کہہ کر کرایا۔ اول تو اس کی ضرورت نہ تھی تاہم بُرے وقت کی کیا خبر کہ کب آ جائے۔

غم سے دیوان صاحب کی کمر ٹوٹ چکی تھی مگر انھوں نے کمال برداشت کا مظاہرہ کیا۔ ایک لحاظ سے ہم دونوں قیدی تھے کیونکہ ہماری اپنی بہتری اسی میں تھی کہ اس چار دیواری کے اندر رہیں۔ وہ بھی عجب قید تھی! ہم اپنے ہی ملک کے ہوائی اڈے پر قید تھے جبکہ ہمارے سامنے پرندے تک آزاد محوِ پرواز تھے۔ کبھی کبھی تو مجھے ان پر رشک آتا۔ میں ان لمحات کو یاد کرتا جب پورے ہوائی اڈے پر میری دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

ایک روز میں نے دیوان صاحب کو چھپ کے روتے دیکھا، میرا خود یہی حال تھا۔ مگر ہم دونوں اپنے غموں کو ایک دوسرے سے چھپاتے تھے۔ اصل میں مارچ کے ان حالات کی بنیاد جنوری ہی میں پڑ چکی تھی۔ ۳ر جنوری ۱۹۷۱ء میں شیخ مجیب نے رمنا پارک میں عدم تعاون کا اعلان کیا تو بلوائی بے لگام ہونے کو تیار تھے۔ ان حالات میں یحییٰ خان ڈھاکا پہنچے تو گورنر ہاؤس کے ساتھ صاحبزادہ یعقوب علی اور شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کا استقبال کیا۔ پھر ۳ر گھنٹے طویل میٹنگ ہوئی۔ شیخ صاحب نے مارشل لا کے اختتام کا مطالبہ کیا مگر یحییٰ نے تو اقتدار سے چمٹے رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس طرح نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ۲۷ر جنوری والے دن مسٹر بھٹو صاحب ڈھاکا آئے اور شیخ مجیب الرحمٰن سے ملے۔ عجیب واہیات صورت حال تھی۔ بھٹو صاحب کو اقتدار میں شرکت مطلوب تھی اور شیخ صاحب ان سے اپنے ۶ر نکات منوانے پر تلے بیٹھے تھے لہٰذا نتیجہ صفر رہا۔ ۷ر مارچ ۱۹۷۱ء کو رضاکاروں نے پورے ملک پر قبضہ جما لیا۔ مرکز سے مکمل عدم تعاون کا عملی مظاہرہ تھا۔ ان حالات میں بھٹو صاحب ایک بار پھر ڈھاکا آئے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر مبشر حسن، محمود علی قصوری، حفیظ پیرزادہ اور رفیع رضا بھی تھے۔ اس طرح ۲۳ر مارچ ۱۹۷۱ء والے دن ایک اور کوشش کی گئی مگر اب شیخ مجیب الرحمٰن کا لہجہ اور طرح کا تھا۔ "ہم اکثریت میں ہیں لہٰذا حکمرانی آپ کی نہیں چلے گی۔" انھوں نے اصول کی بات کی، مگر یحییٰ اور بھٹو صاحب اس اصول کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ اس طرح ۲۵ر مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن نے آزادی کا اعلان کر دیا۔

ہسپتال کی نگہداشت کے بغیر میری حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ مجھ میں جینے کی امنگ دم توڑنے لگی۔ ایک روز تو پاگل پن کی حد ہو گئی۔ چند روز سے مجھے روشنی اچھی نہ لگتی تھی۔ بجلی بند کر کے میں موم بتی جلا کر بیٹھا رہتا۔ ایک روز خیال آیا کہ زندہ جلتے ہوئے زیب کو کتنی تکلیف ہوئی ہو گی؟ بس ہتھیلی کی پشت جلتی موم بتی پر رکھ دی۔ دیوان صاحب دیوار کی طرف منہ کیے لیٹے تھے۔ اتفاق سے ایک محافظ اندر آیا، تو اس نے شور مچا دیا۔

دیوان صاحب کو جب صورت حال کی خبر ہوئی تو وہ بھی فکرمند ہو گئے۔ تب انھوں نے ایک انکشاف کیا: "بیٹا! میں جانتا ہوں کہ تمھارا دکھ بہت گہرا ہے اور یہ بھی کہ صرف وقت ہی اس کا مداوا کرے گا تاہم آج میں

www.paksociety.com

تمھیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں کہ زیب کو زندہ نہیں جلایا گیا تھا۔ جب بلوائیوں نے مکان کو نذر آتش کیا تو زیب نے تمھارا نام لے لے کر مدد کے لیے پکارا۔ وہ دیو بھوتیاں اسے برداشت نہ کر سکا اور اس نے دونوں بچوں کو گولی مار دی۔ میرا ایک ہمدرد بھی ان حملہ آوروں میں شامل تھا مگر اس کے دل میں پاکستانیت کی کرن تاحال روشن تھی۔ یہ ساری باتیں اسی نے مجھے بتائی ہیں۔ بھوتیاں نے رقیہ خاتون تک کو نہ بخشا کیونکہ وہ اپنی بیٹیوں کو بچانے لگی تھی۔ اس طرح وہ سب لوگ زندہ جلنے سے بچ گئے۔ گویا موت کے منہ میں جانا ان کے لیے رحمت بن گیا۔ لہٰذا تم اپنے آپ کو اتنی تکلیف مت دو۔"

یہ سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ دن بے بسی کے عالم میں گزرتے رہے۔ آخر ایک دن مہندر نے ہمیں جنگ زدہ شہر سے نکالنے کا بندوبست کر لیا۔

جب دسمبر میں بھارتی چھاتا بردار ڈھاکا میں اترے تو ان کا سامنا کرنے کے لیے وہاں فوج ہی نہیں تھی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

اس داستان کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ بعد میں یحییٰ خاں نے بھی دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اس نے جنرل نیازی یا گورنر ڈاکٹر مالک صاحب کو ہتھیار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ نیازی تو ویسے بھی ٹائیگر کہلاتا تھا اور بھی سچ ہے کہ ہوٹل انٹرنیشنل میں وہ ڈینگیں نکال کر کہا کرتا تھا کہ بھارتی فوج میرے جیتے جی مشرقی پاکستان کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتی۔ تاہم یہ ڈینگیں ہوٹل کے کمرے کے اندر ماری جاتی تھیں۔ گورنر ہاؤس میں ملازم ایک خانسامے نے تو اسے آنسو بہاتے بھی دیکھا تھا اور اس نے باہر آ کر اپنے ساتھیوں سے کہا "اندر بڑے صاحب رو رہے ہیں اور ڈاکٹر مالک اسے تسلیاں دے رہے تھے۔" جب جبر شے اختتام پذیر ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو اپنی امیدوں سے زیادہ مل گیا اور وہ مغربی پاکستان کے بلاشرکت غیرے مالک و مختار بن گئے تو یحییٰ

جل بن مچھلی

چراغ دین المعروف استاد دامن کو غلام مصطفیٰ کھر کے دور گورنری میں اسلحہ کیس کے تحت جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ استاد دامن ٹکسالی گیٹ کے قریب مسجد شاہ حسین کے ایک تنگ سے حجرے میں رہتے تھے جہاں ہم نے صرف اور صرف کتابیں ہی دیکھیں۔ بہرحال حکمرانوں نے ان کو اس واہیات مقدمے کی آڑ میں پابند سلاسل کر دیا۔

سزا کاٹنے کے بعد جب استاد دامن واپس آئے تو انھیں دلی میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں مدعو کیا گیا۔ مشاعرہ راج بھون کے قریب وسیع و عریض پنڈال میں انعقاد پذیر ہوا۔ استاد دامن کو سننے والے جوق در جوق پنڈال میں آئے اور اہم بات یہ کہ پنڈت جی بھی چپکے سے آ کر سامعین میں شامل ہو گئے۔

استاد دامن نے اپنا کلام پیش کیا تو گویا مشاعرہ ہی لوٹ لیا۔ پھر انھوں نے اپنی مشہور نظم پیش کی جس کا ایک مصرع زبان زد خاص و عام ہو چکا۔

لالی اکھیاں دی پئی دس دی اے
روئے تسیں وی ہو، روئے اسی وی ہاں

(آنکھوں کی سرخی گواہ ہے کہ آپ بھی روئے ہیں اور ہم بھی خوب رو چکے۔)

یہ مصرع سن کر پنڈت جی اٹھ کر اسٹیج پر پہنچ گئے اور استاد جی کے دست بستہ کہنے لگے "استاد جی! یہ پاکستانی آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔ آپ اس گھٹے ماحول میں زندہ رہ ہی نہیں سکتے۔ یہاں آ جائیں اور اپنے من پسند شہر میں بسیرا فرمائیں۔ آپ کو ہر سہولت بہم پہنچائی جائے گی۔ پاکستان کا ماحول تو گھٹن کا شکار ہونے کی وجہ سے جوہڑ کے پانی کی طرح متعفن ہو چکا جبکہ بھارت میں ہر مسلک کے لوگ سکون سے رہ رہے ہیں۔"

"پنڈت جی! وہ تو سب ٹھیک ہے مگر یہ بھی تو سوچیں کہ مچھلی پانی ہی میں خوش رہتی ہے خواہ وہ پانی گندے جوہڑ کا ہی ہو۔ یہاں کے باغ و بہار ماحول میں تو ہم ایک سانس بھی نہیں لے سکیں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ وہ تم وہاں ہی خوش ہیں۔"

www.paksociety.com

خاں صاحب سے آتش فشاں کے ایڈیٹر منیر احمد منیر نے انٹرویو کیا۔ میں صرف اس کا متن بیان کر کے اجازت لوں گا۔ یہ انٹرویو تاریخ کا حصہ ہے۔

یحییٰ خاں نے ایک سوال کے جواب میں کہا: ''ڈاکٹر مالک صاحب اس وقت مشرقی پاکستان کے گورنر تھے اور جنرل نیازی ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور وہاں کے خودمختار کمانڈر۔ ڈاکٹر مالک نے مجھے سگنل دیا کہ مشرقی پاکستان کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی ہے اور بھارتی بمبار تباہی مچا رہے ہیں۔ اس بات کا اعادہ نہایت ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کی سرحد پر بھارت کے ۶ ہوائی اڈے تھے۔''

یحییٰ خاں صاحب نے یہ بھی کہا کہ جب نیازی نے ہتھیار ڈال دیے تو میں نے اسے فون پر پوچھا کہ یہ تم نے کیوں کیا؟

تو جواب ملا کہ مجھے گورنر ڈاکٹر مالک نے حکم دیا تھا۔ گویا ڈاکٹر مالک کے سوا سارے معصوم تھے نہ تو بھٹو کا قصور تھا نہ یحییٰ خاں کا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اسے کہتے ہیں رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

آخر ہم نے طے کر لیا۔ دیوان صاحب نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ وہ بھارت کی فضا میں سانس لینا گوارہ نہیں کریں گے اس طرح ہم اکیاب سے ہوتے ہوتے کولمبو پہنچے۔

ڈھاکا سے تو ہم اکٹھے ہی نکلے مگر ہماری منزل ایک نہیں تھی۔ دیوان صاحب نے سعودی عرب مجھے کراچی اور مہندر کو بمبئی جانا تھا۔ اس نے عمداً اپنی جہاز میری پرواز کے بعد رکھی کیونکہ وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر آخر تا یہ کہ یہاں ہر شخص تنہا ہی آتا اور جاتا ہے۔ افسوس یہ ہے بعدازاں میں جب حج کرنے سعودی عرب گیا تو دیوان صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں وہاں ۱۹۸۱ء میں گیا مگر وہ ۱۹۸۰ء میں انتقال فرما چکے تھے۔ البتہ ان کے ایک عزیز دیوان عبدالباسط صاحب سے میں ضرور ملا جو مکہ کے محلہ فصلہ میں رہائش پذیر تھے۔

میں نے مشرقی پاکستان کی سرزمین سے محبت کی اور اسے کھو بیٹھا۔ زیب نے مجھ سے محبت کی اور وہ جل کر راکھ ہو گئی۔ گویا میں محب اور محبوب، دونوں سے محروم ہو کر بالکل خالی ہاتھ ہو گیا۔ اسی لیے طویل عرصے مجھ پر بے خبری طاری رہی جس نے مجھے نفع نقصان سے بے نیاز رکھا۔ بقول ولی دکنی ؎

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ تو رہا نہ وہ میں رہا جو رہی تو بے خبری رہی

اختر حسین شیخ

۱۹۳۳ء میں فیض باغ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں پائی۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان ایئرفورس سے بحیثیت ایسوسی ایٹ انجینئر وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء میں امریکہ چلے گئے۔ ریڈار کی تنصیب و مرمت کرنے میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ ۶۳ء میں واپس آ کر سکیسر، بدین، شورکوٹ میں ریڈار سٹیشن لگائے اور چلائے۔ پھر متحدہ عرب امارات بھجوا دیے گئے۔ ۷۴ء میں گئے اور ۸۹ء میں واپسی ہوئی۔ وہاں ان کے میزائل پروگرام کو سپروائز کیا۔ وہاں سے فرانس بھجوائے گئے۔ جہاں ٹیکٹیکل میزائل کی تعلیم پائی۔ بحری جہازوں کو گیزاٹ میزائل لگائے۔ ۳۰ ملین ڈالر کا خرچہ ہوا۔ پھر تین سال امارات میں رہے۔ وہاں سے ۳ میزائل عراق پہ چلائے گئے تو احتجاجاً مستعفی ہو گئے اور قید میں ڈال دیے گئے۔ ۱۹۹۲ء میں پہلی کہانی استوار زمان لکھی۔ جنت سوزاں لکھی جس پہ انکار وادی ڈراما بنا لیا گیا تھا۔ ۱۵۰ کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ کتابوں میں داستان شہ زوراں، اللہ لوک، غزوات و سرایا شامل ہیں۔

یادِ رفتگاں

ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم

استاد الانام سلیم احمد

اسلام اور پاکستان پر
جان چھڑکنے والے ایک
نامور ادیب کی درویشانہ حیات
عیاں کردینے والی قلمی جھلکیاں

محمود احمد لئیق

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

سلیم احمد ۱۹۲۷ء میں یوپی کے ایک ضلع بارہ بنکی کے گاؤں کھیولی میں پیدا ہوئے۔ یاد رہے کہ ضلع بارہ بنکی وہ مشہور ضلع ہے جس نے خمار بارہ بنکی اور سرور بارہ بنکی جیسے عظیم شاعر پیدا کیے۔ ان کا شاعرانہ مرتبہ ان دونوں کے ایک ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔ خمار کا شعر ہے۔

بھولے ہیں رفتہ رفتہ انہیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزا ہم سے پوچھیے

سرور کا شعر ہے۔

وہ مرے خون آرزو سے
رنگ تو آ گیا فسانے میں

سلیم احمد صرف شاعر نہ تھے ہمہ صفت اور ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کی اپنی فیلڈ یا حدود ہوتی ہیں جن میں وہ طبع آزمائی، نقاد، تنقید، افسانہ نگار، افسانہ لکھتے ہیں، اسی طرح ڈرامہ نگار اور قلم لکھنے والے اپنی اپنی حدود میں مصروف رہتے ہیں۔

دوسری طرف شاعری پر نظر ڈالیں تو کسی کی وجہ شہرت مسدس ہے، کسی کی مرثیہ نگاری ہے، کوئی مثنوی کا شاعر ہے، کسی نے ساری زندگی نعت اور حمد لکھنے میں صرف کی، کوئی نظم کا شاعر ہے اور کوئی غزل کا، ان لوگوں میں سے اکثر نے دوسری اصناف میں بھی کاوشیں کیں لیکن جو پذیرائی اور شہرت اپنی صنف میں حاصل ہوئی وہ دوسری اصناف میں حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن سلیم احمد ان سب اصناف پر حاوی تھے، کیا تنقید، کیا ڈرامہ، کیا اخباری کالم، کیا فلم، جبکہ شاعری میں نظم، کیا غزل کیا سب پر طبع آزمائی کی اور ان سب کا معیار یکساں تھا، وہ ہرفن مولا (Jack of all trades) نہ تھے بلکہ استاد الاتمام (Master of all) تھے اور زمانے نے اسے تسلیم کیا ہے۔ میرا مطالعہ بہت محدود ہے، اہل علم کو چاہیے کہ اس بات کی تلاش کریں کہ اردو میں دوسرا کوئی ان کا ہم پلہ بھی ہے یا؟

کوئی پوچھتا نہیں ہے قصیدے کے یار کا

سلیم احمد کے بارے میں نصراللہ خان فرماتے ہیں "قلم کاغذ سامنے رکھ دو اور جو جی چاہے لکھوا لو، ہمہ وقت اور آخری دم تک لکھتا اور اپنے قلم سے جہاد کرتا رہا لیکن اس کی تحریر میں کہیں تکان کے آثار نہیں پیدا ہوئے اور کہیں جھول نہیں آیا۔"

ساقی فاروقی فرماتے ہیں کہ سلیم احمد نزاعی بھی تھے، انہوں نے نزاعی کا مطلب لکھا ہے کہ جو حال کے بہتے ہوئے دھارے کی مخالف سمت چلتا ہے۔ فی الحال ہم ان کے بتائے ہوئے اسی مطلب کو تسلیم کرتے ہوئے کہیں گے کہ اہل علم جانتے ہیں، دھارے کے مخالف چلنا کتنا کٹھن اور دشوار ہے خاص کر جب پے در پے فوجی حکومتوں کا راج ہو۔ حکومت کی تائید میں لکھنے والوں کی حد تک تو کہا جا سکتا ہے کہ اس عاشقی میں عزت سادات تو گئی لیکن میر خوار نہ ہوئے، لوگوں نے ایسے حکمرانوں کو پوچھنا بلکہ پوجنا بھی شروع کر دیا، یہ لوگ مراعات اٹھانے کے عادی ہو گئے۔ ادیب اور شاعر کی بنیادی ذمے داری یہ بھی ہے کہ عوام کو بیدار کرے اور اپنے عمل اور کردار کو بے داغ رکھے لیکن اب تو ایسے دیدہ ور کے لئے نرگس کو ہزاروں سال رونا پڑے گا، اس لیے کہ

سب جا رہے ہیں سایۂ دیوار کی طرف

طاہر مسعود لکھتے ہیں "وہ جامع الکمالات شخص تھے، وہ ایک آدمی تھے لیکن ان کے اندر کئی آدمی جمع ہو گئے تھے، وہ بیک وقت شاعر تھے، مصلح تھے، نقاد، ڈرامانگار تھے، کالم نگار اور روایت پسند (Conversationalist) تھے، انہوں نے اپنی شخصیت کا اظہار کئی مختلف سطحوں پر ظاہر کیا اور ان کی ہر سطح اتنی بلند ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ نقاد زیادہ اچھے تھے یا ڈرامانگار، ان میں شاعر زیادہ وہ توانا تھا یا مصلح اور ریفارمر، لیکن ان کی تمام حیثیتوں میں جو چیز مشترک تھی وہ ان کی صداقت اور راست بازی تھی، جس نے دوستوں کے ساتھ دشمنوں کو بھی گرویدہ بنایا ہوا تھا۔" جگر کا یہ شعر ان پر

صادق آتا ہے۔

وہ نوائے عاشقی ہو یا ادائے دلبرانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

یہ کوئی راز نہیں ہے تاہم بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ انہوں نے ایک فلم بھی لکھی جسے طاہر مسعود نے پاکستان کی پہلی جاسوسی فلم قرار دیا ہے۔ نام ہے ''راز''۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی۔ ۱۹۸۲ء یا ۱۹۸۳ء میں دوحہ مشاعرے کے لیے تشریف لائے اور اس خاکسار کو ان سے استفادے کا بھرپور موقع ملا۔ انہوں نے بتایا کہ اس فلم کی کامیابی کے بعد فلم کے ڈائریکٹر سے انہوں نے کہا کہ اب تم پی ڈبلیو ڈی (PWD) مت بن جانا۔ اس سے ان کی مراد تھی Producer, writer, director۔ اس کے بعد وہ ''لیکن'' کہہ کر خاموش ہوگئے۔ طاہر مسعود لکھتے ہیں کہ وہ عمر بھر ان چیزوں کو ''سیٹھ کا مال'' کہہ کر پیچھا چھڑاتے رہے۔

انہوں نے ڈرامے لکھے اور فیچر بھی۔ بعض مزاحیہ پروگرام بھی لکھے۔ نصر اللہ خان نے جب ریڈیو سے ''دیکھتا چلا گیا'' شروع کیا تو سلیم بھائی نے ریڈیو کا مزاحیہ پروگرام ''منت کا جھگڑا'' لکھا جو ثابت کرتا ہے کہ ان میں طنز و مزاح بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ہر نیا پروگرام سلیم ہی سے لکھوایا جاتا۔ اس کے علاوہ ریڈیو کے لئے فیچر، تمثیلچے اور خاکے بھی تحریر کیے۔ اسٹوڈیو نمبر ۹ کے لیے بے شمار ڈرامے تحریر کیے جن میں موسم اور محبت، شاہراہ حیات، خودکشی، یہ کسی کی لاش ہے، ایسا چکر کرکے چلو، ستارہ، چکر اور نغمانہ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ٹی وی کے لیے بھی ڈرامے لکھے۔ ریڈیو سے لکھے گئے تاریخی ڈرامے چنگیز خان، تیمور، جھوٹا دیوتا، صلاح الدین ایوبی اور البرامک جیسے معرکۃ الآرا ڈرامے شامل ہیں جبکہ ٹی وی کے تاریخی سلسلہ وار ڈرامے تعبیر، چنان اور شاہین بھی اسی سلسلے کی نشانیاں ہیں۔

سلیم بھائی نے اخبار کے لیے کالم بھی لکھے۔ روزنامہ حریت اور روزنامہ جسارت ان اخبارات میں شامل ہیں۔ حریت کے ایڈیٹر نے ان سے کئی بار کہا کہ وہ ایک آدھ دن کی چھٹی کر لیا کریں لیکن انہوں نے کہا کہ پھر اس دن میں کیا کروں، میں لکھتا نہیں ہوں تو پریشان رہتا ہوں، بیمار ہوجاتا ہوں، یعنی سلیم احمد لکھتے رہے۔ یہی آخری سانس تک یہی لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔

آغا ناصر لکھتے ہیں ''ریڈیو کے لیے لکھنے والوں میں اور صلاحیتوں کے علاوہ زود نویسی ایک لازمی وصف سمجھا جاتا ہے، اچھا لکھنا وقت کے دورانیے کے مطابق لکھنا اور جلدی لکھنا ایک ریڈیو اسکرپٹ رائٹر کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سلیم احمد میں یہ تینوں خصوصیات موجود تھیں۔ میں نے ان کو ایک گھنٹے کا اسکرپٹ ایک گھنٹے میں مکمل کرتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا کہ کسی خاص موضوع پر فوری طور پر لکھنا پڑ گیا تو سلیم احمد نیچے دفتر کی میز پر بیٹھے ایک ایک صفحہ لکھتے جا رہے ہیں اور ہم اوپر اسٹوڈیو میں اس فیچر کی لائیو براڈکاسٹ کرنے میں مشغول ہیں۔ اس طرح کہ نئے لکھے ہوئے صفحات نیچے سے آتے رہے اور پروگرام نشر ہوتا رہا...... جبکہ ڈرامے لکھنے کے لیے سلیم احمد کو سکون اور لمبے وقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ کام وہ گھر پر کرتے تھے۔ کسی جگہ وہ معیار سے نیچے نہیں اترتے تھے۔''

زندگی سے سلیم احمد کے بہت زیادہ مطالبات نہیں تھے۔ دنیاوی نقطۂ نگاہ سے ان میں وہ عیب اور کمزوریاں نہیں تھیں جن کے باعث لوگ بدنام ہوتے ہیں...... صحیح معنوں میں وہ درویش صفت انسان تھے، جو مل گیا وہ کھا لیا جو دیا وہ پہن لیا۔ ہاں شوق تھا تو شعر و ادب کا، مشاعروں میں شرکت کرنا، ادبی معرکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔

جمیل جالبی لکھتے ہیں ''میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں فرسٹ ایئر کے طالب علم اور ادب کی دنیا میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دن رات یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی موضوع سخن تھا اور یہی مقصد زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی نئی کتابیں پڑھتے، تبادلہ خیال کرتے اور گھنٹوں انہی مسائل میں گم رہتے۔ وہ اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے، اپنی زندگی کے اس زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے تھے۔ کبھی کرشن چندر

کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی اور کبھی منٹو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادب لطیف تخلیق کرتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سیکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کتابیں پڑھیں، اس کاوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق نکھر گیا۔''

ریاض فرشوری نے سلیم احمد کے پہلے شعری مجموعہ ''بیاض'' کے دیباچہ میں لکھا ہے ''اس جنگل میں سلیم احمد کو کہاں تلاش کریں گے۔ سلیم احمد جو ایک بڑا غزل گو شاعر ہے، جو بہت اچھا ڈراما نگار ہے، جو تنقید میں اصولی معاملات پر امام غزالی کی طرح خنجر کھینچے بیٹھا رہتا ہے، جو ایک بڑے خاندان کا تنہا کفیل ہے، جس نے دوستوں سے ایذا اٹھانے کے بعد بھی انھیں دعائیں دی ہیں...... جس طرح خوشبو کو، روشنی کی کیفیت کو، اچھلتے ہوئے سمندروں کی جھلاہٹ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

سلیم احمد کے مجموعہ ''چراغ نیم شب'' کے دیباچہ میں جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا، سراج منیر لکھتے ہیں ''سلیم احمد کی شخصیت کے اتنے پہلو اور اتنی جہتیں ہیں کہ ان کے درمیان ایک مرکزی اصول دریافت کرنا پہلی نظر میں مشکل ہوتا ہے اور اگر آپ ایک مرتبہ وہ اصول دریافت کر لیں تو پھیلے ہوئے دھبوں اور غیر مربوط لکیروں کا یہ معمورہ ایک وسیع تصویر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نقاد، شاعر، کالم نگار، ڈراما نگار، فلم رائٹر، مناظرہ باز، سیاسی تجزیہ نگار اور سب سے بڑھ کر اپنے کمرے میں احباب کے رخصت ہو جانے کے بعد صبح تک کمرے میں ٹہل ٹہل کر سگریٹ پھونکتا ہوا سوچ کو زندگی بنانے کے عمل سے گزرنے والا بدقسمت آدمی۔ اس ایک ذات میں سیکڑوں پہلو باہم دست و گریباں ہیں۔ سلیم احمد ان سب کو سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ (دہلی میں ایک مشاعرے کے موقع پر اس خاکسار کو انھیں سگریٹ پیتا دیکھنے کا موقع ملا، مٹھی بند کر کے وہ اس طرح کش لگاتے کہ چار کش میں سگریٹ کا قلع قمع کر دیتے۔ وجہ شاید یہ تھی کہ کم سے کم وقت میں ہر کام انجام دینے کی عادت مزاج کا حصہ بن گئی تھی)۔''

ان کے مجموعہ غزل ''چراغ نیم شب'' کے فلیپ پر ان کے بھائی شمیم احمد رقم طراز ہیں:

''چراغ نیم شب میں ۱۹۸۲ء سے لے کر اگست ۱۹۸۳ء تک کے عرصے کی غزلیات شامل ہیں۔ یہ بھائی صاحب کی تخلیقی زندگی کا بڑا اہم دور ہے۔ اس مختصری مدت میں انھوں نے نظم و نثر میں جتنا لکھا، اتنا کبھی نہیں لکھا، آخری برسوں میں ان میں ایک عجیب سی غیر معمولی خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے بس دو تین سال میں سب کچھ کر دکھانا ہے۔''

شمیم احمد مزید لکھتے ہیں ''ان کی ابتدائی غزلوں کے ارتقائی مراحل ان کی پوری زندگی پر محیط ہیں، ابتدا میں انھوں نے رومانی انداز کی غزلیں کہیں، پھر اقبال کا اثر قبول کیا اور ۱۹۴۷ء میں میر، حسرت، اور فراق کے رنگوں کا ان کی شاعری پر نمایاں اثر ہوا۔ ساتھ ہی انھوں نے کلاسیکی غزل کے ہر منفرد شاعر سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کی اور شعوری طور پر انھیں دوبارہ دریافت کرنے کی سعی جاری رکھی۔ اس طرح ان کی شاعری میں سودا اور آتش سے لے کر یگانہ تک کئی رنگ مل جائیں گے۔''

ذیل میں ان کی غزلوں سے انتخاب پیش ہے:

سمندر چیختا رہتا ہے پس منظر میں اور مجھ کو
اندھیرے میں اکیلے ساحلوں سے ڈر نہیں لگتا
یہ ممکن ہے وہ ان کو موت کی سرحد پہ لے جائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

دلوں میں درد بھرتا آنکھ میں گوہر بناتا ہوں
جنھیں مائیں پہنتی ہیں میں وہ زیور بناتا ہوں
سلیم وقت کے کٹنے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

روز مل کر بھی کم نہیں ہوتا
دل میں وہ فاصلہ ہے برسوں سے

خیر و شر کی خبروں کو مانتے تو سب ہی ہیں
کس کو ہوش رہتا ہے جبر اور ضرورت میں
دونوں درد دیتی ہیں آہ سرد دیتی ہیں

www.paksociety.com

فرق کچھ نہیں ایسا نفرت و محبت میں
تمام عمر کا حاصل سراب شہرت میں

مرا قصور یہی تھا کہ سوچتا تھا میں
مجھے گلہ نہ کسی سنگ کا نہ آہن کا
اسی نے توڑ دیا جس کا آئینہ تھا میں

دکھ دے یا رسوائی دے غم کو مرے گہرائی دے
جتنا آنکھ سے کم دیکھوں اتنی دور دکھائی دے

کیا بتاؤں کیوں ہوئی مجھ کو شکست
میرا دشمن تھا مرے لشکر کے بیچ

جو سود و زیاں کی فکر کرے
وہ عشق نہیں مزدوری ہے

در بدر کی ٹھوکریں کھائیں تو یہ معلوم ہوا
گھر کسے کہتے ہیں کیا چیز ہے بے گھر ہونا

تم تو دشمن بھی نہیں ہو کہ ضروری ہے سلیم
میرے دشمن کے لیے میرے برابر ہونا

جانے کسی نے کیا کہا تیز ہوا کے شور میں
مجھ سے سنا نہیں گیا تیز ہوا کے شور میں
کشتیوں والے بڑھتے رہے بھنور کی سمت
اور میں چیخ رہا تیز ہوا کے شور میں

وہ انصاف پسند تھے چاہے ایک فریق ان کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ ایک مسئلے میں بھائی شمیم اور ساقی فاروقی متقابل تھے۔ ساقی نے انہیں منصف بنایا اور جب اپنا موقف ثابت کر دیا تو انہوں نے فیصلہ سنا دیا جو بھائی کے خلاف تھا۔ شمیم نے زور زور سے ہچکیاں لے کر رونا شروع کیا۔ لیکن سلیم احمد فیصلہ دے چکے تھے۔ شمیم دس دنوں کے لیے بغیر اطلاع کے گھر سے غائب رہے۔ سلیم خاں انہیں میر پور خاص یا حیدر آباد سے ڈھونڈ کر لائے۔ اس تنازع کی وجہ بیان کرنا مناسب نہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ازل سے جو تین تنازعے چلے آرہے ہیں یعنی زن، زر اور زمین میں سے ایک تھا۔ یہ واقعہ ساقی فاروقی نے اپنی سوانح حیات "پاپ بیتی" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ (دروغ برگردن راوی)

ڈائریکٹ

بحری جہاز میں سفر کے دوران ایک صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ جو کچھ بھی کھاتے، قے ہو جاتی۔ رات کو جہاز کے ریستوران میں بیرے نے پوچھا "جناب! آپ کے لیے کھانا لاؤں؟"
"بھئی مجھے کیوں زحمت دیتے ہو۔ جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر کھانا ڈائریکٹ ہی سمندر میں پھینک دو۔" ان صاحب نے بیزاری سے جواب دیا۔
(عمیر بیگ، لاہور)

سلیم بھائی ۱۹۸۳ء میں اس سفر پر روانہ ہو گئے جس پر ہم سب کو جانا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

زندگی کے ۵۶ برسوں میں وہ کام کر گئے جو کئی اداروں اور ادیبوں کا کام ہے حالانکہ ان برسوں میں وہ ۳ مرتبہ ذہنی خلفشار (Nervous break down) کا شکار ہوئے اور کافی عرصہ صاحب فراش رہے۔

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

پھر وہ صحت مند ہو گئے اور زندگی کے کاموں میں اسی طرح جت گئے جس طرح آپ اور میں۔

اب دوسری مرتبہ کے نروس بریک ڈاؤن کی داستان آغا ناصر سے سنیے "یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ اپنے مخصوص انداز میں میرے دفتر میں میری سامنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ جب وہ دونوں پاؤں اوپر رکھنے کے بجائے زمین پر رکھتے تو ایک پاؤں مسلسل ہلاتے رہتے۔ اسی طرح ان کے ہونٹ بھی ہلکے ہلکے کانپتے رہتے جیسے دانتوں سے کچھ چبا رہے ہوں۔ یہ سب ایک بے چینی اور اضطراب کا اظہار ہوتا

تھا۔ سلیم احمد کے جسم میں ایک بے چینی اور اضطراب برپا رہتی تھی اور ایک دن جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، یہ رو بے قابو ہو گئی۔ میرے عین سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے سلیم احمد اپنی پوری قوت سے چلائے۔ ان کی آنکھیں لہو کی طرح سرخ ہو گئیں، ان کا سارا بدن کانپنے لگا اور وہ بلند آواز میں چیختے رہے۔ ساتھ کے کمروں اور راہداری سے لوگ دوڑتے ہوئے میرے کمرے میں آئے۔ سلیم احمد نے میز سے ایک پیپر ویٹ اٹھایا اور پوری طاقت سے سامنے کھڑکی پر کھینچ مارا، شیشہ چکنا چور ہونے کی آواز دور تک گئی۔

''میں ان کے سامنے بیٹھا ایک شدید ذہنی صدمے سے دوچار تھا۔ وہ مسلسل چلاتے رہے، ایک لفظ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے، کیا چاہتے ہیں۔ گفتگو مکمل طور پر بے ربط تھی اور آواز انسانی اختیار سے زیادہ بلند تھی۔ وہ شدید جلال کے عالم میں تھے۔ لوگوں نے بہ مشکل انہیں قابو کیا اور ریڈیو اسٹیشن سے لے گئے۔ یہ سلیم احمد کی اس مشہور بیماری کا آغاز تھا، جس میں وہ طویل عرصہ مبتلا رہے۔ عزیزوں، رشتے داروں نے علاج معالجے کے لیے ہسپتالوں اور خصوصی معالجین کی طرف رجوع کیا۔ بالآخر وہ نجی ماہرین کے مشورے پر کچھ عرصے کے لیے کوئٹہ چلے گئے، جہاں قیام کے دوران ان کا علاج ہوتا رہا اور پھر وہ کچھ صحت مند حالت میں واپس آ گئے۔ اب وہ بدلے ہوئے سلیم احمد تھے، جسمانی اور ذہنی دونوں طرح سے۔''

یہ بتانا مقصود تھا کہ اپنی ۵۶ سالہ زندگی میں وہ ۲ مرتبہ طویل عرصے کے لیے لوح و قلم سے دور رہے، اس کے باوجود اتنا کام جو چھوڑ گئے، اسے ایک معجزہ کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۷ء کی فوجی بغاوت کے بعد بائیں بازو کے ادیبوں میں خود ساختہ جلا وطنی کا شوق مقبولیت حاصل کر گیا تھا۔ ان میں بڑے بڑے شاعر اور بعض ایسی شاعرات جن کے کلام میں نفسانی خواہشات کی تشنگی کا اظہار کیا گیا تھا، شامل تھیں۔ وہ ملک چھوڑ کر بھارت جا چکے تھے اور وہاں انہوں نے یوں تاثر دیا جیسے پاکستان میں ان کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے اس لیے وہ بھاگ کر آئے ہیں۔ اس پر ان کا تبصرہ تھا: ''یہ صرف حکومت کے خلاف نہیں، یہ پاکستان کے خلاف ہیں اور پاکستان سے ان کی وجہ مخاصمت اسلام ہے۔ انہیں وہ پابندیاں پسند نہیں جو اسلام فرد پر عائد کرتا ہے۔''

ان سے دوسرا سوال پوچھا گیا ''یہ لوگ کسی موقع پر پاکستان واپس آنا چاہیں تو انہیں آنے کی اجازت دینی چاہیے یا نہیں۔'' سلیم احمد کا جواب تھا ''وہ دوبارہ پاکستان واپس آنا چاہیں تو انہیں بے شرمی کی زندگی کے لیے آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔'' ان کا جواب یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں انتقامی کارروائی پسند نہ تھی۔ وہ حکومتی قدغن کے خلاف تھے لیکن ساتھ ہی جلاوطنی انہیں پسند نہ تھی، وہ بھی اپنے ازلی دشمن کی چھاؤں میں۔ ان کے خیال میں شعروادب پڑھنے والے کو بالغ اور نڈر ہونا چاہیے۔ اپنے بارے میں وہ کہتے کہ انہوں نے جو کچھ کہا، بے خوفی سے کہا ہے۔ نہ وہ خودستائی کے عادی تھے اور نہ ہی مبالغے کی حد تک انکسار پسند۔ ان کا کہنا تھا کہ انکسار کے معنی میری لغت میں یہ کبھی نہیں رہے کہ کسی انسان پر وحی آئے اور ابوجہل کی دل جوئی کی خاطر انکسار سے انکار کر دے، جس پر وحی آئے اسے وحی کا دعویٰ کرنا چاہیے۔ انکسار کے صرف ایک معنی ہیں، اپنی حیثیت کو پہچاننا۔ آدمی کچھ لوگوں سے بڑا اور کچھ لوگوں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے جاننا چاہیے کہ کس سے بڑا اور کس سے چھوٹا ہے۔ پھر ان کے حسب مراتب کے مطابق ان سے سلوک کرنا چاہیے۔

اسلم فرخی جنھوں نے کم و بیش ۳۵ سال سلیم کے ساتھ بسر کیے، سلیم احمد پر اپنے خاکے میں انہوں نے لکھا ''میں نے سلیم کو کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ خود کسی کو مرعوب کرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں موہنی تھی، لوگ خود بخود کھنچے آتے تھے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۸۳ء تک سلیم سے تعلقات رہے مگر میں نے اس کی زبان سے کوئی ناشائستہ بات، بے ہودہ جملہ یا کسی کی برائی نہیں سنی۔ وہ ایک شفیق باپ، محبت کرنے والا بھائی اور ایک خدمت گزار بیٹا تھا۔ دوستوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ مثالی تھا۔''

افتخار عارف اپنے ایک انٹرویو میں جو مرحوم حسن رضوی نے لیا تھا اور جنگ لاہور میں شائع ہو چکا (بعد میں اسے کتابی

شکل دی گئی اور ''گفت و شنید'' کے نام سے شائع ہوا) فرماتے ہیں ''پاکستان میں جن لوگوں کا ساتھ اور ان سے ہم نے بہت کچھ سیکھا، ان میں سلیم احمد کا نام نہ لینا احسان فراموشی کے مترادف ہوگا...... شعر گوئی میں اگر ہم نے کسی سے سیکھا تو وہ سلیم احمد کی ذات تھی اور یقین کیجیے ہم نے ان سے بہت سیکھا۔''

مزید کہتے ہیں ''دراصل میں نے ان سے لفظ جوڑنا سیکھے۔'' ممتاز شاعرہ اور ادیب کشور ناہید اپنی کتاب ''شناسائیاں، رسوائیاں'' میں لکھتی ہیں ''اس زمانے میں کراچی جانا ہوتا تو سلیم احمد کے گھر نشست لازم ہوتی...... مذاق بھی ہوتا کہ سلیم بھائی جماعت کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور میں ان کی بیری تھی مگر وہ مجھے بہت مان دیتے، محبت کرتے تھے۔''

سلیم بھائی میں رعونت نام کو نہ تھی اور نہ ہی وہ کسی کی حیثیت یا رتبے سے متاثر ہوتے تھے۔ وہ مارشل لا کے دنوں میں مختصر عرصے کے لیے وزارت اطلاعات کے مشیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں انتخابات کے بعد پورے ملک میں احتجاج، سول نافرمانی اور پھر مذاکرات کا دور شروع ہوا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ فوج نے ایک کامیاب بغاوت کے بعد اقتدار سنبھال لیا۔ فوجی حکومت نے کچھ عرصے بعد سول کابینہ تشکیل دینے کا عزم کیا اور پچھلی سول حکومت کے مخالفین کو شریک کر لیا۔ وزارت اطلاعات، جماعت اسلامی کے حصے میں آئی جس کے لیے سلیم بھائی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وزیر اطلاعات نے انھیں مشیر نامزد کیا۔ آغا ناصر ریڈیو کے دور میں ان کے پروگراموں کے انچارج کے طور پر ان کے افسر تھے لیکن ان کا طرزعمل سلیم بھائی سے چھوٹے بھائی کا سا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سلیم احمد میرٹھ میں ان کے بڑے بھائی کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ آغا ناصر لکھتے ہیں ''وہ مختصر عرصے کے لیے مشیر مقرر ہوئے تو ہماری تفصیلی ملاقات ہوئی۔ میں کراچی دورے پر گیا ہوا تھا کہ سلیم کا پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ یہ ان کے انچولی والے مکان میں میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

میں نے ازراہِ مذاق ان سے کہا کہ اب تو آپ ہمارے افسر ہو۔ مشیر اطلاعات کا حکم ہمارے لیے وزیر اطلاعات کے حکم کے برابر ہے۔ بڑے پیار سے میرے گالوں کو تھپتھپایا اور مجھے سینے سے لگایا کہ آغو! تم میرے لیے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح رہے۔ اس وقت بھی جب تم میرے افسر تھے اور اس وقت بھی جب میں اس وزارت کا مشیر ہوں۔ اس سے قبل کی پہلی ملاقات کے بارے میں آغا ناصر مزید لکھتے ہیں ''پہلی ملاقات میں، میں نے ان کو اور انھوں نے مجھے پسند کیا اور پھر رفتہ رفتہ یہ پسندیدگی اپنائیت اور پھر محبت میں تبدیل ہوئی، مگر ان کی محبت میں شفقت کا پہلو بھی تھا۔''

دوستوں کے ساتھ ان کے خاندان کا طرزعمل بھی شفقت اور محبت کا تھا۔ ان کی والدہ کو سب انھی کی طرح آپا کہا کرتے تھے۔ ان کی بہن زاہدہ اور ان کے بھائی شمیم کو بھی سب اپنے بھائی بہن کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ سلیم احمد بھی اپنے دوستوں سے اسی طرح ملتے تھے۔

ساقی فاروقی کے نام ایک خط میں لکھا ''ہم لوگوں سے نہیں تو اپنی تینوں ماؤں سے ملنے ہی آجاؤ۔''

تینوں ماؤں سے مراد ساقی فاروقی کی ماں، اطہر نفیس کی ماں اور مرحوم کی اپنی ماں تھیں۔ مرحوم نے اپنے دوستوں کو پیار کے نام دے رکھے تھے۔ ساقی فاروقی کو ستو کہتے تھے، آغا ناصر کو آغو اور کبھی آغا خان، اکثر کے نام کے ساتھ خان لگا دیتے، جواباً ساتھی انھیں سلیم خان کہہ کر پکارتے تھے۔

سلیم بھائی صرف شاعر اور ادیب نہ تھے بلکہ انسانیت، رواداری اور شرافت کا حسین پیکر تھے۔ ان کے لیے کہا جا سکتا ہے۔

جب باتیں ان کی سنیے گا
تو دیر تلک سر دھنیے گا

(اس مضمون میں نصراللہ خان کی کتاب ''کیا قافلہ جاتا ہے''، آغا ناصر کی کتاب ''گمشدہ لوگ''، ساقی فاروقی کی کتاب ''پاپ بیتی'' اور طاہر مسعود کی کتاب ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔)

www.Paksociety.com

محبت فتح عالم

قرض

www.paksociety.com
www.Paksociety.com

رات

آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی۔ جب کافی وقت گزر گیا تو اجمل پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اسے نیند آ رہی تھی مگر وہ سو نہیں سکتا تھا بلکہ چوکنا ہو کر بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسے جاگ رہا تھا جیسے کوئی پہریدار ہو۔ مسلسل جاگنے سے اس کا جسم بھی نڈھال ہو رہا تھا۔ اجمل کو ساری رات اونگھ کر گزارنی تھی۔ یہ بظاہر مشکل کام تھا مگر اسے خود کو نیند سے بچانا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر آج بھی اسے نیند آ گئی اور اسی حالت میں اس کا پیشاب نکلا تو بستر خراب ہو جائے گا اور صبح ابو اودھم مچا دیں گے۔ اسی لیے وہ جمائیاں لیتا اور جاگتا رہا۔ اسے کھٹکا لگا رہا کہ سو گیا تو پیشاب نکل جائے گا جس کے نتیجے میں صبح خوب مار پڑے گی۔

کل صبح جب ابو کے شور مچانے پر وہ جاگا تو اس کے ابا کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ انھوں نے اجمل کو گالیاں دیں تو اس کا لہو خشک ہونے لگا۔ ابو زوردار آواز میں کہنے لگے۔ "بے شرم، بے حیا، تجھے شرم نہیں آتی کہ ۱۰ برس کا ہو گیا اور روزانہ رات کو پیشاب سے بستر بھر دیتا ہے۔"

گھر میں ابو کا رعب داب بہت تھا۔ اسی تیز مزاجی کی وجہ سے سب گھبراتے تھے۔ اس کے ابا نے پھر اسے گھونسا رسید کیا۔ اجمل ابا کے پاؤں پکڑ کر منتیں کرنے لگا، مگر منت سماجت اور آنسوؤں سے بھی ان کا دل نہ پسیجا۔ انھوں نے اجمل کو ایک اور گھونسا رسید کیا جو اس کے پیٹ میں جا لگا۔ اجمل چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کے باوجود انھوں نے تابڑتوڑ چھڑیاں بھی برسائیں۔

بے ہوش ہونے سے پہلے اجمل نے زوردار چیخ ماری، مگر باپ کو ذرا تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ گالیاں بکتے ہوئے بستر سے باہر چلے گئے۔ انھیں ذرا بھر احساس نہ تھا کہ بیٹا بے ہوش اور بے سدھ پڑا ہوا ہے۔ وہ باہر جاتے ہوئے اجمل کی ماں کو کہہ گئے کہ اگر اس نے آج بھی بستر پر پیشاب کیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا اور اسے گھر سے بھی نکال دوں گا۔

اجمل کی امی اس صورت حال سے آزردہ اور غمگین تھیں۔ جب اجمل کے ابا اس پر چھڑیاں برسا رہے تھے تو ان کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اپنے خاوند کو منع بھی نہیں کر سکتی تھیں، کیونکہ انھیں علم تھا کہ وہ اور زیادہ طیش میں آ جائیں گے۔ انھوں نے اجمل کو ہوش میں لانے کی کوشش کی تو کچھ دیر بعد وہ جاگ گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی خوف سے اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اجمل کی آنکھوں کے سامنے دوبارہ وہی منظر دوڑنے لگا۔ جب وہ چیخ رہا، چلا رہا اور اپنے ابا کے پاؤں پکڑ کر منتیں کر رہا تھا مگر انہیں اس پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ وہ غصے سے چہرہ سرخ کیے اس پر چھڑیاں برسانے میں مصروف رہے۔

اجمل کے ہوش میں آنے کے بعد امی نے اسے بہت پیار کیا۔ ماں کو اپنے تینوں بیٹوں سے پیار تھا۔ اجمل چونکہ سب سے چھوٹا تھا، اسی وجہ سے سب کو پیارا لگتا۔ ابا بھی اس کو بہت چاہتے اور پیار کا اظہار کرتے مگر جب سے اجمل کا بستر پر پیشاب نکلنے لگا تھا، ان کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔ ان کا رویہ اجمل کے ساتھ خواہ مخواہ جارحانہ ہو گیا۔ ویسے بھی وہ غصے کے معاملے میں پہلے بھی بہت آگ بگولا ہو جاتے تھے۔

امی نے اجمل کے سامنے ناشتا لا کر رکھا تو وہ ابا کی مار اور بدن سے اٹھنے والی ٹیس بھول کر ناشتا کرنے لگا۔ اسے آج بھوک بھی شدید ستا رہی تھی۔ ناشتے کے بعد جب سکول جانے کا وقت آیا تو اس کا ذرا بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ اتنی شدید مار پڑنے کے بعد بھی وہ سکول جائے، مگر ابا کے خوف سے تیار ہو کر چلا گیا۔ وہ سارا دن پریشان رہا تھا۔ اس نے ابا کی مار کا دوستوں سے بھی ذکر نہیں کیا۔

وہ صبح کی مار کے خوف کی وجہ سے آج پوری رات نہیں سو سکا۔ مسلسل پوری رات جاگنے سے اجمل کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ قدم کئی من کے وزنی محسوس ہو رہے تھے۔ دماغ میں جیسے کوئی ریل گاڑی چل رہی تھی۔ وہ ناشتا کرنے کے بعد جب سکول پہنچا تو وہاں اسمبلی ہو رہی تھی۔ وہ بیگ ساتھ لیے سیدھا اسمبلی ہال جا پہنچا۔

اجمل کے استاد، سر نوید اختر کی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ گزشتہ کئی روز سے محسوس کر رہے تھے کہ اجمل پریشان اور الجھا سا لگ رہا ہے۔ وہ اجمل سے پوچھنے میں

www.paksociety.com

احتیاط برت رہے تھے کہ کہیں ان کا اندازہ غلط نہ ہو مگر ان کا اندازہ درست بلکہ یوں کہیے... سو فیصد ٹھیک تھا۔ اجمل نے پہلے تو انکار کیا مگر سر نوید اختر کے اصرار پر اس نے سب کچھ بتا دیا۔ انھوں نے اجمل سے کہا ''اگر تم اپنے استاد کو اپنی پریشانی بتاؤ گے تو میں ضرور تمھیں اس کا حل بھی بتاؤں گا۔ تمھیں مجھ سے گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں''۔

اجمل سے تفصیل سننے کے بعد سر نوید اختر نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کا مسئلہ آج ہی حل کریں گے اور انھیں اجمل کی مدد کر کے بہت خوشی ہوگی۔

سر نوید اختر نے پرنسپل صاحب سے بات کر کے پھر شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کو سکول تشریف لانے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر کشور پرنسپل کے اچھے دوست تھے اور وہ بچوں سے بے حد پیار بھی کرتے تھے۔ بچوں کے مسائل سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ وہ پرنسپل صاحب کے بلانے پر ہمیشہ سکول آجاتے۔ ڈاکٹر کشور نے اجمل کے معاملے کی تفصیل اسی کی زبانی سنی۔

انھوں نے سر نوید اختر کو بتایا ''دو تین وجوہ ہیں جن کی وجہ سے رات کے وقت گہری نیند میں بچے بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ کچھ بچے کسی کارٹون، فلم، کسی ڈرامے یا کسی کہانی کے ایک خوفناک کردار سے ڈر جاتے ہیں۔ وہ کردار ان بچوں کو خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بچے نیند میں بھی اس کردار کو خواب میں دیکھتے ہیں تو خوف کے مارے ان کا پیشاب نکل جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ چند بچے امتحان کے خوف یا استاد کی مار پیٹ یا والدین کے تشدد سے خوف زدہ رہنے لگیں تو بھی ان کا نیند میں پیشاب نکل جاتا ہے۔ تیسری اور آخری وجہ یہ ہے کہ کچھ بچے غلط چیزیں کھا لیتے ہیں یا کھانے میں بے احتیاطی کی وجہ سے ان کے مثانے میں تکلیف پیدا ہو جاتی ہے۔ انھیں پھر بار بار پیشاب آنے لگتا ہے۔ وہ بھی اکثر رات کو نیند میں پیشاب کر کے بستر خراب کر دیتے ہیں۔''

اجمل سے سوال و جواب کرنے کے بعد ڈاکٹر کشور نے تشخیص کرتے ہوئے کہا ''مجھے یقین ہے کہ اجمل کو بھی مثانے کی کمزوری کا مسئلہ لاحق ہے۔ معمولی دوا کے استعمال سے یہ چند دنوں میں ہی بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

اجمل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈاکٹر کشور نے پھر کہا ''افسوس تو اس بات کا ہے کہ والد نے بچے کا پیشاب نکل جانے کا سدباب نہیں کیا بلکہ دشمنوں والا سلوک روا رکھا۔ والد کی مار پیٹ کے خوف نے بچے کو اعصابی طور پر کمزور کر دیا ہے۔''

ڈاکٹر کشور نے دوا کا نسخہ سر نوید کے ہاتھ تھمایا اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی ہمدردی کے عملی مظاہرے نے ایک بچے کو بہت بڑی مشکل سے بچا لیا۔ سر نوید نے بھی ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انھیں رخصت کرنے چلے گئے۔

سکول سے چھٹی کے بعد سر نوید نے اجمل کو ساتھ لیا، میڈیکل سٹور سے دوا لی اور اسے اپنے گھر لے گئے۔ شام سے کچھ دیر پہلے اجمل کے ابا اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے سر نوید کے گھر پہنچ گئے۔ سر نوید انھیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے آئے اور خوب جھاڑ پلائی۔ انھوں نے کہا ''آپ کی ناجائز مار پیٹ کی وجہ سے اگر اجمل کوئی غلط قدم اٹھا لیتا تو پھر اس کے جو نتائج آپ کو بھگتنے پڑتے، شاید آپ نے ان کے متعلق سوچا بھی نہ ہو۔ آپ نے ایک معمولی مسئلہ حل کرنے کے بجائے اپنے بچے کو خواہ مخواہ ذہنی اذیت پہنچائی۔ آپ جیسے والدین ہرگز بچوں کے خیر خواہ نہیں ہوتے۔''

اجمل کے ابو بے حد شرمندہ تھے۔ انھیں اپنے کیے پر سخت ندامت تھی۔ انھوں نے سر نوید اختر سے وعدہ کیا کہ وہ اجمل کا صحیح علاج کروائیں گے اور آیندہ مار پیٹ اور تشدد کو ہر مسئلے کا حل نہیں سمجھیں گے۔

اجمل کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس نے اپنے استاد کا شکریہ ادا کیا تو انھوں نے لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ''نہیں بیٹا! اس میں شکریے کی کیا بات ہے، یہ تو میرا فرض تھا۔''

www.paksociety.com

طنز و مزاح

ہمت کے بادبان سے نکلی ہوا

ایک شخص کا ماجرا جو کبھی دنیا دنیا آسمان واسطہ دیا جاتا تھا
مگر دوستوں کی آرا راہ میں حائل ہو رہی تھی

سلطان یوسف
ریاض، سعودی عرب

کل جس وقت ہم نے علی الصباح ناشتے پر بیگم صاحبہ کو اپنے تئیں اس اہم فیصلے کی اطلاع دی، اس وقت وہ چائے کا گھونٹ پینے ہی کو تھیں۔

چونک کر بولیں ''کیا کہا میں سمجھی نہیں، ذرا دوبارہ کہیے۔'' ہم نے زور دیتے ہوئے اپنی بات دہرائی ''یہی کہ اب ہم بھی رسائل و جرائد میں لکھا کریں گے۔''

بیگم منہ بنا کر بولیں ''ہمیں تو آج معلوم ہوا کہ فلمی رسالے پڑھنے سے بھی کوئی قلمکار بن جاتا ہے۔''

''فلمی رسالے کیوں؟'' ہم نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''کیا آپ نے ہمیں اخبار پڑھتے نہیں دیکھا؟ اور یہ جو موٹی موٹی کتابیں الماری میں سجی ہوئی ہیں یہ آپ کو نظر نہیں آتیں؟''

بیگم کب ہار ماننے والی تھیں، چہک کر بولیں ''دیکھا ہے مگر یہ بھی دیکھا ہے کہ سارے اخبار میں یا تو آپ معمے بھرتے رہتے ہیں یا یہ دیکھتے ہیں کہ نئی فلم کون سی اور کہاں لگی ہے اور جہاں تک الماری میں سجی ہوئی کتابوں کا تعلق ہے تو خدا جھوٹ نہ بلوائے جس دن سے ہم اس گھر میں منتقل ہوئے اس وقت کی سجی کتابوں کو ہم نے آج تک آپ کو چھوتے نہیں دیکھا۔ ہاں خوابوں میں اگر پڑھتے ہوں تو اس کا میں کہہ نہیں سکتی۔''

''اب ایسا بھی مت کہو'' ہم ذرا جھینپ کر بولے ''ہم نے کل ہی اردو خط کتابت کی کتاب سے عبداللہ کو ایک خط لکھوایا تھا۔''

خط کے ذکر سے ہم ایک ہی جست میں ماضی کی حسین یادوں میں پہنچ گئے۔ جب وہ حسن جہاں سوز ایک چاند کا ٹکڑا ہماری زندگی میں آیا تھا اور ہمارے درمیان خط کتابت ہوتی تھی۔ ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا ''خیر خط تو ہم نے بہت لکھے ہیں۔''

وہ ہمارے معنی خیز انداز پر چونک کر بولیں ''کس کو لکھے ہیں؟ کون ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے وہ کلموہی؟'' انہوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

ان کی تیز آواز ہمیں ماضی کی حسین یادوں سے دوبارہ کھینچ لائی اور ہمیں ہوش آیا کہ ہم تو بیگم سے باتیں کر رہے ہیں ''دوستوں کو اور کس کو'' ہم نے فوراً سنبھل کر بات بنائی۔

''جھوٹ، میں جانتی ہوں آپ کے لچھن۔'' پھر ہماری طرف جھک کر ذرا رازدارانہ انداز میں پوچھا ''ہم از کم مجھے تو بتا دیں۔'' ان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''کیا بتا دیں؟'' ہم نے گھور کر پوچھا ''اسے بھی کہ جو کچھ آپ چھپنے کے لیے بھیجیں گے وہ لکھوائیں گے کس سے؟ اب میں تو آپ کی مدد کرنے سے رہی۔''

''کیا مطلب؟'' ہم آنکھیں نکال کر بولے ''آپ کو پتا ہے ہم اپنی کلاس میں مضمون لکھنے میں اول آتے تھے۔''

بیگم کے منہ میں چائے کا گھونٹ تھا، یہ سنتے ہی انہیں اچھو لگ گیا، بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پہ قابو پا کر بولیں ''او ہو اب بھی آپ لکھیں گے آج ہم نے چڑیا گھر کی سیر کی یا مثلاً ہمارے اسکول کی کرکٹ ٹیم کیسے جیت گئی یا مثلاً۔۔۔۔'' وہ کچھ سوچنے لگیں۔

''بس بس'' ہم نے ہاتھ اٹھا کر کہا ''ہم سمجھ گئے آپ ہم کو ذرا اگلا ذو ی سمجھ رہی ہیں۔'' ہم نے ذرا غصے ہو کر کہا لیکن مجال ہے جو ان پر ہمارے اس غصے کا کوئی اثر ہوا ہو۔

کہنے لگیں ''خیر کو وہی والی بات ہے تو وہ اتنی کے امکانات ہیں مگر بات یہ ہے کہ آپ ٹھہرے نرے کاہل، دھلائی کے کپڑوں کی فہرست بنانی ہو یا گھر کا سودا لانا ہو، آپ فہرست تو عبداللہ سے بنواتے ہیں اب اتنا لمبا مضمون آپ کے نازک ہاتھوں سے کہاں لکھا جائے گا۔''

زچ ہو کر ہم نے کہا ''آپ لمبا مضمون لمبا مضمون اس طرح دہرا رہی ہیں جیسے ہم کوئی دو ڈھائی کلو میٹر لمبا مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

یہ کہہ کر ہم وہاں سے اٹھے اور بیگم کو ہنستا چھوڑ کر دفتر کے لیے چل دیے گھر والوں میں سوچتے رہے کہ آخر یہ بیویاں اتنی احمق کیوں ہوتی ہیں اور مزے کی بات یہ کہ احمق ہوتے ہوئے بھی ہر بیوی اپنے شوہر کو ہی احمق سمجھتی ہے۔

ہمیں وہ بات یاد آ گئی کہ ایک جج اسی بات پر خودکشی کرنے پر تیار ہو گیا تھا کہ میں تو سارا سارا دن دوسروں کے فیصلے کرتا ہوں اور جب گھر آتا ہوں تو بیوی کسی نہ کسی بات پر کہہ دیتی ہے آپ تو بے وقوف ہیں۔ جج نے سوچا تو پھر ایسی زندگی جینے سے کیا فائدہ۔

شام کو واپسی پر ہم اپنے پیارے دوست خلیق صدیقی سے مشورہ کرنے پہنچ گئے ''یار ہم نے ایک ارادہ کیا ہے۔''

خلیق تھوڑا پریشان ہو کر بولے ''اللہ خیر کرے آپ کے ارادے فیصلے اور پھر عمل سب ہی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔''

ہم نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا ''کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں یار۔'' انھوں نے ہمارا کندھا تھپتھپایا۔ ''بس ایسے ہی کہہ رہا تھا، ہاں اب بتاؤ کیا معاملہ ہے؟''

''خلیق بھائی بات یہ ہے۔'' ہم ذرا مطمئن ہو کر بولے ''کہ ہم جب بھی اخبار یا کسی رسالے میں کوئی چیز پڑھتے ہیں تو بخدا ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم بھی کچھ لکھیں۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم بھی ان رسالوں اور اخباروں میں ''آرٹیکل'' لکھنا شروع کر دیں۔''

ہم نے محض رعب ڈالنے کی خاطر دانستہ مضمون کا لفظ استعمال کرنے سے اجتناب کیا۔ مگر یہ سنتا تھا کہ خلیق بھائی نے بے ساختہ زور کا قہقہہ لگایا اور ہماری امیدوں پر اوس ڈالنے والے انداز میں بولے ''تم خود کو مجھتے ہو؟''

''اسی لیے تو آپ سے مشورہ کرنے آئے ہیں مگر آپ کی تو ہنسی ہی اندر نہیں ہو رہی۔ جیسے ہم کوئی لطیفے سنا رہے ہوں۔'' ہم نے ناراض ہونے والے انداز میں کہا۔

''بات یہ ہے۔'' خلیق بھائی خلیقانہ انداز میں بولے ''لکھنے کے لیے صرف خواہش ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اتنی موٹی موٹی کتابیں نہ صرف پڑھنی پڑتی ہیں بلکہ سمجھنی بھی ہوتی ہیں۔'' انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی۔ ''اور یہ دونوں کام آپ کے بس کے نہیں لگتے اور پھر وقت بھی خاصا دینا پڑتا ہے جو آپ کے پاس ہے نہیں کیونکہ اگر آپ لکھنے کا کام شروع کر دیں گے تو پھر آپ کے بہت سے اہم کام رہ جائیں گے مثلاً کبوتروں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ شطرنج کس سے کھیلیں گے اور ہاں وہ جو باون کے باون پتے آپ کے بغیر اداس ہو جائیں گے، ان کا کیا ہوگا؟''

ان کے ساتھ عتیق بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا، بولے ''چھوڑو یار یہ کن چکروں میں پڑ گئے، آؤ گھر چلیں، کیرم کی ایک بازی لگاتے ہیں۔'' خلیق اور عتیق دونوں بھائیوں نے اتنے پُر اثر انداز میں نقشہ کھینچا کہ ہمیں بھی اپنا شوق حماقت لگنے لگا۔

واپسی پر ہماری ملاقات نہایت شفیق، محترم مربی و محسن انیس صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا ''کیوں حضرت کہاں ہو اتنے دنوں سے اور یہ چہرے سے تو لگتا ہے کسی بات کا سوگ منایا جا رہا ہے قصہ کیا ہے آخر؟''

ہم نے اپنا ارادہ اور بیگم اور دوستوں کے تبصرے سے آگاہ کیا۔ سارا قصہ سن کر وہ بے ساختہ ہنس دیے اور بولے ''دوسروں کے مشورے ہمت بندھانے کے بجائے اکثر ہمت توڑنے کے کام آتے ہیں۔''

ہم نے ٹھنڈی سانس لی۔ واقعی ہمارے دوستوں کے مشورے ہماری ہمت کے بادبان سے ساری ہوا تو نکال ہی چکے تھے۔

مشورہ حاضر ہے

اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں،
چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے چھوٹے چھوٹے حل
اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صغیرہ بانو شیریں

لیمن گراس

لیمن گراس کے بارے میں ضرور لکھیے۔ مجھے کسی نے لیمن گراس دیا ہے مگر اس کے متعلق زیادہ معلومات نہیں رکھتی۔

(رابعہ)

لیمن گراس جھاڑی نما پودا ہے۔ اس کے پتے عام طور پر بطور قہوہ یا چائے استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں خاص مہک ہوتی ہے۔ آپ اس کی چائے بنا سکتی ہیں۔ ایک چمچ بھر پتے ابلتے پانی میں ڈال کر دم بھی دے سکتے ہیں۔ سوپ میں ڈال سکتی ہیں۔ یخنی بناتے وقت چند پتے ڈالنے سے مزا دوچند ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی لیمن گراس کسی نے دی تھی۔ میں چاولوں کو دم دیتے وقت پانچ چھ پتے ڈال دیتی۔ جب ڈھکن ہٹاتی تو خوشبو پھیل جاتی۔

لیمن گراس کے پتے خشک کر کے بوتل میں بھر کر رکھ لیجیے۔ تھکن ہو، معدے کی خرابی ہو، تو اس کی چائے بنا کر پیجیے، طبیعت صحیح ہو جائے گی۔ اس میں چینی کے بجائے شہد ملا کر پینے سے فلو، بخار میں فائدہ ہوتا ہے۔ کھانسی کم ہو جاتی ہے۔ دن میں تین چار بار یہ قہوہ پیا جا سکتا ہے۔ اس کا کوئی نقصان نہیں۔ دماغ پر بوجھ، تناؤ، پریشانی بھی یہ قہوہ دور کرتا ہے۔

طبی نقطۂ نظر سے لیمن گراس کے بے شمار فائدے سامنے آ رہے ہیں۔ سرطان جیسے مرض میں بھی مفید ہے۔ آپ بھی اسے آزمائیے۔ چاولوں میں ڈال کر دیکھیے۔ اس کی چائے بنا کر خود بھی پئیں اور گھر والوں کو بھی دیں۔ دو تین چھوٹی الائچیاں ڈال کر پانی پکا میں، لیمن گراس ڈالیں اور پھر چینی ڈال کر پئیں تو آپ خود حیران ہوں گی۔ جسم کی تھکن دور ہو جائے گی، کھانا ہضم ہوگا۔ منہ میں اس کا ذائقہ کافی دیر تک رہے گا۔

چکنا چہرہ

میری جلد چکنی ہے۔ اچھی طرح منہ صاف کرتی ہوں لیکن تھوڑی دیر بعد لگتا ہے کہ چہرے پر تیل لگا ہے۔ کسی فنکشن میں نہیں جا سکتی۔ میک اپ کرنا تو درکنار چہرے پر کچھ لگا بھی نہیں سکتی۔ یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔

(حمیرا ارشد)

کچھ لوگوں کی جلد چکنی اور حساس ہوتی ہے۔ آپ تھوڑا سا کھیرا اچھی طرح کدوکش کیجیے۔ ایک پیالہ چمچ دہی ملایے۔ منہ دھو کر خشک کر کے اسے لگائیے۔ ۱۵ منٹ بعد صاف کر کے منہ دوبارہ دھوئیے۔ پھر تھوڑا سا بیسن لے کر اسے چہرے پر

ابٹن کی طرح اچھی طرح ملیے، پھر اتار دیجیے۔ اب پانی سے منہ صاف کر کے خشک کیجیے۔ گلاب کا عرق اچھی طرح لگا دیجیے۔ آپ صابن سے منہ دھونا چھوڑ دیں۔ بیسن سے منہ دھوئیں اور بعد میں عرق گلاب لگائیں۔ فرق پڑ جائے گا۔

بالوں کو پریشان مت کیجیے

میں ہر طرح کے ٹوٹکے آزما چکی، پانچ چھ طرح کے شیمپو بدل بدل کر استعمال کیے، مگر فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوا اور بالوں میں خشکی کے چھلکے بن گئے۔ اب تو سر میں خارش ہوتی ہے۔ بال رنگوائے تو بے جان سے لگتے ہیں۔ اب آپ بتائیے کیا کروں؟ (بیگم فرحان احمد)

آپ کا لمبا چوڑا خط ملا۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔ بے چارے بال تو بہت پریشان ہوں گے۔ مختلف چیزیں استعمال کرنے سے فائدہ نہیں ہوتا۔ بار بار رنگوانے سے بھی بال بے جان لگتے ہیں۔ آپ بازار سے ایک پاؤ آملہ، آدھ پاؤ سیکا کائی، آدھ پاؤ میتھی کے بیج منگوا کر پیس لیں۔ جب سر دھونا ہو تو بالوں کے حساب سے تین چار چمچ گرم پانی میں بھگو دیں۔ آمیزہ پھول جائے تو سر میں اچھی طرح لگا لیں۔ ۱۵ منٹ بعد سر دھو لیں۔

بالوں کے لیے دہی بہت اچھا ہے۔ آدھی پیالی دہی لیں۔ ایک چمچ تیل ملائیں، پھر گھیکوار کا گودا چوتھائی پیالی ملا کر اچھی طرح کانٹے سے پھینٹ کر بالوں میں آدھا گھنٹہ لگائیں، پھر شیمپو کر لیں۔ بال تھوڑے گیلے ہوں تو کوئی سا تیل چھ سات قطرے لیجیے۔ اس میں لیموں کا رس ۳ قطرے ملا کر بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔ بالوں میں نرمی، چمک اور ملائمت آئے گی اور خشکی نہیں رہے گی۔ مہندی لگانے سے بھی بال صحیح رہتے ہیں۔ اب آپ ۲ ماہ تک بال نہ رنگوائیں اور ہفتے میں ۳ بار دہی لگائیں۔ بال ٹھیک ہو جائیں گے۔

ہمارے ہاں لڑکیاں کبھی شیمپو بدلتی اور کبھی بال رنگواتی ہیں۔ عجیب ٹوٹکے استعمال کرتی اور بازاری تیل لگاتی ہیں۔ بالوں میں جوئیں پڑ جائیں تو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ پچھلے زمانے میں صابن تھے نہ شیمپو۔ سرسوں اور بادام کی کھلی سے نہاتے دھوتے تھے اور یوں عموماً بال صحت مند اور چمک دار رہتے۔

ہائے میری کمر!

میری کمر میں ۲ سال سے درد ہے۔ ادویہ کھا رہی ہوں مگر افاقہ نہیں ہوا۔ اب ڈاکٹر نے آپریشن کا کہا ہے۔ لیکن میں بہت ڈرتی ہوں۔ آپ کا مشورہ کیا ہے؟ (سعدیہ آصف)

کمر درد واقعی بہت پریشان کرتا ہے۔ آپ کو چوٹ لگی تھی یا پٹھوں پر بوجھ پڑا؟ اب تو ایم آر آئی سے پتا چل جاتا ہے کہ کیا مسئلہ ہے۔ بہر حال آپریشن آخری علاج نہیں۔ اب تو مختلف قسم کی ورزشوں، یوگا اور ہڈی جوڑ ماہرین سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ جڑی بوٹیوں کے لیپ سے اور تیل کی مالش کمر کی جاتی ہے۔ یہ مالش خاص طریقے سے ہوتی ہے۔ پرانے طبیب اس کا علاج کر لیتے تھے۔ جسم کے مختلف حصوں کو دبا کر بھی علاج ہوتا ہے۔ آپ سب سے پہلے تو ہمدرد مطب جا کر مشورہ کیجیے۔ دیسی دوائیں فائدے مند ہوتی ہیں۔ کمر درد کی کوئی ایک وجہ نہیں، بے شمار وجوہ ہیں۔ آپ مکمل تشخیص کروائیں۔ اب تو جدید دوائیاں پٹھوں کو مضبوط بناتی ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی ٹھیک ہو تو کمر درد نہیں ہوتا۔

ذرا سی ہلدی

میں گر گئی تھی لہٰذا گھٹنے میں درد رہتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ چہرے پر بہت دانے نکلتے ہیں جس سے چہرہ بدنما لگتا

ہے۔ [illegible] (فضل محمود، راولپنڈی)

آپ کو بالکل نقصان نہ دینا ہمارا کام ہے۔ دو چٹکی ہلدی نیم گرم دودھ میں ملا کر روزانہ پیجیے۔ ہلدی خون صاف کرتی، پھوڑے پھنسیاں دور اور چوٹ کے اثرات مٹاتی ہے۔ خدانہ کرے کہیں گر جائیں، چوٹ لگ جائے تو فوراً آدھا چھوٹا چمچ ہلدی گرم گرم دودھ میں ملا کر پینے سے درد و چوٹ کو آرام آتا ہے۔ دو تین دن ہلدی والا دودھ پی لیں تو درد ختم ہو جاتا ہے۔ منہ دھونے کے لیے ایک چمچ بیسن میں تھوڑی ہلدی ملا کر چہرے پر لگائیں۔ پھر صرف بیسن سے اچھی طرح منہ دھو کر عرق گلاب لگائیں، صابن استعمال نہ کیجیے گا۔

بالوں میں دانے

۱۴ سال سے میرے سر میں خشکی اور دانے ہیں۔ بہت علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب میری ۲ بچیوں کا بھی مسئلہ ہے۔ اسی کی وجہ سے بال گر رہے ہیں۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ (مسعود)

بہن آپ نے خط میں یہ نہیں لکھا کہ کہاں رہتی ہیں ورنہ میں وہیں کے کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا دے دیتی۔ جب بال اس خلل کا شکار ہوں تو تیل بالکل نہیں لگانا چاہیے۔ تیل سے وہ مزید چکنے ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج عام ڈاکٹر سے نہیں بلکہ کسی اچھے ماہر جلد سے کرائیں تبھی مسئلہ حل ہوگا۔ یہ ایک قسم کی بیماری ہے۔ میں نے کئی ایسے مریض ڈاکٹر خالد غزنوی مرحوم کے کلینک میں دیکھے تھے۔ انھوں نے اس کا علاج کامیابی سے کیا۔ پھلوں کے مربے میں مہندی کے پتے، کلونجی وغیرہ ملا اور پکا کر بالوں میں لگانے کی ہدایت کی اور ساتھ کھانے کی دوا بھی دی۔ اس کا علاج ہومیوپیتھی میں بھی ہے۔ کوئی اچھا ماہر ڈاکٹر ہو تو آپ کا علاج ہو سکتا ہے۔ فی الحال کوئی بھی تیل نہ لگائیں اور بال صاف رکھیں۔ آپ کے پاس نیم کا درخت ہو تو مٹھی بھر نیم کے پتے پانی میں پکائیں اور بال دھو کر آخر میں یہ پانی ڈالیں۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

سورائسس کا شکار بیٹی

میری بیٹی بی ایس سی کی طالبہ اور سورائسس کا شکار ہے۔ پورے جسم سے چھلکے اترتے ہیں۔ ڈاکٹروں

میں نے تمھیں فارغ کر دیا

عید کے روز ایک لڑکی کا فون آیا۔ بری طرح رو رہی تھی۔ شوہر سے کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا اور اس نے غصے میں کہہ دیا کہ میں نے تمھیں فارغ کر دیا۔ وہ غصے میں اپنے میکے آ گئی۔ بعد ازاں مجھے فون کیا۔ کسی عالم سے فتویٰ لینا چاہتی تھی۔ میں نے اگلے دن فون کرنے کی تاکید کی تاکہ اسے نمبر دے سکوں۔ پھر اسے سمجھایا کہ وہ گھر واپس چلی جائے۔ اس سے پہلے بھی اردو ڈائجسٹ کے ذریعے بہت ساری لڑکیوں کو میکے سے شوہر کے گھر بھجوایا ہے جہاں وہ بڑی خوشگوار زندگی گزار رہی ہیں۔ بلکہ بیرون ملک سے آئی ایک خاتون کو ۱۲ برس بعد سمجھا کر واپس بھیجا اور اس کی کہانی رسالہ میں بھی شائع ہوئی۔

دراصل غصے میں انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ سمجھ دار خاتون کو چاہیے کہ وہ لڑائی کی نوبت ہی نہ آنے دے۔ شوہر کے حقوق ذمے داری کے ساتھ نبھائے۔ شادی کے بعد اپنا ہی گھر بھلا ہوتا ہے۔ میکے واپس آ کر عموماً بیٹی کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے، وہ ناقابل بیان ہے۔ ذلت، رسوائی اور پھر بھابھیوں اور رشتے داروں کے طعنے جینا عذاب کر دیتے ہیں۔ اپنے گھر کو حسن سلوک سے جنت بنائیے اور کبھی لڑ جھگڑ کر میکے نہ آئیے۔ ہمیشہ خوش رہیں گی۔

www.Paksociety.com

کا کہنا ہے کہ یہ بیماری لاعلاج ہے۔ آپ اسے ہاں لے جائیں۔ مجھے چھاتی کا سرطان ہو گیا تھا۔ ۵ سال بعد شوہر نے طلاق دے دی۔ بیٹی میرے پاس ہے اور میں ٹیوشن پڑھا کر گزارا کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟ (راحیلہ۔ راولپنڈی)

بہن، اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج رکھا ہے۔ شفا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کیوں مایوس ہوتی ہیں۔ آپ نے خود دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرطان سے نجات دی۔ اللہ پر بھروسا کریں اور اسی سے مانگیے، وہ ضرور دے گا۔ آپ کو خط میں کچھ اچھے ڈاکٹروں کے فون نمبر بھیجوں گی، ان شاء اللہ بہتری ہو جائے گی۔

سانس میں بدبو

میرے مسوڑھے پھول جاتے ہیں اور دانتوں میں ہلکا درد رہتا ہے۔ اپنے سانس میں بدبو محسوس کرتا ہوں۔ عجیب ناگوار بدبو ہوتی ہے، جس سے میں خود بھی پریشان ہو جاتا ہوں۔ اس کا کیا علاج ہے؟ ادویہ بتائیے گا کہ میں ان کے خلاف ہوں۔ (عبدالرشید)

جب تکلیف بڑھ جائے تو دوا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دوا صحت بہتر بناتی ہے۔ بہرحال آپ بازار سے سبز چائے (گرین ٹی) لا کر رکھیے۔ ہر کھانے کے بعد اچھی طرح غرارے کر کے سبز چائے کی ایک پیالی ضرور پیجیے۔ کھانے کے بعد منہ میں ذرات رہ جاتے ہیں۔ یہ ناخوشگوار بدبو انھی کے باعث جنم لیتی ہے۔ آپ ہر روز کھانے کے بعد باقاعدگی سے یہ چائے پئیں، مسئلہ حل ہو جائے گا۔ سبز چائے کے ٹی بیگ بھی مل جاتے ہیں۔ مسوڑھے بھی نہیں پھولیں گے اور درد بھی آہستہ آہستہ کم ہو جائے گا۔ جو لوگ باقاعدگی سے مسواک کرتے ہیں، ان کے دانت خراب نہیں ہوتے۔ خاص طور پر پیلو، کیکر، نیم کی مسواک دانت خراب نہیں ہونے دیتی۔ ہمارے ہاں اب مسواک کا رواج ہی نہیں رہا۔ پہلے صبح کی نماز کے بعد لوگ درخت سے شاخ توڑ کر مسواک کرتے نظر آتے تھے۔ ان کی صحت بھی ٹھیک رہتی اور دانتوں کا مسئلہ بھی نہ ہوتا۔

قبض توڑ نسخہ

میرے بیٹے کو قبض رہتا ہے۔ ڈاکٹر کی دواؤں سے وقتی افاقہ ہوتا ہے پھر وہی مسئلہ۔ اس کی عمر ۳۰ سال ہے۔ بہت دوائیاں لیں لیکن ٹھیک نہیں ہوا۔ آپ ایسا غذائی ٹوٹکا بتائیں جس سے یہ تکلیف دور ہو جائے۔ اسے کھٹی ڈکاریں آتی ہیں اور منہ سے ہر وقت بدبو آتی ہے۔ (شہزاد)

آپ اپنے بیٹے کی خوراک میں تھوڑی تبدیلی کیجیے اور سلاد کی ایک پلیٹ ضرور کھلائیں۔ مولی، گاجر، شلجم، سلاد اور پیاز کی سلاد اچھی بنتی ہے۔ اب سردی کا موسم ہے، ساگ کھلائیے۔ شلجم گوشت میں پکوائیں۔ اس میں ہرے مرچ بھی ضرور شامل کریں۔ رات کو چھ سات سوکھے آلو بخارے اور ۳ خشک انجیر، دھو کر بڑے گلاس پانی میں بھگو دیں۔ صبح آلو بخارا اور انجیر ایک ایک دانہ کر کے کھا لیں، پھر پانی پی لیں۔ آدھ گھنٹے بعد ناشتا کریں۔

ناشتے میں جو کا دلیا دودھ میں پکا کر کھائیں۔ دوپہر کو سبزی، سلاد لیں۔ اس سے قدرتی طور پر قبض دور ہو گا۔ دوائیاں نہ کھائیں۔ ایک دو کچے شلجم مع چھوٹے پتوں کے کھانے سے قبض دور ہو جاتا ہے۔ انجیر قدرت کا تحفہ ہے۔ معدے میں سڑاند نہیں ہونے دیتا۔ اس کے کھانے سے ساری غلاظت نکل جاتی ہے۔ کھانے کے بعد ۳/۲ انجیر کھا لیے جائیں تو معدے کی کئی تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔ پانی کم از کم ۱۰ گلاس روزانہ پئیں۔ نیز دو تین کچی گاجریں روزانہ کھائیں۔ قدرت نے ہر موسم میں جو سبزی پیدا کی ہے، وہ فائدے مند ہے۔

www.Paksociety.com

سر کی خشکی

اکرام الحق ذکی اوکاڑہ سے لکھتے ہیں۔ میرے سر اور کانوں میں بہت خشکی ہے۔ اسے ختم کرنے کا کوئی نسخہ بتائیے۔

آپ بازار سے میتھی دانہ خرید کر پسوا لیں۔ ۲ چمچ سفوف رات کو تھوڑے گرم پانی میں بھگو دیں۔ صبح اچھی طرح سر میں لگائیں۔ آدھ گھنٹے بعد سر دھولیں۔ شیمپو بھی اچھی قسم کا استعمال کریں۔ آدھا کلو تیل گرم کریں اور اس میں ایک چقندر کے کٹے گول ٹکڑے ایک ایک کر کے ڈالیں۔ جب کالے ہو جائیں تو دوسرے ڈالیں، آخر میں پتے بھی جلائیں۔ تیل ٹھنڈا ہونے پر چھان کر رکھیں۔ چقندر کا یہ تیل سر کی خشکی دور کر دیتا ہے۔ کان میں بادام روغن ہلکا گرم کر کے ایک ایک قطرہ ڈالیں۔ سر کی خشکی ختم ہو گی تو کانوں کی شکایت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

بھوک کم نہیں ہوتی

میں ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی ہوں۔ اب سردی کا موسم ہے، اس میں زیادہ بھوک لگتی ہے۔ پتا نہیں مجھے کیوں بھوک لگتی ہے۔ بہرحال میں اپنی عادت پر قابو نہیں پا سکتی اور میرا وزن بڑھ رہا ہے۔ کوئی نسخہ ایسا نہیں جس سے میری بھوک ختم ہو جائے اور میں سمارٹ ہو جاؤں۔ (ف۔ ج، واہ کینٹ)

بی بی! کچھ لوگ کھانے کے لیے جیتے اور کچھ جینے کے لیے کھاتے ہیں۔ زیادہ کھانا بھی ایک بیماری ہے۔ آپ خود ہی کوشش کر کے اپنی عادت پر قابو پا سکتی ہیں۔ ہومیوپیتھک دواؤں سے بھی بھوک پر قابو پایا جاتا ہے۔ آپ کھانے سے پہلے پانی پی لیا کریں، اس سے بھی بھوک کم ہوتی ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھا کریں اور بعد میں اللہ کا شکر ادا کریں۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا، اس پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد کہیے "تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور بنایا ہمیں مسلمانوں میں۔" چھوٹی سی دعا ہے مگر یاد کر لیں۔

کہنے کو یہ چھوٹی بات ہے مگر اس میں بے پناہ برکت ہے۔ پہلے گھروں میں دادی، نانی بچوں کو دعائیں یاد کراتی تھیں۔ اب مشترکہ خاندانی نظام ہی نہیں رہا۔ صبح سو کر اٹھتے وقت، غسل خانے جاتے ہوئے اور ناشتا کرنے سے پہلے ضرور دعا پڑھی جاتی تھی۔ اب تو والدین بچوں کو سکھاتے ہی نہیں۔ مجھے یقین ہے آپ اس پر عمل کریں گی تو آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

نیند کا مسئلہ

میری عمر ۲۰ سال ہے۔ مجھے نیند بہت آتی ہے۔ دس بارہ گھنٹے بعد بھی آنکھ نہیں کھلتی۔ الارم لگاتی ہوں مگر نیند نہیں ٹوٹتی۔ پڑھائی میں بھی حرج ہوتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ صبح کی نماز بھی چھوٹ جاتی ہے۔ یہ خرابی کیسے دور ہو گی؟ سر درد اور قبض کا مسئلہ بھی چمٹا ہوا ہے۔ (مومنہ خالد، لاہور)

آپ نے نیند اپنے پر طاری کر لی ہے۔ رات کو دیر سے سونا اور صبح دیر سے اٹھنا وتیرہ بن گیا ہے۔ رات کو نماز عشا پڑھیں اور جو بھی آیات یاد ہوں، پڑھیے۔ سونے سے پہلے استغفار کریں اور جلد سو جائیں۔ ان شاء اللہ صبح سویرے آنکھ کھل جائے گی اور آپ نماز فجر بھی پڑھ سکیں گی۔ صبح اٹھنے کے کئی فائدے ہیں۔ پڑھائی کریں گی تو یاد رہے گا۔ سر میں درد بھی نہیں رہے گا۔ کھانا وقت پر کھائیں گی تو قبض دور ہو جائے گا۔ اپنی عادات بدلیے، تمام زندگی سکھی رہیں گی۔ والدہ سے کہیے کہ وہ نماز کے وقت آپ کو اٹھا دیا کریں۔

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

قارئین متوجہ ہوں

ایک خط آیا ہے۔ ۲ بچے تھیلیسیمیا کے مریض ہیں۔ ۴ سالہ بچہ اور ۲ سالہ بچی ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہر ۱۵ روز بعد خون لگوانا پڑے گا اور وہ بھی تمام عمر۔ بچوں کی والدہ نادیہ مبشر کا کہنا ہے، کسی بھی قاری کے پاس کوئی ایسا نسخہ، ٹوٹکا ہو جس سے جسم میں خود بخود خون بننا شروع ہو جائے یا کوئی مفید غذا ہو تو ضرور بتایئے۔

ایک ڈھائی سالہ بچہ عارف تھیلیسیمیا کا شکار تھا۔ اس کے والد نے ایک نسخہ بتایا تھا۔ ایک پاؤ کلونجی پیس لیں۔ ایک پاؤ گھیکوار کا گودا پیس کر کلونجی میں ملا دیں۔ تھوڑی سی چینی ذائقے کے لیے ملائیں اور تھوڑا پانی بھی تاکہ وہ گاڑھے شربت کی طرح ہو جائے۔ دن میں ۳ بار ایک ایک چمچہ پلائیں۔ اس کے پینے سے بچے میں کافی بہتری آئی۔ کھانے پینے اور کھیلنے لگا۔ اس کے ساتھ رحیم پارک کے کسی حکیم سے علاج ہو رہا تھا۔ بعد میں ان صاحب کا کوئی فون نہیں آیا۔ اگر وہ پڑھیں تو ضرور بتائیں اور دفتر سے میرا نمبر لے کر بات کریں۔ نادیہ بہن آپ ابھی یہ نسخہ استعمال نہ کریں۔

فاطمید والے بھی خون لگوانے میں مدد کرتے ہیں۔ اب علم نہیں، بمقام ڈاک خانہ نارووالی ضلع گجرات میں بھی یہ سہولت موجود ہے یا نہیں۔ اگر کسی کے پاس یونانی یا ہومیو دوا کا نسخہ ہو تو ضرور بتایئے تاکہ دوسروں کا بھلا ہو سکے۔ نادیہ بہن سے کہنا ہے، مجھے جو معلومات ملیں، میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔ اللہ تعالیٰ ان معصوم بچوں کو صحت سے ہمکنار کرے۔

سرسوں کے تیل کی افادیت

مجھے سرسوں کے تیل کی افادیت بتایئے۔ ہمارے ہاں سرسوں کا تیل کھانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیا یہ صحت کے لیے مفید ہے؟ (روبینہ شجاع)

سرسوں کا تیل آج نہیں صدیوں سے مستعمل ہے۔ حکیم اور طبیب اس کی افادیت جانتے ہیں۔ گھریلو طور پر خواتین سرسوں کا تیل بطور دوا بھی استعمال کرتی ہیں۔ مثلاً کان میں درد ہوتا تو تیل میں ایک دو جوئے لہسن کے چھیل کر جلاتی۔ لہسن کالا ہو جاتا تو تیل اتار کر چھان کر رکھ لیتی۔ دو تین قطرے نیم گرم تیل کان میں ڈالنے سے درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔

اسی طرح دانت کی تکلیف میں ذرا سا نمک سرسوں کے تیل میں ملا کر دانتوں پر رات کے وقت ملنے سے مسوڑھے مضبوط ہوتے اور میل کچیل صاف ہو کر وہ چمکنے لگتے۔ گھٹنوں، جوڑوں میں درد ہوتا تو آدھ پاؤ تیل گرم کرکے اس میں ایک دیسی لہسن ثابت ہی ڈال دیتے۔ جل جاتا تو اتار کر تیل رکھ لیتے۔ ہلکا سا گرم کرکے گھٹنے پر مالش کرتے اور پھر ململ کا کپڑا دو بل لے کر اس کی پٹی باندھتے۔ چند دنوں میں ورم دور ہو جاتا۔ جو لوگ پابندی سے سرسوں کا تیل سر میں لگاتے ہیں، ان کے بال سیاہ رہتے ہیں اور خشکی ختم نہیں لیتی۔ جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کی جائے تو توانائی محسوس ہوتی ہے۔

اس تیل میں سبزی بنائی جائے تو بہت لذیذ بنتی ہے۔ مچھلی تل کر کھائیں تو مزہ دوبالا ہوتا ہے۔ آپ سرسوں کا تیل ضرور استعمال کیجیے، صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔ بازاری تیل نہ خریدیں بلکہ کولہو پر جا کر خالص سرسوں کا تیل لائیں۔ سر درد ہو تو سرسوں کے ایک چمچ تیل میں ایک چمچ پانی ملا کر اچھی طرح بالوں میں مالش کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ مہندی لگائیں تو اس میں بھی ایک چمچ سرسوں کا تیل ملانے سے رنگ اچھا آتا ہے اور بال خشک نہیں ہوتے۔

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

سچے واقعات

اَنعَمتَ عَلَیہِم

قابلِ تقلید روح پرور واقعات کا تذکرہ

ابو احمد ۔ جھنگ

میں اپنی دکان پر بیٹھا تھا کہ سامنے ایک نئی گاڑی آ کر رکی۔ ایک خوبصورت، خوش لباس نوجوان اترا اور اندر چلا آیا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا، یہ نعیم تھا، نعیم مرزا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستانی فوجوں نے ظلم و بربریت کا بازار گرم کیا تو کئی کشمیری خاندان ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ نعیم مرزا کا خاندان ہمارے محلے میں آ بسا۔ یہ خاندان ۳ افراد، نعیم، اس کے ابو اور امی پر مشتمل تھا۔ نعیم شیرخوار بچہ تھا، والد تپ دق کے مریض تھے۔

بمشکل تمام انھیں تھوڑی سی زرعی زمین الاٹ ہوئی تو سر چھپانے کو ایک ٹوٹا پھوٹا مکان مل گیا۔ نعیم کے والد بیماری اور کمزوری کی وجہ سے زمین خود کاشت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا بٹائی پر دے دی۔ تھوڑی سی آمدن سے گھر اور بیماری کا خرچہ اٹھاتے۔ نعیم نے غربت میں آنکھ کھولی اور بے چارگی کے عالم میں پڑھائی جاری رکھی۔ سرکاری اسکول میں اس کی فیس معاف ہو گئی۔ بہرحال اس نے گرتے پڑتے میٹرک کر لیا۔

میری ادویات کی دکان تھی۔ نعیم کے والدین اکثر دکان سے ادویات خریدنے آتے لہٰذا میری ان سے واقفیت ہو گئی۔ جب نعیم کے ابو کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی اور وہ نہ آ پاتے تو میں شام کو ان کے گھر جا کر پہنچا آتا۔ ان کی سفید پوشی دیکھ کر مجھے ان سے ہمدردی ہو گئی۔ فارغ وقت میں نعیم بھی میری دکان پر آ جاتا۔ وہ ایک شریف اور ذہین بچہ تھا۔ میں اس کے ابو کی طبیعت اور پڑھائی کے بارے پوچھتا اور اس کی ہمت بڑھاتا۔

نعیم نے اوّل درجے میں میٹرک کر لیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ میں نے اسے مبارک باد دی۔ چند دن تو وہ خوش رہا پھر اسے ایک پریشانی نے آ گھیرا۔ وہ پڑھائی کے لیے بیرون ملک جانا چاہتا تھا مگر اس کے پاس فیس کی رقم نہیں تھی۔

اس نے مجھ سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ فکر نہ کرے، جو کچھ مجھ سے ہو سکا کروں گا۔ میں نے دوستوں سے قرض لے کر ادویات کی فروخت کا کام شروع کیا تھا۔ ابھی میری آمدن اتنی نہیں تھی کہ نعیم کی مدد کر سکتا۔ لیکن مجھے اس پر ترس آتا تھا اور میرے دل سے آواز اٹھتی کہ جیسے بھی ہو، مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔

میں اپنے شہر میں ایک مشہور اخبار کا اعزازی نامہ نگار تھا کیونکہ ادب اور صحافت سے دلچسپی تھی۔ میں اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ صحافت کا چسکا بھی پورا کرتا۔ ان دنوں صحافی محنتی اور دیانتدار ہوتے تھے اور معاشرے میں ان کی عزت ہوتی۔ میں نے اپنی طرف سے ایک خط کالج پرنسپل کے نام لکھا جس میں نعیم کی غربت، والد کی بیماری کی تفصیل لکھی اور مدد کی درخواست کی۔ خط کام کر گیا۔ نعیم کے حالات اور علمی شوق دیکھ کر پرنسپل بھی مہربان ہو گئے۔ فوری طور پر کالج اور ہوسٹل کی فیس معاف کر دی اور کھانا بھی مفت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

فراہم کرنے کا انتظام کروادیا۔ پھر میں نے بھی آمد و رفت اور دیگر اخراجات کے لیے ۱۰۰ روپے ماہانہ دینے کی ہامی بھرلی۔ سستا زمانہ تھا، اتنی رقم نعیم کے دیگر اخراجات کے لیے کافی تھی پھر زیادہ دینے کی مجھ میں سکت بھی نہ تھی۔

نعیم نے محنت سے پڑھائی کی اور اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوگیا۔ ان دنوں حکومت آزاد کشمیر کے پاس ہنرمند افراد کی خاصی کمی تھی۔ نعیم نے نوکری کی درخواست دی جو فوری منظور ہوگئی اور وہ میرپور میں بحیثیت اوورسیر ملازم ہوگیا۔ وہ جب بھی آتا تو مجھے ضرور ملتا۔ اس نے مجھے رقم لوٹانے کی کوشش کی لیکن میں نے سختی سے منع کردیا۔

نعیم کو میرپور میں سرکاری رہائش مل گئی تو وہ والدین کو بھی ساتھ لے گیا۔ ابتدا وہ کبھی کبھار اپنے رشتے داروں کو ملنے آتا لیکن پھر طویل مدت کے لیے غائب ہوگیا۔ کافی مدت بعد، اس دن وہ اپنی ذاتی گاڑی پر آیا۔ اس نے بتایا کہ اب وہ ایس ڈی او بن گیا ہے۔ اس کی شادی ہوگئی اور ۳ بچے ہیں۔ ابو فوت ہوچکے، امی آپ کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔ اس کی ترقی اور خوشحالی دیکھ کر مجھے بڑی خوشی اور تسکین کا احساس ہوا۔

☆☆

قاری لیاقت میرا ہمسایہ تھا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ مسجد میں قرآن پڑھتا تو ہر کوئی مسحور ہوجاتا۔ اس خوبی کی بنا پر اسے لیاقت کے بجائے قاری لیاقت پکارا جانے لگا حالانکہ اس نے قرآن حفظ کیا تھا نہ قرأت سیکھی تھی۔ والد چھوٹی سی دکان چلاتے تھے۔ کثیر الاولاد تھے۔ بہت تھوڑی فروخت ہوتی، بمشکل گزربسر ہو رہی تھی۔ لیاقت نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اسے اخبار، رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے میری دکان پر آجاتا کیونکہ میرے پاس اخبارات رسالے وغیرہ آتے تھے۔ اپنے مطالعے کی پیاس بجھاتا اور تھوڑا بہت میرا کام بھی کردیتا۔ ایک دن اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا ”ابا کہتے ہیں سکول چھوڑ دو، دکان پر بیٹھو۔ وہ میری پڑھائی کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔“

میرا خیال تھا کہ پڑھائی کے اخراجات زیادہ سے زیادہ ۳۰ روپے ماہوار ہوں گے۔ لیکن اس کا والد اتنا تہی دست تھا کہ رقم کا بھی بندوبست نہیں کرسکتا۔ میں نے اسے تسلی دی اور اس کے والد سے بات کی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، کہنے لگے ”اعجاز صاحب کس کا جی نہیں چاہتا کہ اس کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں؟ لیکن میں مجبور ہوں۔ لیاقت کو دکان پر ساتھ بٹھاؤں گا، دونوں باپ بیٹا مل کر کام کریں تو گھر کے اخراجات پورے ہوں گے۔“

میں نے اسے پیشکش کی کہ پڑھائی کا خرچ میں برداشت کروں گا۔ یہ سن کر لیاقت کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے بھرپور محنت کی اور میٹرک میں اول درجہ حاصل کیا۔ مجھ سمیت سب لوگ بہت خوش ہوئے۔ اب لیاقت نے خواہش ظاہر کی کہ وہ کالج میں پڑھنا چاہتا ہے۔

میں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر منظور کو لیاقت کے متعلق بتایا۔ انہوں نے بھی لیاقت کی پڑھائی کے اخراجات ادا کرنے کی ہامی بھرلی۔ یوں قاری لیاقت گریجوایشن کرنے میں کامیاب رہا۔ پھر وہ باپ کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگا۔ اس نے جدید طریقے سے دکان چلائی، تو وہ پہلے سے زیادہ چل نکلی۔

قاری کے خاندان میں ایک امیر آدمی کی یتیم بھتیجی کنواری تھی۔ وہ اچھے رشتے کی تلاش میں تھا۔ اس خاندان میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا۔ قاری کی گریجوایشن بہت بڑا اعزاز تھا۔ آخرکار امیر آدمی نے لیاقت کے والد سے بھتیجی کے رشتے کی بات کی۔ انہوں نے اپنی غربت اور لیاقت کی بیروزگاری کے باعث انکار کرنا چاہا مگر وہ شخص نہ مانا۔ اس نے شادی کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ لیاقت کے لیے ملازمت کا بندوبست کرنے کی پیشکش بھی کردی، چنانچہ شادی ہوگئی۔

اس امیر آدمی نے اپنے اثرورسوخ سے لیاقت کو جلد کویت میں ملازمت دلوادی۔ لیاقت نے خوب محنت کی، روپے کمائے، بچائے اور اپنے ابو کو بھیجے۔ اس کے والد

www.paksociety.com

نے دکان وسیع کر لی اور مکان بنا لیا۔ پھر لیاقت نے اپنے بعد دیگرے اپنے چھوٹے بھائی اور بھانجے کو بھی کویت ملازمت دلا دی۔ دونوں بھائیوں نے خوب کمائی کی اور یوں یہ خاندان خوشحال ہو گیا۔

میں بہت خوش ہوں کہ میری معمولی سی مدد نے نہ صرف قاری لیاقت بلکہ سارے خاندان کو غربت سے نکال کر ترقی کی طرف مائل کر دیا۔

☆☆

ایک دن استاد مختار کے حمام پر ڈاکٹر خالد ہادی سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب بھی میری طرح استاد مختار کے مستقل گاہک اور ہفتے میں ایک بار وہاں کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ انھوں نے میری بچی کی پڑھائی بارے استفسار کیا جس نے ایف ایس سی کا امتحان دے رکھا تھا۔ میں نے انھیں بتایا "بچی میرٹ پر تو آ گئی ہے لیکن اسے لاہور یا راولپنڈی داخلہ ملنا مشکل ہے، شاید فیصل آباد داخلہ مل جائے۔ میں نے سوچا ہے کہ اگر راولپنڈی داخلہ نہیں ملتا تو سیلف فنانس سکیم کے تحت اسے لاہور یا پنڈی میں داخلہ دلوا دوں۔"

میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ مکان بنانے کے لیے ایک قطعہ زمین خرید رکھا ہے، وہ فروخت کر کے فیس ادا کر دوں گا۔ انھوں نے مجھے منع کر دیا اور کہا کہ بچی کو اوپن میرٹ پہ داخلہ دلواؤ اور پلاٹ کی فروخت سے جو رقم ملے، اس سے کسی مستحق طالب علم کی مدد کرو۔ انہوں نے مزید کہا کہ تونسے کے ایک غریب ریڑھی والے کے بیٹے کو بہاولپور میڈیکل کالج میں داخلہ ملا ہے۔ لیکن اس کے والدین بہت غریب ہیں اور بیٹے کی پڑھائی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ دوستوں کو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں نے فوراً ایک ہزار روپے ماہانہ دینے کی ہامی بھر لی۔

میری بچی کو اوپن میرٹ پر راولپنڈی میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ اپنے وعدے کے مطابق غریب طالب علم کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ دے رہا ہوں۔ جب یہ بچہ ڈاکٹر بن جائے گا تو میری ذمے داری پوری ہو جائے گی۔

☆☆

خالہ زہرہ ایک غریب بیوہ عورت ہے۔ وہ لوگوں کے گھروں میں کام کاج کر کے گھر کا خرچ چلاتی ہے۔ اس کی بیٹی بڑی محنتی، نیک اور ایف اے میں پڑھتی ہے۔ جب خالہ زہرہ بیمار یا مصروف ہو تو ان کی جگہ گھروں میں کام کرتی ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ محنت و مشقت کی عادی ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن خالہ کے پاس وسائل نہیں۔ ایک دن خالہ نے مجھ سے ذکر کیا۔

میں نے خالہ سے کہا "میں بچی کی پڑھائی کے اخراجات کے لیے ۵۰۰ روپے ماہانہ اور بی اے کے داخلے کے لیے ۲ ہزار روپے دوں گا۔" یہ سن کر خالہ خوش ہو گئی۔ اس کی بیٹی شکریہ ادا کرنے آئی۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ بی اے کرنے کے بعد بی ایڈ کرے اور پھر محنت سے استانی لگ جائے۔ میرا مشورہ اسے پسند آ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ محنت کرنے لگی ہے۔ استانی بننا اس کا ہدف ہے۔ ان شاء اللہ وہ یہ ہدف ضرور حاصل کرے گی۔

☆☆

میرے ۵ ر بچے ڈاکٹر ہیں۔ میرا داماد اور میری ۲ بہوئیں بھی ڈاکٹر ہیں۔ میں خود ایک دوا ساز اور ۸ ر ڈاکٹروں کے گھرانے کا سربراہ ہوں۔ میں اپنے رب کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھ پر بہت زیادہ احسانات کیے۔ میرے عزیز، دوست، ملنے والے مجھے اکثر کہتے ہیں کہ اللہ نے مجھے بہت زیادہ انعامات سے نوازا ہے۔ نیک اور ذہین اولاد دی۔ میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا اور کہتا ہوں کہ بے شک اللہ نے مجھے سب کچھ دیا۔

لیکن میرا اپنا خیال کچھ اور ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیک اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اولاد اور وافر رزق حلال اللہ کا انعام ہے۔ بلند سماجی حیثیت بھی لیکن سب سے بڑا انعام وہ شعور ہے جو اللہ نے مجھے بخشا۔ اس کے زیر اثر میں نے غریب طالب علموں کی مدد کی اور ضرورت مندوں کا سہارا بن گیا۔ چونکہ میں نے اپنی ذمے داری بخوبی نبھائی لہٰذا اللہ نے میرے بچوں کا مستقبل بھی روشن کر دیا۔

www.Paksociety.com

یہ جنرل مشرف کا دور ہے، جب پاکستان میں ویلنٹائن ڈے کا غلغلہ ہوا۔ ۱۴ فروری کو خوش حال علاقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو تیر تھامے کیوپڈ کے دل والے کارڈ اور پھول تحفتاً دینے لگے۔ یہ گویا تجدید محبت کی علامت تھی۔ اس کو بڑھاوا ریڈیو کے براہ راست پروگراموں، اخبارات کے ایڈیشنوں اور اشتہاری کمپنیوں کی سپانسر شپ نے دیا۔ لیکن اس مغربی رسم کو مغرب زدہ طبقے کے علاوہ پاکستانیوں کی اکثریت نے ناگواری سے دیکھا اور یہ تشویش ظاہر کی گئی کہ یہ رسم لڑکے لڑکیوں کی آزادانہ میل جول بڑھاتی اور انھیں گناہ کی جانب راغب کرتی ہے۔

مغربی تہذیب خوبیاں رکھتی ہے، تو اس میں خامیاں بھی ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہمارا صحیح عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم مغربی تہذیب کی اچھائیاں تو اپنا لیں، برائیاں چھوڑ دیں۔ انہی برائیوں میں شہوت پرستی ایک نمایاں برائی ہے اور ویلنٹائن ڈے اسی کا ایک حیاسوز روپ!

امریکہ اور یورپی ممالک میں اس دن لڑکے اپنی سہیلیوں یعنی گرل فرینڈز کو تحفے مثلاً چاکلیٹ بھجواتے اور پھول و دل نما کارڈ دیتے ہیں۔ راتوں کو ریستورانوں میں دعوت اڑاتے اور پھر عموماً شب ساتھ گزارتے ہیں۔ غرض یہ دن ان کے لیے رنگ رلیاں منانے کا سنہرا موقع ہے۔ لہٰذا وہ اسے بڑے بھرپور انداز میں مناتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خواہش نفسانی کی مظہر یہ رسم ہمیں بھی اپنا لینی چاہیے...... لیکن ویلنٹائن ڈے کی بنیادیں ہزاروں سال قبل بت پرستوں نے رکھی تھیں۔

حقیقی سینٹ ویلنٹائن کون تھا؟

ویلنٹائن ڈے ایسا تہوار ہے جس نے پچھلے ۴ ہزار سال میں کئی چولے بدلے۔ اس تہوار کا حقیقی ہیرو نمرود ہے۔ وادیٔ دجلہ و فرات کا مشہور کافر بادشاہ جسے اس کی سلطنت کے باشندوں نے دیوتا کا روپ دے ڈالا۔ اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ یہ خصوصاً بابل کے باشندوں کا دیوتا تھا۔ وادیٔ دجلہ و فرات کی دیگر اقوام مثلاً فونیقیوں، اشوریوں اور کنعانیوں نے اسے "بعل" کہہ کر

www.paksociety.com

پکارا اور اپنا دیوتا بنا لیا۔

۳۰ ہزار سال قبل فونیقی تاجر یونان اور روم میں بغرضِ تجارت آنے جانے لگے۔ چنانچہ ان کے دیوتا یونانیوں اور رومیوں میں متعارف ہوئے، خصوصاً بعل جو رفتہ رفتہ وادیٔ دجلہ و فرات میں بسنے والی اقوام کا سب سے بڑا دیوتا بن چکا تھا۔ یونانیوں نے بعل کو "پان" (Pan) دیوتا کی حیثیت سے اختیار کیا۔ رومیوں نے اسے "لوپرکس" (Lupercus) کا نام دیا اور اُسے بحیثیت دیوتا پوجنے لگے۔

وادیٔ دجلہ و فرات سے جو قدیم تختیاں دستیاب ہوئی ہیں، ان میں نمرود کو "عظیم شکاری" کہا گیا ہے۔ اسی طرح توریت میں بھی بعل (یعنی نمرود) کو "عظیم شکاری" پکارا گیا۔ (کتاب پیدائش ۹:۱۰)۔ توریت میں تو کئی جگہ بعل کا ذکر ہے۔ اسی طرح رومیوں میں بھی لوپرکس بطور عظیم شکاری مشہور ہوا۔

تاہم آگے چل کر رومیوں نے لوپرکس کو گڈریوں کا دیوتا بنا دیا۔ دراصل ان میں اک روایت نے جنم لیا کہ جب بھیڑ روم کے خالقوں، روملس اور ریموس (جڑواں بھائیوں) کو دودھ پلا رہی تھی، تو ان کے نگار کے باہر لوپرکس ہی پہرہ دے رہا تھا۔ یوں اسے رومی دیومالا میں اہم حیثیت دے دی گئی۔

رفتہ رفتہ اس واقعے کی یاد میں لوپرسیلیا (Lupercalia) کا تہوار منایا جانے لگا۔ اس تہوار کی مناسبت سے رومیوں نے مختلف رسومات ایجاد کر لیں۔ ایک ابتدائی رسم یہ تھی کہ تندرست اور خوبصورت نوجوان ایک کتا اور ایک بھیڑ ذبح کرتے اور ان کا خون اپنے بدن پر گرا لیتے۔ یہ لڑکے پھر بشکل جلوس سڑکوں میں چلتے اور سب سے آگے رہتے۔

ان لڑکوں نے ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے تھامے ہوتے۔ جو کوئی ان کے سامنے آتا، وہ اسے چمڑا مارتے۔ لیکن نوجوان عورتیں اور لڑکیاں بصد شوق یہ مار کھاتیں۔ دراصل ان کا ایمان تھا کہ یوں وہ بانجھ پن سے محفوظ رہیں گی یا ان کی یہ بیماری ختم ہو جائے گی۔ چونکہ اس جلوس میں نوجوان رومی لڑکے لڑکیاں زیادہ ہوتے، لہٰذا یہ تہوار باہمی میل ملاپ کا سبب بن گیا۔ اسی دن لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو تحائف دے کر دوستی بڑھانے لگے۔ حتیٰ کہ یہ نئی رسم سامنے آئی کہ قرعہ اندازی کر کے لڑکے اپنی سال بھر کی ساتھی (گرل فرینڈ) چننے لگے۔ یوں بتدریج تجدیدِ محبت کا موقع یا تہوار بن گیا۔ اسی تہوار نے آگے چل کر سینٹ ویلنٹائن ڈے کا چولا پہن لیا۔ مزید براں لوپرکس اب فطرت کا دیوتا بن بیٹھا۔

رومیوں کی نئی نسل نے نمرود کو ایک اور اہم دیوتا، سیٹرن (Saturn) کا روپ دے ڈالا۔ نئی روایت کے مطابق سیٹرن اپنے دشمنوں سے بھاگ کر اٹلی چلا آیا۔ وہ پھر اسی جگہ چھپا جہاں بعد ازاں روم تعمیر ہوا۔ اسی لیے روم کی نئی تعمیر (۷۵۳ قبل مسیح) سے پہلے یہ شہر سیٹرنیا کہلاتا تھا۔ تاہم دشمنوں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور قتل کر دیا۔ چنانچہ وہ رومیوں میں سینٹ (بزرگ) کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ وہی سینٹ ہے جو بعض مغربی مورخین کے نزدیک بعد ازاں سینٹ ویلنٹائن کی صورت جلوہ گر ہوا۔

روایات کے مطابق نمرود (بعل، شمس، لوپرکس یا سیٹرن) سرمائی انقلاب (Winter Solstice) میں پیدا ہوا تھا۔ زمانہ قدیم میں یہ فلکیاتی عمل ۴ر جنوری کو انجام پاتا۔ یہ بھی روایت ہے کہ بیٹے کی پیدائش کے ۴۰ دن بعد نمرود کی ماں پاکیزہ (Purified) ہوئی اور پہلی بار اپنے بچے کو لیے عوام کے سامنے آئی۔

رومی بھی پاکیزگی حاصل کرنے کی خاطر اس روز، یعنی ۱۵ فروری کو بطور تہوار منانے لگے۔ اس تہوار کی رسومات بھی لوپرسیلیا کا حصہ بن گئیں۔ کیونکہ ماضی میں سورج ڈوبنے کے وقت دن کا آغاز ہوتا تھا، چنانچہ ۱۴ فروری کی شام ہی سے لوپرسیلیا تہوار کی رسومات شروع ہو جاتیں۔

یہ واضح رہے کہ رومی دیومالا میں عشق کا دیوتا ایک بچہ، کیوپڈ ہے۔ یہ دراصل نمرود کے بچپن کا روپ ہے۔

روایات کے مطابق نمرود بچپن میں اتنا خوبصورت تھا کہ اس کی ماں اس پر عاشق ہو گئی۔ چنانچہ وہ نوجوان ہوا، تو اس نے بیٹے سے شادی کر لی۔ العنول ولا قوۃ۔ مصریوں نے نمرود کو اپنا ''اوزیریں'' (Osiris) دیوتا بنا لیا تھا۔ لہٰذا قدیم مصری کھنڈروں پر ثبت تحریروں میں اوزیریں (یعنی نمرود) کو ''اپنی ماں کا شوہر'' بتایا گیا ہے۔

غرض وقت کے ساتھ ساتھ رومیوں نے نمرود کو مقدس ہستی بنا ڈالا اور لوپرسیلیا کا تہوار عشق و شہوت کا نمائندہ بن گیا۔ یہی صورت حال جب روم میں عیسائیت کا پھیلاؤ شروع ہوا اور اگلی ۲۰۰ صدیوں میں تمام رومی عیسائی ہو گئے۔

لیکن رومیوں کی اکثریت اپنے قدیم تہوار چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ لہٰذا بہت سے تہواروں کو عیسائیت کا جامہ پہنا دیا گیا۔ ان میں سے ایک لوپرسیلیا بھی تھا۔ ۴۹۶ء میں پوپ گلاسس اول نے اس کی جگہ سینٹ ویلنٹائن تہوار کو رواج دیا۔ یہ دراصل ان ۳ عیسائی سینٹوں (پادریوں) کی یاد میں منایا جاتا ہے جنھوں نے کافر رومی شہنشاہوں کو مار ڈالا تھا۔

بعض لادینی عیسائی مورخین کا دعویٰ ہے کہ پوپ نے نمرود کو بہ شکل سینٹ ویلنٹائن زندہ کر ڈالا۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائی ۳ صدیوں میں تین چار سینٹ ویلنٹائن ملتے ہیں اور ان کے متعلق پوری معلومات بھی دستیاب نہیں۔

بہرحال پوپ گلاسس کا تخلیق کردہ تہوار اصلاً خیر پر مبنی تھا کیونکہ عیسائی روایات کے مطابق سینٹ ویلنٹائن کی سعی تھی کہ رومی زنا پرستی سے تائب ہو کر آپس میں شادی بیاہ کو فروغ دیں۔ چونکہ وہ مروجہ رومی روایات کے خلاف تھے، لہٰذا رومی شہنشاہ نے انھیں ہلاک کر ڈالا۔

سینٹ ویلنٹائن ڈے کو ازسرنو عشق معشوقی کا منبع دراصل چودھویں صدی میں برطانوی شاعر، جیفرے چاسر نے بنایا جو رومانی شاعری کا دلدادہ تھا۔ اس کے احباب نے اس تہوار پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف دینے کا رواج شروع کیا۔ یہ رواج پھر آہستہ آہستہ تمام مغربی ممالک میں پھیل گیا۔

یہ تہوار غلط ہے یا صحیح، اس بحث سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ سینٹ ویلنٹائن ایک غیر اسلامی تہوار ہے اور اسے مناتے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو جو تحفے دیتے یا جملے کہتے ہیں، وہ بھی دراصل مغربی تہذیب کی نقالی ہے۔ گو یہ نقالی پاکستانی معاشرے کے وہی طبقے کرتے ہیں جنھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی آغوش میں پرورش پائی یا اس سے متاثر ہیں۔ ان کا پاکستانی کلچر، تہذیب یا اسلامی روایات سے تعلق ہی نہیں رہا اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ انھی کی تہذیب اور سرگرمیاں ہر طرف حاوی ہو رہی ہیں۔

اسلام خوشی و مسرت کے تہواروں اور دنوں کی اہمیت تسلیم کرتا ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے اور ان کی زندگیاں دلفریب بناتے ہیں۔ مگر آپ دونوں عیدوں کے بنیادی اسلامی تہوار دیکھیے، ان کا خمیر سادگی، خیر، سنجیدگی اور متانت کی اقدار و روایات سے اٹھا ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشروں میں نشوونما پانے والے سینٹ ویلنٹائن ڈے جیسے تہوار کیونکر قبول ہو سکتے ہیں کہ جن کا مدعا ہی نوجوان لڑکے لڑکیوں میں خالص نفسانی خواہشات اور عاشقی معشوقی کو فروغ دینا اور شہوانی ضرورتوں کو بے لگام کرنا ہے۔

چنانچہ اگر آپ کو اپنی مذہبی، قومی اور مشرقی اقدار، روایات و تہذیب و تمدن پر فخر ہے، تو یہ تہوار ہرگز نہ اپنایئے بلکہ پوری جرأت اور دلیل کے ساتھ اسے رد کیجیے۔ لیکن کوئی مغربی تہذیب کا نقال بنتے ہوئے لڑکے لڑکیوں کے آزادانہ میل ملاپ کو جائز معاشرے میں صحت مندی کی علامت سمجھتا ہے، تو وہ عیسائیوں کا یہ تہوار منا لے۔ مگر نتائج و عواقب کا ذمے دار بھی اسی کو ہونا پڑے گا۔ بعض ناداں اور سادہ لوگ اس موقع پر اپنے ماں باپ کو بھی تحائف دیتے پائے گئے ہیں کہ یہ اظہار محبت کا تہوار ہے۔ ان کی نادانی پر صرف مسکرایا جا سکتا ہے۔ اسے اپنایا نہیں جا سکتا۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

غذا سے علاج

ایک قابلِ قدر اور بے حد مفید نیا سلسلہ

وزن وہ پائیں جو آپ کو پسند ہے

دوا سے نہیں غذا سے
اپنے موٹاپے کا علاج
کرنا سیکھیں۔ یہ راہنمائی
آپ کی زندگی کو سہل، آرام دہ
اور آسودہ ہی نہیں خوبصورت
بنانے میں بھی مدد کرے گی

نوشین ناز

www.Paksociety.com

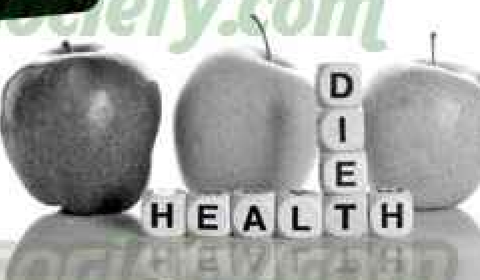

www.Paksociety.com

کی جو ڑے وال بالعموم ایک ہی بنیادی پہچان ہے۔ لوگ اسے عزت اور ذائقے کے لیے لیتے ہیں۔ خالی پیٹ بھرنے اور بھوک مٹانے کے لیے کی جانے والی غذا اور خوراک میں بھی ذائقہ ہی تلاش کیا جاتا اور وہ بھی خاص طور پر حفظ نے والوں کو مل جاتا ہے، چاہے کوجزا تو ڈالا جا کر ہی کیوں نہ ملے۔

انسانی دہلات میں موجود تحقیق و جستجو نے اس معاملے میں بھی خوب کام کیا ہے۔ غذا جسے لوگ کبھی صرف رنگوں اور ذائقوں سے پہچانتے تھے، اب ان کی الگ الگ تاثیر، فوائد اور خوبیاں دریافت کی جا چکی ہیں۔ یوں آج کی دنیا میں غذا ایک مستند طریق علاج کے طور پر جانی جاتی ہے۔

ہر غذا ہر شخص کے لیے نہیں

ہم میں سے بہت کم لوگ غور کر پاتے ہیں کہ ہر غذا ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر مقدار ہر جسم کے لیے ہوتی ہے۔ جونہی مقدار بڑھتی ہے، وزن بڑھتا ہے۔ غذا جو آپ کے جسم کے لیے موزوں نہیں، اس کے بار بار اور مسلسل استعمال سے بھی ایسے ہی ان چاہے نتائج سامنے آتے ہیں، جو ہم اپنے چاروں طرف بڑھتے ہوئے اور پھیلے ہوئے موٹے پیٹوں اور جسموں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایک اور بنیادی بات بھول جاتے ہیں کہ بڑھاپے کی غذا یکسر الگ ہوتی ہے۔ جوان جسم کی ضرورتیں اور ہیں۔ اسی طرح بچپن اور نوعمری کی غذا، مقدار، تناسب ہر چیز میں فرق ہے۔

یاد رکھیے! غذا اپنی تاثیر اور اثرات کے لحاظ سے قد کاٹھ اور عمر کے ساتھ ساتھ جنس پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ مردوں کو جس قدر حراروں یا کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ عورتوں سے زیادہ ہے۔ اس میں کوئی عورت، مرد کا مقابلہ کرنے نہ بیٹھ جائے۔ حقیقت یہی ہے کہ اللہ رب العالمین نے دونوں جنسوں کے جسموں کی ضرورتیں الگ الگ رکھی ہیں۔

اچھی صحت کا براہ راست تعلق انسانی وزن سے ہے۔ اگر یہ وزن قد اور عمر کے تناسب سے درست ہو تو صحت کی پوری عمارت صحیح بنیادوں پہ کھڑی ہوتی ہے ورنہ جوں جوں وزن بڑھتا ہے، بیماریوں کی ایک پوری دنیا انسان کے وجود میں اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ جوڑوں کے درد سے لے کر فشارِ خون، ذیابیطس، کولیسٹرول میں اضافہ، دل کے دورے، حتیٰ کہ خواتین میں ایام سے لے کر پیچیدگی تک کے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ نتیجے میں ناخوشی ہی نہیں، بے آرامی، بے یقینی اور رشتوں کے ٹوٹنے تک کی نوبت آ جاتی ہے۔

مجھے امید ہے اردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے شروع کیا جانے والا یہ نیا سلسلہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ آپ اپنے نام، عمر، وزن، قد اور شادی شدہ/غیر شادی شدہ زندگی کی بنیادی تفصیلات کے ساتھ اپنا سوال بھجوا سکتی/سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ کوشش کروں گی کہ اپنی پسند کا وزن پانے کی خواہش پوری ہونے کے بعد آپ خوشگوار زندگی کا معمول اپنائیں۔

تجربے نے ثابت کیا ہے کہ کھانے کی مقدار ہی نہیں، ترتیب میں بھی حکمت ہے۔ بطور ماہرِ غذائیت اور نیوٹریشن میں نے سالوں میں بہت کچھ نیا سیکھا۔ کتابوں سے پڑھا علم پڑ جاتا ہے مگر تجربے میں آئی باتیں حقیقتیں بھی کم نہیں ہوتیں۔ میں اس لحاظ سے بے حد خوش قسمت ہوں کہ مجھے اس پروفیشن میں آنے کے ساتھ بے شمار خواتین اور حضرات کی زندگی آسان، بہتر، زیادہ خوبصورت اور زیادہ کارآمد بنانے کا موقع ملا ہے۔ کامیابی کا فلسفہ یہ ہے کہ جب یہ ملتی ہے خوشی اور سکھ دیتی ہے۔ پھر آپ اسے حاصل کرنے کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے۔ ایروبک کلاسز لیتے لیتے اور عمر کی ہدایات اور راہنمائی دیتے دیتے زندگی کا Passion ہی بذریعہ غذا دوسروں کی خدمت کرنا بن گیا ہے۔ بے حد مشکل کام ہے مگر جو بھی پہلے جیسے اپنے تناسب کی جانب آتی ہے، ساتھ ہی ڈھیر ساری دعائیں ملنے لگتی ہیں تو آپ کا یقین اور بڑھ جاتا ہے۔ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں پر ایمان اور بھی تازہ ہو جاتا ہے۔

اس ماہ کے سوالات میری پچھلی کلاسز کے ہیں، جو میری فائلز میں موجود تھے۔ الحمدللہ! یہ سب اپنے وزن میں قابلِ قدر کمی کر کے صحت اور آرام وہ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میرے اطمینان کے لیے ان کی خوشی اور دعائیں بے حد اہم ہیں کہ میری دی راہنمائی اور بتائے ہوئے ڈائیٹ پلان پر انھوں نے مستقل مزاجی اور ہمت سے عمل کیا۔ زیادہ وزن بڑھ جانے کے مسئلے کا ہم میں سے اکثر کو سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جھجک یا ارادے کی کمزوری کے باعث مشورے سے بھی ڈرتے ہیں اور مشورے پر عمل کرنے کے لیے بھی جس توانائی اور ول (Will) کی ضرورت ہوتی ہے اسے بھی کام میں نہیں لاتے۔ بس اتنا یاد رکھیے! اگر مٹاپے جیسی بیماریاں زندگی کا حصہ بن گئی ہیں تو حل اور علاج بھی قدرت نے سمجھائے اور سکھائے ہیں۔ مشرق میں تو صدیوں سے ہمارے بزرگوں، دانشوروں اور حکما کی روایت ہے کہ دوا سے پہلے غذا سے علاج زیادہ مستحکم اور محفوظ ہوتا ہے۔

۸۰ کلو وزن۔ کتنا کم کرنا ہوگا

س: میری عمر ۲۸ سال، قد ۵ فٹ ۲ انچ ہے۔ شادی شدہ ہوں اور ۲ بیٹیاں ہیں۔ وزن ۸۰ کلو ہے۔ مجھے کتنا وزن کم کرنا ہوگا نیز بتائیے کہ مجھے کیا کھانا چاہیے۔ (منزہ لیاقت، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور)

ج: آپ کو کم از کم ۲۷ سے ۲۶ کلو وزن کم کرنے کی ضرورت ہے۔ موزوں جسمانی حالت پانے کے لیے ایک گھنٹہ پیدل چلیں۔ صبح ایک پھل کھائیں، پھر ٹھیک ۲ گھنٹے بعد رات بھر بھگوئے ہوئے ۷ بادام، ابلا ہوا ایک انڈا، ایک رس اور بغیر چینی کے چائے کی ایک پیالی لیں۔ دوپہر کے کھانے میں steam کی ہوئی سبزیوں کی ایک پلیٹ، نیز ایک سے دو پیس چکن استعمال کریں۔ رات کے کھانے میں ایک پیالی بند گوبھی، ایک ٹماٹر اور چکن یا پاؤ بھر مچھلی براؤن بریڈ کے ساتھ استعمال کرلیں۔ اگر اس دوران بھوک محسوس ہو تو ایک عدد سیب یا پھر ایک پیالی سکمڈ ملک لے لیں۔ پانی زیادہ استعمال کریں۔ اگر آئندہ خوراک کے بارے میں کچھ پوچھنا مقصود ہو تو گزشتہ غذائی معمول اور اوقات ضرور لکھیں۔

موٹاپا مزید اولاد میں رکاوٹ ہے

س: میری عمر ۳۵ سال اور وزن ۷۰ کلو ہے۔ قد ۴ فٹ ہے۔ میرا فشار خون بھی اکثر کم رہتا ہے۔ ایک بیٹا ہے جس کی عمر ۱۲ سال ہے۔ مزید اولاد ہونے میں موٹاپا رکاوٹ ہے۔ میرے لیے ایسا غذائی معمول تجویز کردیں کہ میرا وزن کم اور اولاد کی امید ہو۔ (سمیرا حلیم، سبزہ زار لاہور)

ج: عمر اور قد کے لحاظ سے آپ کا وزن بہت زیادہ ہے جو کم از کم ۳۰ سے ۳۵ کلو کم ہونا چاہیے۔ وزن کم کرنے کے لیے کافی صبر و تحمل درکار ہے۔ محض ایک دن موزوں غذائی معمول اپنانے سے فوری نتیجہ ممکن نہیں۔ آپ کو مسلسل محنت و لگن سے کام لینا ہوگا۔ موزوں خوراک کا مطلب ہرگز نہیں کہ آپ بھوکے رہیں بلکہ مسلسل اور تھوڑا تھوڑا کھانا بے حد مفید ہے۔ سب سے پہلے آپ اپنے معمولاتِ زندگی میں ہلکی پھلکی ورزش شامل کریں اور غذائی معمول بھی اپنائیں۔ ہر روز ایک گھنٹہ پیدل چلنے کا معمول عین دوا کے مانند ہے۔ اسی طرح کافی مقدار میں پانی کا استعمال بھی بے حد مفید ہے۔ احتیاط کیجیے کہ کھانے کے درمیان پانی نہ لیں۔ شدید ضرورت محسوس ہو تو تھوڑا پانی استعمال کیجیے۔ پانی ہمارے جسم میں سے زہریلے مادے خارج کرتا ہے۔ آپ کے لیے ۱۵ روزہ غذائی معمول درج ذیل ہے:

ناشتے میں ایک عدد ابلا انڈا اور ایک پیالی سکمڈ ملک۔ اگر چائے کی شوقین ہیں تو بغیر چینی کے چائے ایک گھنٹے بعد لے سکتی ہیں۔ دوپہر کے کھانے سے نصف گھنٹہ پہلے ایک پیالہ سلاد استعمال کریں۔ دوپہر کے کھانے میں فور گرین آٹے سے بنی چھوٹی سی روٹی مونگ یا مسور کی پتلی سی دال کے ساتھ کھائیں۔ مزید بھوک لگنے پر بند گوبھی اور ٹماٹر کا سلاد مزید استعمال کرسکتی ہیں۔ شام کی چائے آپ ناشتے کے استعمال کریں۔ رات کے کھانے میں بکرے کے گوشت کا شوربا یا کالے چنوں کے شوربے کے ساتھ فور گرین آٹے کی روٹی کھائیں۔ رات سونے سے پہلے ایک پیالی سبز چائے استعمال کریں۔ غذائی معمول بارے استفسار کرتے ہوئے عمر، قد، وزن اور گزشتہ غذائی معمول ضرور لکھیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

مشورے کی فوری ضرورت ہو تو دوپہر ۱۲ سے ۲ بجے تک مجھ سے 0301-4585405 پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

www.paksociety.com

بھارت میں اردو کے انجانے محافظ

خان

اردو کے اہم ترین سفیر

ان مسلمان اداکاروں کا تفصیلی تذکرہ، جن کے بھارت کی فلم انڈسٹری میں ہونے سے اردو کو بہترین دوست کی جیسی پشت پناہ بھی میسر آئے

سید عاصم محمود

میرے والد، سید قاسم محمود ۲۰۰۸ء میں اپنا آبائی قصبہ، کھرکھودہ دیکھنے بھارت گئے۔ یہ دہلی کے قریب واقع ایک تاریخی قصبہ ہے جہاں اورنگ زیب عالمگیر نے مسجد بھی بنوائی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں والد مرحوم بڑی مشکل سے جان بچا کر پاکستان پہنچے تھے۔ وطن واپسی پر انہوں نے ایک دلچسپ قصہ سنایا۔

ہوا یہ کہ وہ دہلی میں بس پر سفر کر رہے تھے۔ ان کی منزل غالب اکادمی تھی۔ اگلی نشستوں پر ۲، ۳ ہندو نوجوان بیٹھے تھے۔ وہ آپس میں محو گفتگو تھے اور خاصی بلند آواز میں۔ ایک نوجوان بولا ”ارے! امیتابھ بچن کی نئی فلم سرکار راج لگ گئی ہے۔“

دوسرا نوجوان بے زاری سے بولا ”رام قسم، مجھے اس بڈھے کی کوئی فلم پسند نہیں۔ اتنی مشکل ہندی بولتا ہے کہ سمجھ ہی نہیں آتی۔ میں تو کہوں، شاہ رخ کی بھی نئی فلم آئی ہے، وہ دیکھنے چلتے ہیں۔“

یوں دونوں نے شاہ رخ خان کی فلم دیکھنے پر اتفاق کر لیا۔ قصہ سنا کر والد مرحوم کہنے لگے ”یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بمبئی کی فلموں نے بھارت میں اردو زبان کو زندہ رکھنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی ہندو نسل بھی آسان ہندی (اردو) میں فلمیں دیکھنا پسند کرتی ہے۔“

یہ بات بالکل درست ہے اور اسے مدنظر رکھتے ہوئے دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ مسلمان اداکار و

اب کسی کو فلمیں پسند بھی ہوں تو بھی وہ ان اداکاروں کے نام اور تصاویر پہچانتا ہے مگر سب سے اہم کام جو ان لوگوں نے کیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے اردو کو زندہ رکھا ہے۔ بھارت کے عام لوگ بھی اردو کو ہندی سے الگ جانتے ہیں۔ امیتابھ بچن جیسے اداکار جو عام زندگی میں کافی متعصب ثابت ہوئے اور جان بوجھ کر سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ عام گفتگو میں استعمال کر کے ہندو تہذیب و زبان کو غالب کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ یہ مسلمان اداکار جہاں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں وہاں ان کے ہونے سے اردو کو بہترین دوست اور پشت پناہ میسر آتے ہیں۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

اداکارائیں بالی وڈ پر چھائی رہیں۔ ان کی خامیاں اپنی جگہ لیکن یہ خوبی بھی معمولی نہیں کہ انہی کے دم قدم سے بھارت میں اُردو نہ صرف زندہ ہے، بلکہ پھل پھول رہی ہے۔ یہ تاریخی سچائی ہے کہ اُردو سے انتہا پسند ہندو راہنماؤں کی نفرت نے ہی مسلم قائدین کو یہ احساس دلایا کہ ایک علیحدہ وطن ضروری ہے تاکہ وہ آزادی سے مذہبی رسوم و رواج پر عمل کر سکیں۔

بالی وڈ فلمی صنعت دنیا کے بڑے فلمی مراکز میں سے ایک ہے۔ یہاں ہر سال ۲۰۰ فلمیں تخلیق ہوتی ہیں۔ (جبکہ پورے بھارت میں مختلف زبانوں کی ۱۰۰۰ فلمیں بنتی ہیں۔) اس کے برعکس پورے پاکستان میں ۴۰ فلمیں بھی سامنے نہیں آتیں۔ پھر بھارت میں فلمی ستارے نئی نسل پر بے پناہ اثرات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلمان خان ''یا علی مدد'' کا نعرہ لگا کر بہادری کا کوئی کام کرے، تو ہندو نوجوان بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جبکہ انھیں ایسی کوئی فلم پسند نہیں جس میں پیچیدہ سنسکرت زبان بولی جائے۔ انتہا پسند ہندوؤں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود سنسکرت عوامی بولی نہیں بن سکی۔ یہ اعزاز اردو ہی کو حاصل ہے اور ان شاء اللہ حاصل رہے گا۔

مزید براں نئی آنے والی ہندی فلموں میں ایک امید افزا بات یہ دیکھنے کو ملی ہے کہ ان میں اردو محاوروں اور ضرب الامثال کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مکالمے اور اسکرپٹ لکھنے والے ہندو ادیبوں کو بھی کہا جاتا ہے کہ وہ زبان آسان، رواں اور شستہ رکھیں۔ چنانچہ موقع محل کے مطابق متعصب ہندو فلمکار بھی مجبور ہو گئے ہیں کہ وہ اردو محاورے استعمال کریں۔ لہٰذا آج کل کی بھارتی فلمیں دیکھتے ہوئے قطعاً یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایسے ملک میں بنی ہیں جس نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اور کم از کم وہاں کا انتہا پسند طبقہ پاکستان کو پسند نہیں کرتا۔

قیام پاکستان سے قبل ہندوستانی فلمی صنعت کے ہر شعبے میں مسلمان اداکار، اداکارائیں، ہدایتکار (ڈائریکٹر) فلم ساز (پروڈیوسر) اور دیگر ہنرمند مصروف کار تھے۔ انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ذریعے ہندوستانی فلمی صنعت کو ترقی دی اور سیکڑوں لازوال فلمیں تخلیق کیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خاص طور پر بیشتر اداکاروں کا تعلق خیبر پختونخوا (صوبہ سرحد) یا افغانستان سے تھا۔ وجہ یہی ہے کہ ان علاقوں کے مرد وجاہت، وقار اور دلکشی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں اور جب وہ اداکاری کی تکنیک سمجھ لیں، تو ان کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فلمی صنعت کے پہلے ''سپر اسٹار'' ایک مسلمان یوسف خان ہی تھے۔ گو انھیں ہندو تعصب سے بچنے کی خاطر اپنا ہندوانہ نام دلیپ کمار رکھنا پڑا۔ ۸۸ سالہ دلیپ کمار دنیائے فلم میں ''شہنشاہ جذبات'' کے خطاب سے معروف ہیں۔ ستیہ جیت رائے جیسے بڑے بنگالی ہدایت کار کی رائے ہے ''ہندوستان میں صرف دلیپ کمار ہی بہترین اداکارانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔''

یوسف خان

دلیپ کمار پشاور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، لالہ غلام سرور پھلوں کے آڑھتی تھے۔ کاروبار کی وجہ سے وہ بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہیں پھر ان کے خوبصورت اور ذہین فرزند کی فلمی زندگی کا آغاز ہوا۔ دلیپ صاحب کی پہلی فلم ''جوار بھاٹا'' تھی جو ۱۹۴۴ء میں ریلیز ہوئی۔ انھوں نے پھر ۶۰ سے زائد فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے اور کئی اعزاز پائے۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کی رو سے آپ ہی سب سے زیادہ اعزازات پانے والے بھارتی اداکار ہیں۔ بھارتی حکومت نے آپ کو پدم بھوشن سے نوازا جبکہ حکومت پاکستان بھی نشان امتیاز عطا کر چکی ہے۔

ہندوستانی فلمی صنعت میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے کئی مسلمان اداکار بھی موجود تھے۔ مثلاً محمد رفیع جنھیں عظیم ترین ہندوستانی گلوکار کا اعزاز حاصل ہے۔ لیکن ذیل میں ان معروف فلمی ستاروں کا تذکرہ پیش ہے جن کے اجداد خیبر پختونخوا (صوبہ سرحد) یا افغانستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

www.Paksociety.com

محبوب خان

مشہور ہدایت کار جنھوں نے ۱۹۵۷ء میں فلم ''مدر انڈیا'' بنا کر ہندوستانی فلمی تاریخ میں اپنا نام امر کر دیا۔ جذبات نگاری میں اس فلم کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ محبوب خان (۱۹۰۷ء-۱۹۶۴ء) کے اجداد افغانستان سے ہندوستان آئے اور پھر یہیں رچ بس گئے۔ آپ نے ''مدر انڈیا'' کے علاوہ کئی یادگار فلمیں تخلیق کیں جن میں عورت (۱۹۴۰ء)، روٹی (۱۹۴۲ء)، انمول گھڑی (۱۹۴۶ء)، انوکھی ادا (۱۹۴۸ء)، انداز (۱۹۴۹ء) اور آن (۱۹۵۲ء) قابل ذکر ہیں۔ ستمبر ۲۰۰۸ء میں محبوب خان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بھارتی حکومت نے ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔

ممتاز جہاں بیگم

اگر دلیپ کمار اپنے زمانے میں نئی نسل کے دلوں کی دھڑکن تھے، تو اداکاراؤں میں مدھوبالا ۱۹۳۳ء-۱۹۶۹ء کا طوطی بولتا تھا۔ اردو مکالموں کی خوبصورت ادائی اور بہترین اداکاری کرنے میں ان دونوں کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مدھوبالا آج بھی حسین ترین بھارتی اداکاراؤں میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔

مدھوبالا کا اصل نام ممتاز جہاں بیگم تھا۔ ان کے والد، عطاء اللہ خان کابل، افغانستان کے محمد زئی نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب حکومت وقت سے بگاڑ ہوا، تو وہ ہندوستان چلے آئے۔ مدھوبالا کی پہلی فلم، بسنت ۱۹۴۲ء میں سامنے آئی۔ دیگر مشہور فلموں میں نیل کمل، محل، دلاری، ناداں، ترانہ، مغل اعظم اور چلتی کا نام گاڑی شامل ہیں۔ دلیپ کمار سے ناکام رومان کے باعث مدھوبالا کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا۔

سلیم خان

فلمی گانوں کی تخلیق میں ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری نے نام کمایا، تو کہانیوں میں ۷۶ سالہ سلیم خان نے شہرت پائی۔ سلیم خان کے والد افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ آپ کی تحریر کردہ فلموں میں ہاتھی میرے ساتھی، زنجیر، یادوں کی بارات، شعلے، ڈان، شان، دوستانہ، کرانتی، شکتی، مسٹر انڈیا اور دل تیرا دیوانہ بہت مشہور ہوئیں۔ سلیم خان آج کے مشہور ترین ''خان اداکاروں'' میں سے ایک، سلمان خان کے والد ہیں۔

سلمان خان

۴۵ سالہ سلمان خان مزاجاً سنجیدہ، ہر قسم کی اداکاری بخوبی کر سکتا ہے۔ رومانی فلموں کے باعث زیادہ مشہور ہوا اور اب بالی وڈ کے ممتاز ترین اداکاروں میں سے ایک ہے۔ ۱۹۸۸ء میں اس کی پہلی فلم، بیوی ہو تو ایسی ریلیز ہوئی۔ بحیثیت اداکار سلمان کی نمایاں فلمیں یہ ہیں: میں نے پیار کیا، پیار کیا تو ڈرنا کیا، باغبان، نو انٹری، دبنگ، ریڈی اور باڈی گارڈ۔ ۸۰ سے زائد فلموں میں کام کر چکا۔ ۲۰۱۱ء میں بطور ہدایت کار بچوں کی فلم، چلر پارٹی بنائی۔ اپنی فلموں میں کم از کم سنسکرت الفاظ استعمال کرنا پسند کرتا ہے۔

ارباز اور سہیل خان

سلیم خان ہی کے دو فرزند، ارباز اور سہیل بھی فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے۔ ۴۳ سالہ ارباز اداکار اور ہدایت کار ہے۔ تاہم ۲۰۱۰ء میں ہی اسے شہرت ملی جب بحیثیت ہدایت کار اس کی بنائی فلم ''دبنگ'' نے کامیابیوں کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ تیسرا بھائی سہیل بھی ہدایت کار ہے۔ اس کی ۲۰۰۷ء میں بنائی فلم، پارٹنر کو شہرت ملی تھی۔

فیروز خان

ایک اور مشہور خان اداکار جس کے خانوادے نے بھارتی فلمی صنعت کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ فیروز خان (۱۹۳۹ء-۲۰۰۹ء) کے والد، صادق علی خان کا تعلق غزنی، افغانستان سے تھا۔ فیروز خان اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ''قربانی'' فلم بنائی جس کے گانوں

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

عامر خان

اس ۴۶ سالہ جوان کو بالی وڈ میں سب سے "ورسٹائل" اداکار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہدایت کار بھی ہے اور لگان و تارے زمین پر جیسی شاندار فلمیں بنا کر ہر ایک سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ عامر خان کے والد، طاہر حسین کے اجداد بھی افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ طاہر حسین اور ان کے بھائی، ناصر حسین، دونوں ہدایت کار اور فلم ساز تھے۔

ناصر حسین کے بیٹے، ہدایت کار منصور خان ہی نے ۱۹۸۸ء میں مشہور فلم "قیامت سے قیامت تک" بنائی جس کے ذریعے ان کے بھتیجے عامر خان کو بحیثیت اداکار شہرت ملی۔ نیز اداکارہ جوہی چاولہ کا بھی فلمی کیریئر شروع ہوا۔ منصور خان کی دیگر کامیاب فلموں میں جو جیتا وہی سکندر، اکیلے ہم اکیلے تم اور جوش نمایاں ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ منصور خان ہی نے ۲۰۰۸ء میں "جانے تو یا جانے نہ" کی ہدایات دیں۔ اسی فلم سے ان کے ایک اور بھتیجے، باصلاحیت اداکار، ۲۸ سالہ عمران خان کا فلمی کیریئر شروع ہوا۔ عمران، ناصر حسین کے دوسرے بیٹے نزہت کا فرزند ہے۔ ۲۰۰۸ء میں اسے بہترین ابھرتے اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔

عامر خان کی پہلی فلم ہولی تھی، جو ۱۹۸۴ء میں ریلیز ہوئی۔ تب سے وہ کئی کامیاب فلموں میں جلوہ گر ہو چکا۔ ان میں قیامت سے قیامت تک، جو جیتا وہی سکندر، انداز اپنا اپنا، رنگیلا، راجہ ہندوستانی، لگان، رنگ دے بسنتی، تارے زمین پر اور تھری ایڈیٹس نمایاں ہیں۔ تھری ایڈیٹس کو بھارتی سینما کی تاریخ میں سب سے زیادہ کمائی کرنے والی فلم کا اعزاز حاصل ہے۔ اس نے فلم ساز کو ۳۵۸ کروڑ روپے کما کر دیے۔ عامر خان کو بھارتی حکومت نے پدم بھوشن عطا کر رکھا ہے۔

کو بڑی شہرت ملی۔ بحیثیت اداکار آخری مشہور فلم ویلکم تھی۔

فیروز خان کا ۳۷ سالہ بیٹا، فردین خان بھی اچھا اداکار ہے۔ وہ نو انٹری اور لائف پارٹنر جیسی کامیاب فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھا چکا۔ ۷۰ سالہ سنجے خان، فیروز کا بھائی ہے۔ اس نے بھارتی ٹی وی پر ۹۰ قسطوں کا طویل ڈراما "ٹیپو سلطان" بنایا اور کئی فلموں میں بھی کام کیا۔ سنجے خان کے ۳۱ سالہ بیٹے، زید خان نے بھی فلمی شعبے میں قدم رکھا۔ وہ بعض اچھی فلموں میں کام کر چکا۔

نصیر الدین شاہ

یہ ۶۱ سالہ مشہور اداکار بھی خان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ آپ کے دادا کے پردادا، افغان سردار، جان فشاں خان نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے دو دو ہاتھ کیے تھے۔ خان گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث ہی نصیر الدین شاہ کی آواز میں کڑک اور گھن گرج ہے۔ آپ کی اداکارانہ صلاحیتوں کا لوہا پوری دنیا مانتی ہے۔

نصیر الدین شاہ کی پہلی فلم نشانت ۱۹۷۵ء میں ریلیز ہوئی۔ مشہور فلموں میں بھومیکا، سفارش، امراؤ جان ادا، موہن، کرماں، جلوہ، سرفروش اور کرش شامل ہیں۔ ٹی وی سیریل میں مرزا غالب کا کردار بڑی خوبصورتی سے نبھایا۔ آپ کو پدم بھوشن کا اعزاز مل چکا۔

قادر خان

اس ۷۵ سالہ اداکار کی عوامی اداکاری روتوں کو بھی ہنسا دینے کی قدرت رکھتی ہے۔ پشین، بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ اجداد افغانستان سے آئے تھے۔ بعدازاں ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے۔ دلیپ کمار نے فلموں میں متعارف کرایا۔ ۳۰۰ سے زائد فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ فلمی ادیب بھی ہیں اور ۱۰۰ سے زائد فلموں کے مکالمے لکھے۔ ۱۹۷۶ء میں پہلی فلم [illegible] ریلیز ہوئی۔

مشہور فلموں میں قربانی، قلی، بیوی ہو تو ایسی وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں فلم باپ نمبری، بیٹا دس نمبری پر بہترین مزاحیہ اداکار کا ایوارڈ جیتا۔

شاہ رُخ خان

یہ ۴۶ سالہ اداکار تو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پچھلے ۱۰ برس میں موصوف کی اتنی زیادہ فلمیں مقبول ہوئیں کہ اب "شاہِ بالی وڈ" (King of Bollywood) کہلاتے ہیں۔ بے پناہ کامیابیوں کے باوجود منکسر المزاج اور غربا کے ہمدرد ہیں۔

شاہ رخ کے والد تاج محمد خان پشاور سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔ والدہ لطیف فاطمہ سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے جرنیل، شاہنواز خان کی لے پالک بیٹی ہیں۔ شاہ رخ کی پہلی فلم، دیوانہ ۱۹۹۲ء میں سامنے آئی۔ اس کے بعد کئی مشہور فلموں میں کام کیا۔ بھارتی حکومت پدم شری اعزاز سے نواز چکی۔

شاہ رخ نجی زندگی میں بڑے شرمیلے ہیں۔ کہتے ہیں، اپنی شرم پر قابو پانے کے لیے ہی انھوں نے اداکاری کا سہارا لیا۔ انھوں نے ایک تقریب کے دوران پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھا...... اور بعدازاں اسی سے شادی کر لی۔ اپنی بیگم اور بچوں سے از حد محبت کرتے ہیں۔ اپنی ۷۰ سے زائد فلموں میں سے پوری صرف ۳۰ دیکھی ہیں۔ ساتھی اداکار شاہ رخ کے دوستانہ برتاؤ اور انکسار کی وجہ سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ اس وقت بالی وڈ میں نت نئے اداکار سامنے آ رہے ہیں لیکن ان کی چمک تاحال پھیکی نہیں ہوئی ہے۔

پچھلے سال ماہ اکتوبر میں ان کی فلم، راون ریلیز ہوئی۔ اسے بھارتی فلمی تاریخ کی سب سے مہنگی فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شاہ رخ چاہتے ہیں کہ اب ایسی فلمیں بنائی جائیں جنھیں مغربی ناظرین بھی دیکھ سکیں۔ وہ کہتے ہیں "بالی وڈ رفتہ رفتہ بھارتی منڈیوں میں داخل ہو رہا ہے۔ اگر بھارتی فلمی صنعت اپنی بقا چاہتی ہے، تو اسے فلموں کا معیار بڑھانا ہو گا۔" وہ تسلیم کرتے ہیں کہ راون کا سکرپٹ کمزور تھا۔

بالی وڈ کے ابھرتے خان، عمران خان کو شاہ رخ اپنی متحرک شخصیت کے باعث پسند ہیں۔ وہ کہتا ہے "میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ شاہ رخ میں کتنی توانائی بھری ہے۔ وہ ہر وقت چست و چالاک نظر آتے ہیں۔ ان کے متحرک پن سے ہم نوجوان بھی تحریک حاصل کرتے ہیں۔"

امجد خان

ایک اور نامور بالی وڈ اداکار اور ہدایت کار امجد خان (۱۹۴۰ء-۱۹۹۲ء) نے ۱۳۰ فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ والد، زکریا خان غوری سے تعلق رکھتے تھے۔ شعلے فلم میں آپ کا کردار "گبر سنگھ" بہت مشہور ہوا۔ اس نے ولن کی اداکاری کے ایک نئے رجحان کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۵۷ء میں پہلی فلم، ابھی دلی دور نہیں سینماؤں میں لگی۔ شعلے، مقدر کا سکندر، مسٹر نٹور لال، قربانی، کالیا، لاوارث، نصیب، یارانہ، ستے پہ ستا، ویلکم بیک اور تاجنگ مشہور فلمیں ہیں۔ افسوس، ایک حادثے نے آپ کی جان لے لی۔

عرفان خان

۴۸ سالہ عرفان خان بھی ہمہ جہت اداکار ہیں۔ کردار سنجیدہ ہو یا مزاحیہ، دونوں بڑی مہارت سے ادا کرتے ہیں۔ جے پور کے پٹھان خاندان سے تعلق ہے۔ پہلی فلم "سلام بمبئی" تھی جو ۱۹۸۸ء میں ریلیز ہوئی۔ مشہور فلموں میں حاصل، مقبول، لائف ان میٹرو، بلو باربر اور سلم ڈاگ ملینئر شامل ہیں۔

فرح خان

۴۶ سالہ فرح نے بحیثیت ہدایت کار اور فلم ساز شہرت کمائی ہے۔ اجداد افغانستان سے آئے تھے۔ آپ کی ہدایتکاری میں اوم شانتی اوم اور میں ہوں نا فلمیں مشہور ہوئیں۔ فرح کا بھائی ساجد خان مزاحیہ اداکاری اور پروگراموں کی میزبانی کے علاوہ ہدایت کاری میں بھی نمایاں ہے۔

www.Paksociety.com

ہماری کسٹمری برانڈنگ بھارت کے مقابلے میں
کمزور ہے، اسے بہتر کرنے کی کوشش کرنی ہوگی

”شارٹ کٹ سے کبھی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی“

پاکستان کی نمایاں آئی ٹی کمپنی
کاروٹ کے پرعزم چیف ایگزیکٹو

کاشف الحق

سے ملاقات

ملاقات: اختر عباس
ریکارڈنگ: طیب اعجاز قریشی، عاطف مرزا
تعاون: شایان

www.paksociety.com
www.Paksociety.com

غالب

روڈ پر دفتر ہونے کا لازمی مطلب اگر غالب ہونا ہوتا تو لاہور کے پوش علاقے گلبرگ میں ''چین'' کے سامنے سے نکلنے والی اس مصروف سڑک پر واقع سبھی دفاتر اور کمپنیوں کو اپنے اپنے شعبوں میں غالب ہونا چاہیے تھا۔ مگر عملاً ایسا تھا نہیں۔ وہاں تو کتنے ہی بے نام دفاتر اور گھر ایسے بھی تھے جنھیں ایک دوسرے کے ساتھ والے بھی نہیں جانتے۔ کئی ایسے بھی ہیں جنھیں کامیابی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے ابھی بہت وقت چاہیے تھا۔ ویسے میرا گمان ہے اگر دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اسداللہ غالب کے نام سے موسوم اس سڑک پر شاید کچھ لوگ غالب کو جاننے والے نکل ہی آئیں۔

''کاروٹ'' کا لفظ ایک بورڈ پر لکھا دیکھا تو گاڑی موڑ کر ایک ذیلی سڑک پر کھڑی کرتے ہوئے میں نے عاطف سے کہا ''گراؤنڈ فلور پر جعفر برادرز کا دفتر ہے اور فرسٹ فلور پر کاروٹ کا دفتر، بظاہر غالب ہونے کا تو آسان نسخہ ہے۔'' عاطف مسکرایا مگر وہ ابھی تک کاروٹ کے لفظی معانی ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔ جوہر ٹاؤن سے یہاں تک آتے ہوئے ہم ''کاروٹ'' اور اس کے سی۔ای۔او کاشف الحق کے بارے میں اپنے نوٹس ملاتے آرہے تھے۔ کتنے ہی لوگوں نے اصرار کیا، مشورہ دیا تھا، ہر ماہ کسی سیاسی لیڈر کا انٹرویو کرلیا کرو آسانی بھی ہے اور فائدہ بھی اور میرا یقین ''اشوکا کی لاٹ'' کی طرح قائم تھا کہ اس ملک اور اس کی نئی نسل کو آگے لے کر چلنا ہے تو ان کو نئے پُرعزم اور باصلاحیت لیڈرز سے متعارف کرایا جانا لازم ہے جو باتوں سے پیٹ نہ بھرتے ہوں۔ انھوں نے فی الواقع کچھ کر کے دکھایا ہو۔ ان کی آنکھیں روشن اور ان میں اپنے ملک کے لیے خواب سانس لیتے ہوں۔

''خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے'' کے مصداق طیب اعجاز صاحب نے اس معاملے پر صاد کیا اور ہم دھیرے دھیرے اپنے ویژن اور خیال سے ہم رنگ اور ہم آہنگ بزنس لیڈرز کی تلاش میں آگے بڑھنے لگے۔

پاکستان میں تیز رفتاری سے ترقی کرنے والی ۲۵ کمپنیوں کے انتخاب نے ہمارا کام تھوڑا آسان کردیا۔ شفاف طریقے سے کام کرتے، اچھا اور بہتر سوچتے، اپنے لوگوں کی عزت کرتے ہوئے اور ان کا مستقبل بہتر کرتے ہوئے سالوں سے مسلسل ترقی کرنے والی یہ کمپنیاں بے شک وطن عزیز کی نئی پہچان بن رہی ہیں۔

''کاروٹ'' بھی انھی ۲۵ کمپنیوں میں سے ایک ہے جس کی سیڑھیوں سے ذرا پہلے ایک نوجوان لڑکا گارڈ کی وردی پہنے ہم سے فرمائش کر رہا تھا کہ رجسٹر پر اپنا اندراج کریں۔ استقبالیے سے ایک نوجوان کی راہنمائی میں ہم اس شخصیت سے ملنے والے تھے جس نے صرف ۱۲ سال میں آئی ٹی کی دنیا میں مقام بنالیا تھا، جو کسی برانڈ کی طرح اہم اور قابل بھروسا بن چکا ہے۔ عین اس لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی جب گارڈ دروازہ کھول چکا تھا۔ طیب صاحب پوچھ رہے تھے ''پہنچ گئے کیا؟'' اور میں ان سے پوچھ رہا تھا ''آپ کب تک آرہے ہیں؟'' اس لمحے وہ وصی شاہ کے بیٹے کی سالگرہ میں شریک تھے۔

ایک سمارٹ سا نوجوان کھلے دروازے میں استقبال کے لیے موجود تھا۔ ''کاشف الحق'' اس نے تعارف کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے فون سننے میں لمحہ بھر کا توقف کیا۔ خوشدلی اور محبت سے بڑھا ہوا ہاتھ تھاما اور نیم گرم کمرے میں داخل ہوگیا۔ مسکراہٹوں اور بزنس کارڈز (جنھیں وزیٹنگ کارڈ کہا جاتا ہے) کا تبادلہ ہوچکا تو میں نے ٹیپ ریکارڈر آن کردیا۔ بے شک سوالات بے شمار تھے مگر ہم نے سوچا کہ انٹرویو کا دورانیہ بھی کارپوریٹ کلچر کی طرح متعین ہونا چاہیے۔

۳۹ سالہ کاشف الحق آئی۔ٹی کمپنی کاروٹ (Corvit) کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔ کاشف الحق نے یو۔ای۔ٹی لاہور سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی۔ سیمنز (Seimens) کمپنی میں ایک سال ملازمت کے بعد ۲۰۰۱ میں کم وسائل کے ساتھ کاروٹ کمپنی کی بنیاد رکھی۔

کاشف الحق نے اپنی محنت، ذہانت، پیش بینی کی صلاحیت سے کاروٹ کو آئی۔ٹی میں پاکستان کا نمایاں نام بنا دیا۔ کاروٹ اپنی نیٹ ورکنگ کی خدمات اور ٹریننگ کے حوالے سے عالمی سطح پر جانا جاتا ہے۔ کاشف الحق کا ادارہ ہزاروں لوگوں کو آئی ٹی کی ٹریننگ دے چکا ہے۔

کامیاب انٹرپرینیور، چیف ایگزیکٹو اور آئی۔ٹی انسٹرکٹر کاشف انگلش اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے اور اچھے مقرر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔

''ابتدا میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟'' جی ہاں یہی پہلا سوال تھا۔

کاشف کا جواب کافی دلچسپ تھا، بولے: جب میں ابتدا میں کسی کے پاس اپنے آئیڈیا کو لے کر جاتا تھا تو وہ لوگ کہتے تھے کہ ہمارے پاس آپ جیسے کئی نوجوان آتے ہیں جو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں کہ ہم یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے۔ مگر جب ہم ان پہ ذمے داری ڈالتے ہیں، ان کے ساتھ کام شروع کرتے ہیں تو ویزا لگوا کر باہر چلے جاتے ہیں۔ تو ہمیں نئے سرے سے پارٹنر ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آئی ٹی کے لوگوں پہ لوگوں کے متزلزل اعتبار کے باعث ایسے رویے پر میرا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم اپنی مرضی سے اس ملک میں رکے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں باہر جانا ہوتا تو بہت عرصہ پہلے جا چکے ہوتے۔ ہم یہاں کام اور نئے مواقع پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

ایک مرتبہ بہت دلچسپ صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب ایک ادارے والوں سے ابتدائی میٹنگ کے بعد میں نے ان سے کہا مجھے اپنے ڈائریکٹر سے بھی ملوا دیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے ڈائریکٹر صاحب ۳۰ سال سے کم عمر کے لوگوں سے نہیں ملتے۔ ان کے خیال میں یہ لوگ صرف باتیں اور وقت ضائع کرتے ہیں۔

کاشف کو پہلی ملازمت ہی بہت اچھی کمپنی میں ملی، سیمنز کا مارکیٹ میں بڑا نام تھا، اسی لیے پوچھا کہ کامیابی کا سفر شروع ہوا اور پھر اتنی جلدی سیمنز (Seimens) جیسی بڑی کمپنی کو کیوں چھوڑا؟

یو اِی ٹی (UET) سے الیکٹریکل انجینئرنگ کرنے کے بعد میں نے ایک مقامی کمپنی میں ملازمت کی۔ اس کے بعد سیمنز میں کام کرنے کا موقع ملا۔ کسی انجینئر کا سب سے بڑا خواب ہوتا ہے کہ اسے سیمنز جیسی بڑی کمپنی میں ملازمت مل جائے۔ یہاں میری ترقی بہت تیزی سے ہوئی۔ کچھ اتفاقات بھی ایسے ہوئے کہ مجھے جلد بڑی بڑی ذمے داریاں ملتی رہیں۔ مجھے سال کے اندر اندر مستقل کر دیا گیا حالانکہ لوگوں کو مستقل ہونے میں ۳،۴ سال لگ جاتے ہیں۔ ایک سال بعد میں نے کمپنی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ میں لمز (LUMS) یونیورسٹی میں ماسٹرز میں داخلہ لوں گا۔ اس وقت میرے پاس لمز میں تعلیم کے لیے پیسے بھی نہیں تھے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پڑھ لوں گا کچھ نہ کچھ کر لوں گا لیکن مجھے یہاں سے نکلنا ہے اور اپنے لیے نئے مواقع پیدا کرنے ہیں۔

لمز یونیورسٹی میں داخلے سے پہلے ہی میں نے کمپنی چھوڑ دی۔ اسی دوران ایک صاحب جو امریکہ سے آئے اور آئی۔ٹی میں یہاں کچھ سرمایہ کاری کرنا چاہتے تھے، ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ مل کر نیٹ ورکنگ کی ٹریننگ کا ادارہ شروع کیا۔ یہ ۱۹۹۸ء کی بات ہے۔ انھوں نے ہم سے کہا تھا کہ آپ کو ۵٪ فیصد شیئرز ملے گا جو بعد میں ۱۰٪ فیصد ہو جائے گا۔ میں نے دن رات محنت کی۔ لمز کی تعلیم کو بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ ہمیں زبردست کامیابی ملی۔ لیکن پھر ان صاحب نے اپنے وعدے کی پاسداری نہ کی اور ہمیں کہا کہ شیئرز وغیرہ بھول جاؤ، تم یہاں صرف ایک ملازم ہو۔

میں نے ان سے علیحدگی کا فیصلہ کیا اور ۲۰۰۰ء میں اپنے دوست ہارون کے ساتھ مل کر کاروٹ (Corvit) کی بنیاد رکھی۔

کیا مطلب تھا کاروٹ کا، آج یہ ایک برانڈ ہے۔ کیا باقاعدہ کچھ سوچ کر نام رکھا تھا یا جیسے ہمارے ہاں رواج ہے کہ کوئی ایسا جرمن یا سپینش لفظ رکھ لیا جائے جس کا مطلب اور تلفظ کسی کو بھی نہ آتا ہو۔

جواب بہت سیدھا تھا۔ کاروبث نام کا کوئی مطلب نہیں تھا بس ذرا منفرد نام تھا اور اتفاق سے اس میں آئی ٹی کے الفاظ بھی آ گئے تھے۔ یہاں بھی ہمیں کامیابی ملی۔ ہمارے پاس تجربہ بھی تھا اور کچھ پرانے کانٹیکٹس بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم دونوں دوستوں کا آپس میں اعتماد کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔

س: ہمارے ہاں (شراکت داری) پارٹنرشپس کیوں نہیں چلتیں اور عموماً خاندانوں میں بھی اس کا انجام برا ہوتا ہے؟

کاشف: دراصل ہم صبر سے کام نہیں لیتے۔ وقتی فائدے پر نظر رکھتے اور چاہتے ہیں جو فائدہ ملنا ہے، ابھی فوراً مل جائے۔ اگر ہم تعلق کو ایثار اور قربانی سے مضبوط کریں تو بہت سے دیرپا فائدے ہمارے حصے میں آتے ہیں۔ میں اور میرے پارٹنر ہارون ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ ہم نے اپنی ذمے داریاں بھی تقسیم کر رکھی ہیں۔ لیکن فیصلہ سازی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ضرور کرتے ہیں۔ اتنے سالوں سے ہمارا تعلق بے حد عمدہ اور مثالی رہا ہے۔

س: دوستی کا آغاز کیسے ہوا؟

کاشف: میٹرک کے بعد ہم اکٹھے ٹیوشن پڑھتے تھے۔ پھر ہم گورنمنٹ کالج لاہور میں اکٹھے

”دیانتداری، احترام اور ذمے داری ہماری کمپنی کی ۳ بنیادی اقدار ہیں“

تھے۔ ایف ایس سی میں وہاں میں ایک سال سینئر تھا اور ہارون میرے جونیئر۔ اسی طرح یو ای ٹی میں بھی ہم اکٹھے تھے۔ میں سینئر اور ہارون جونیئر۔ قدرت نے ہمیں پیشہ ورانہ زندگی میں بھی اکٹھا کر دیا۔

س: اپنی کس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں؟

کاشف: میں اپنے ادارے کے کسی فرد کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ ہر فرد کا احترام کرتا ہوں اور انھیں پیشہ ورانہ انداز میں آگے بڑھنے کے مواقع دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادارے کے ساتھ لوگوں کی وفاداری بے مثال ہے۔ لوگوں کو ہم سے زیادہ پیسوں کے مواقع بھی ملتے لیکن وہ ہمارے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو لوگ ہمیں چھوڑ کر چلے بھی جاتے ہیں اگر ان کا پچھلے سال کا بونس بن رہا ہو تو وہ ان کے گھروں میں چلا جاتا ہے۔

س: آپ میں یہ مثبت اور پختہ سوچ اور یہ اقدار کہاں سے آئی ہیں؟

کاشف: کچھ ان چیزوں میں خاندان کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ میرے والد صاحب وکالت سے منسلک تھے۔ جب میں ۱۳ سال کا تھا تو ان کا انتقال ہو گیا۔ میں زیادہ اپنے ماموں کے پاس رہا۔ وہ ریٹائرڈ جج تھے۔ ان کی زندگی سے بھی سیکھا کہ چند اصولوں کو ہمیشہ اہمیت دینی ہے۔ میرے دادا چودھری افضل حق تحریک آزادی کے سرگرم کارکن اور اردو کے نامور مصنف تھے۔ اپنی کتاب ”زندگی“ کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ وہ قانون ساز اسمبلی بھارت کے رکن بھی رہے۔ ان کی دیگر کتابیں اور تقریریں بھی زبردست تھیں۔

مجھے جب بھی طالب علموں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے میں انھیں یہی کہتا ہوں کہ عملی زندگی میں اپنے آئیڈیلز کو اتنی جلدی ختم نہ کرو۔ یہ مت سمجھو کہ عملی زندگی میں صرف بددیانتی کامیاب رہتی ہے اور ہمیں ہر کام کے لیے رشوت دینی پڑے گی بلکہ دیانت داری اور شفاف طریقے سے بھی کامیابی مل سکتی ہے۔

www.paksociety.com

ہم نے اپنے ادارے میں یہ طے کر رکھا ہے کہ کبھی رشوت نہیں دینی۔ کوئی معاہدہ حاصل کرنا ہے تو صرف شفاف طریقے سے۔ لوگ ہمیں ٹیکس سے بچنے کے راستے دکھاتے لیکن ہم ہمیشہ ایسے لوگوں کو مایوس کرتے ہیں۔

ہم نے اپنی کمپنی کے لیے جن اقدار کو اپنے مشن کا حصہ بنایا ہے وہ بھی لوگوں کی لکھی ہوئی باتوں سے نقالی نہیں بلکہ ہم نے خود دیکھا کہ ہمیں کن باتوں پر فخر ہے اور کن میں ہم خوشی محسوس کرتے ہیں۔ پھر ہم نے دیانتداری، احترام اور ذمے داری کی ۳ اقدار کو کمپنی کی مشن سٹیٹمنٹ کا حصہ بنایا۔

میں احترام کی قدر کے حوالے سے بھی بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں کسی سینئر کو حق نہیں کہ وہ اپنے ماتحت کو بے عزت کرے۔ سینئر جانتا ہے کہ ایسے کرنے پر اُسے لائن حاضر کر لیا جائے گا۔ اسی طرح خواتین یہاں احترام کے ماحول میں کام کرتی ہیں۔

س: یہاں سے ہم نے ایک اصولی بات جاننے کے لیے موضوع کو وسعت دی کہ پاکستان کے بڑے بڑے ادارے جدت اور تحقیق میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس حوالے سے کیا منصوبہ بندی کی جائے، کیا سوچا تھا؟

کاشف: اداروں میں ایسا کلچر ہونا چاہیے کہ ہر فرد کی رائے سنی اور اس کی بات کا احترام کیا جائے۔ اس سے نئے آئیڈیاز سامنے آتے ہیں۔ ہم اپنے ادارے میں کوشش کرتے ہیں کہ ہر فرد آزادی سے اپنی رائے پیش کرے اور اسے اپنے آئیڈیاز کو عملی شکل دینے کا موقع بھی دیا جائے۔

ہمارے تعلیمی ادارے بھی طالب علموں میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ طالب علم صرف گریڈز کے چکروں میں پھنسے رہتے ہیں۔ میری اپنی یونیورسٹی یو ای ٹی جہاں میں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، وہاں بھی غیر نصابی سرگرمیوں کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں نصاب کے علاوہ تعمیری سرگرمیاں بھی بہت ضروری ہیں۔ میں اپنی تعلیم کے

دوران ان سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا ہوں۔ ہماری یونیورسٹی میں ایک مرتبہ حنیف رامے صاحب آئے۔ انھوں نے ایک بات بہت زبردست کی کہ جب تک یہاں ادب و آرٹس نہیں پڑھائے جائیں گے، یہ ادارے صرف مشینیں پیدا کریں گے۔ میں نے جس قدر سرگرمیوں میں حصہ لیا، تقاریر کیں، وہ بے انتہا کام آیا۔

ہمارا اگلا سوال تھا کہ اب دنیا نوکری کے بجائے خود کا کاروبار یعنی انٹرپرینیورشپ کی تعلیم اور تلقین کے دور سے داخل ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے کیا سوچتے ہیں؟

میں انٹرپرینیورشپ کے فروغ کو ضروری سمجھتا اور طالب علموں سے کہتا ہوں کہ اپنے آئیڈیلز کو نہ چھوڑیں اور زندگی میں شارٹ کٹ تلاش نہ کریں۔ میرا پہلے دن سے یقین ہے کہ شارٹ کٹ سے چھوٹی موٹی وقتی کامیابی تو مل جاتی ہے مگر کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ زندگی میں وہ کام کریں جسے آپ پسند کرتے ہوں۔ جب آپ صبح اٹھیں تو کام پر جانے کو دل چاہے، یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں شخصیت کی نشوونما پر بہت کم توجہ اور رٹا لگانے میں مہارت پیدا کی

جاتی ہے۔ ہمارے طالب علموں کا علم بھی اخبار کی چند سرخیوں اور ٹاک شوز کے چند جملوں تک محدود رہتا ہے۔ وہ اپنی رائے خود قائم کرنے کے لیے کوشش نہیں کرتے۔

س: اپنی سوچ کی وسعت اور ذہنی بالیدگی کے لیے کیا پڑھنا پسند کرتے ہیں؟

کاشف: میں نے ابتدائی دنوں میں طنز و مزاح میں کرنل محمد خان اور شفیق الرحمن کی کتابیں پڑھیں ہیں۔ افسانوں میں منٹو کی کتابیں پڑھی ہیں۔ اب زیادہ تر مینجمنٹ کے موضوع پر مختلف چیزیں پڑھتا ہوں۔ روحانیت میں بھی دلچسپی ہے۔ Power of Now اور New Earth جیسی مقبول کتابوں کے مصنف ایکہارٹ ٹولے Eckhart Tolle کو پڑھا ہے۔ اس کے علاوہ دیپک چوپڑا کی چیزیں بھی نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔

اردو ڈائجسٹ بہت باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا۔ ماضی میں اردو ڈائجسٹ کی خدمات قابل تعریف رہی ہیں۔ درمیان میں رابطہ ٹوٹ گیا، اب کچھ عرصے سے دوبارہ پڑھنے اور دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کی جدید تقاضوں کے مطابق چلنے کی نئی کوشش بہت کامیاب رہے گی۔ ان تبدیلیوں سے پڑھنے والوں کو فائدہ ملے گا۔

س: آنے والے دنوں میں خود کو کہاں دیکھتے ہیں؟

کاشف: کوشش ہے کہ میری کمپنی کاروٹ آنے والے دنوں میں ریجنل سطح پر سامنے آئے۔ ہمارے پاکستان میں دو آفس ہیں۔ اسی سال ہم دبئی میں اپنا آفس کھول لیں گے۔ ذاتی حوالے سے میری خواہش ہے کہ زندگی میں کسی وقت ماسلو کی تھیوری کے مطابق (Self Actualization) کی سٹیج آئے اور میں سماجی حوالے سے بھی اپنے لوگوں کے لیے کچھ کر سکوں۔ بل گیٹس کی مائیکروسافٹ (Microsoft) کے بعد بل اور میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن کے پلیٹ فارم سے سماجی خدمت بہت قابل قدر ہے اور قابل تقلید بھی۔

ہم سماجی خدمت کے حوالے سے ابھی بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ خودنمائی سے بچتے رہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے مقبرۂ جہانگیر کی صفائی کی۔ مقصد یہ تھا کہ لوگوں تک یہ پیغام جائے کہ عوامی جگہوں کو صاف رکھا جائے۔ مائیکروفنانس کے حوالے سے بھی کچھ چیزیں سوچ رہا ہوں کہ لوگوں کو بغیر سود کے قرضے دیے جائیں تاکہ وہ اپنا کوئی کام شروع کر سکیں۔ اس حوالے سے اخوت تنظیم بہت قابل قدر کام کر رہی ہے۔

س: اپنی فیملی کو کتنا وقت دیتے ہیں؟ دیگر معمولات کیا ہیں؟

کاشف: شادی ۲۰۰۳ء میں ہوئی اور فیملی لائف بہت زبردست ہے۔ میرے ۲ بچے ہیں۔ بڑا بیٹا ۶ سال کا ہے۔ کام کی مصروفیت کے باعث بعض مرتبہ ان کو وقت دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ صبح ۹ سے شام ۶، ۷ بجے تک آفس میں وقت گزرتا ہے۔ شام میں کچھ وقت ورزش کے لیے نکال لیتا اور جم باقاعدگی سے جاتا ہوں۔

س: کاروبار میں سب سے یادگار لمحہ کب آیا؟

کاشف: ہر روز کسی نئے چیلنج کے لیے خود کو تیار کرتا ہوں، یہی زندگی ہے۔ اگر کوئی کامیابی مل جائے تو اللہ کا شکر کرتا اور خوشی کو اعتدال میں رکھتا ہوں۔ اگر کوئی نقصان ہو تو خود کو مایوسی سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرے قریبی لوگوں میں کوئی مایوس ہو تو اس سے ضرور یہ بات کہتا ہوں کہ بعض اوقات انسان وقتی نقصان یا ناکامی سے بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ زندگی جب آگے بڑھتی ہے تو وہ چیز جس نے ماضی میں ہمارے دن رات کا چین چھین لیا تھا، بہت معمولی دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے ایک مقولہ بڑا خوب ہے۔

''میں نے جو کچھ زندگی سے سیکھا ہے، وہ چند لفظوں میں بیان ہو سکتا ہے۔ ''زندگی آگے بڑھ جاتی ہے۔''

س: گلوبل چینجرز فیڈریشن کی مصروفیت کے بارے میں بتائیے۔

کاشف: پبلک سپیکنگ میں شروع سے میری دلچسپی

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ہے۔ گلوبل سپیکرز فیڈریشن (GSF) کا رکن بھی ہوں۔ اس فورم پر پروفیشنل سپیکرز کو ملنے کے کئی مواقع ملتے ہیں۔ لاہور میں ایسے ہی ایک اور فورم کی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لیتا رہتا ہوں۔

س: سیاست میں کتنی دلچسپی ہے؟

کاشف: میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں وقت پر الیکشن ہوتے رہیں تو ہمارا سسٹم بہت مضبوط ہو جائے گا۔ جب روایات مضبوط ہوں گی تو کم قابلیت کے لوگ آنے سے بھی سسٹم کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔

س: آپ کے ادارے کی ٹریننگ کی افادیت کیا ہے؟

کاشف: ہم اپنے انسٹرکٹرز پر بہت محنت کرتے اور ان کو اپنی صلاحیتوں کے نکھارنے کا بھرپور موقع دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کم قیمت میں اعلیٰ معیار کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ہمارے پاس مشرق وسطیٰ، انگلینڈ، امریکا سے بھی لوگ پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔

س: سسکو (Cisco) اور مائیکروسافٹ کی طرف سے گولڈ سٹیٹس کیسے ملا؟

کاشف: سسکو نیٹ ورکنگ میں عالمی لیڈر ہے۔ Cisco کا گولڈ پارٹنر بننا ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔ اس سٹیٹس کے لیے ہم نے اچھی ٹیم تیار کی۔ ان میں مہارت پیدا کی۔ ٹیکنالوجی اور اپنی خدمات کا معیار بہتر بنایا۔ اس لیے سسکو نے ہمیں یہ اعزاز دیا۔ مائیکروسافٹ کی طرف سے گولڈ سٹیٹس ملنے کے لیے بھی ہمیں انہی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔

س: پاکستان اور بھارت کے آئی ٹی میدان میں کیا فرق ہے؟

کاشف: ہمارے ہاں سرمایہ کاری کے سازگار مواقع موجود ہیں۔ بیرونی سرمایہ کار بھی اس ملک پر توجہ دے رہے ہیں۔ ہماری کنٹری برانڈنگ بھارت کے مقابلے میں کمزور ہے۔ ہمیں اپنے ملک کا کردار بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ہمارے جو پاکستانی باہر بیٹھے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، ہمیں انھیں قائل کرنا ہے

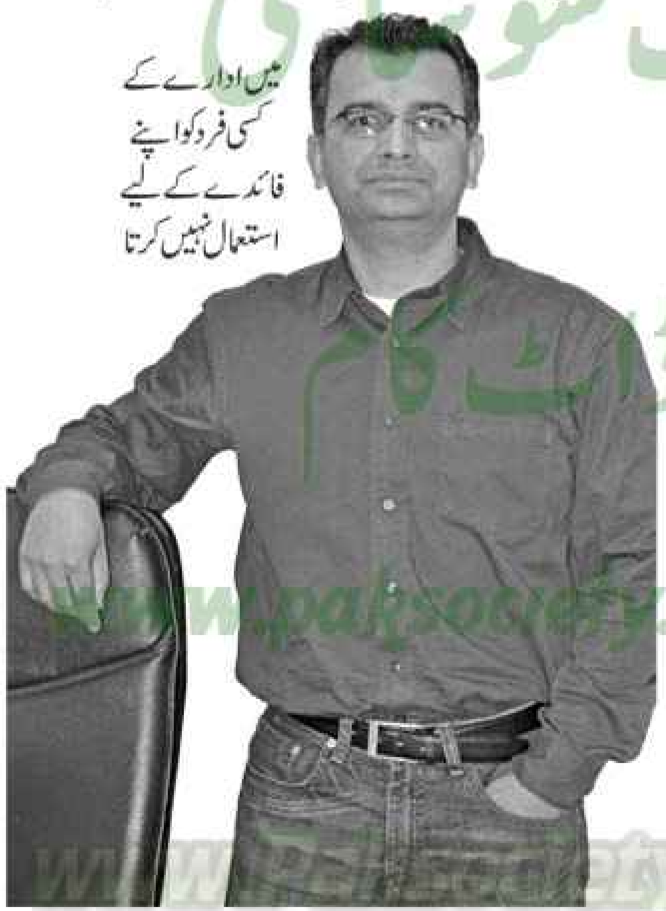

میں ادارے کے کسی فرد کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کرتا

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

بعض اتفاقات اتنے دلچسپ اور حیران کن ہوتے ہیں کہ ایک مستقل یاد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک اتفاق اس مرتبہ جوہر قابل کے سلسلے سے جڑا ہوا ہے۔ جوہر قابل میں اُردو ڈائجسٹ اپنے قارئین کا تعارف ایسے کامیاب لوگوں سے کرواتا ہے جو ہمارے قارئین کے لیے اُمید کا پیغام بنتے ہیں۔ خصوصاً اس سے ہمارے نوجوانوں کے سامنے نئے رول ماڈل آتے اور وہ اپنی زندگیوں کو بامقصد اور بھرپور بنانے کے لیے اپنے اندر نیا عزم اور حوصلہ ڈھونڈنا شروع کرتے ہیں۔

کچھ دنوں سے میرے ذہن میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اردو کے نامور مصنف چوہدری افضل حق کی تحریروں میں سے کوئی چیز منتخب کی جائے اور اسے ڈائجسٹ کی زینت بنایا جائے۔ انٹرویو کے لیے آفس سے نکلتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا۔ میں نے اسی وقت بغیر تمہید کے اپنے مدیر صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ اختر عباس صاحب نے اثبات میں جواب دیا کہ ہاں ضرور ان کی تحریروں میں سے کچھ نکالا جائے اور ساتھ ہی کہا کہ آپ کتاب سے کچھ منتخب کر لائیے۔

پھر بتانے لگے کہ ہم اپنے مشاہیر کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ مغرب والوں نے شیکسپیئر کی زبان کو آج کے زمانے اور ڈکشن کے لحاظ سے نئے سرے سے اختیار کیا اور روز لندن میں تھیٹر کر کے اسے زندہ کیا تاکہ لوگ اس کے کام سے بھرپور مزہ اٹھائیں۔

پھر باتوں باتوں میں ایڈیٹر صاحب سے نفسیات پر بات چل نکلی کہ آنے والے شمارے میں مثبت نفسیات کے ایک بڑے نام ابراہیم ماسلو کے نظریے (Self actualization) کی خوبصورت باتوں کو جگہ دی جائے۔ اسی روز شام کو ہماری ملاقات کاشف الحق سے ہوئی۔ ملاقات کے ابتدائی لمحوں میں ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارا انتخاب اچھا تھا اور اس ملاقات سے ہمیں کام کی چیزیں ملنے والی ہیں۔

کاشف الحق اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔ اختر عباس صاحب نے ان سے والدین اور خاندان کے حوالے سے سوال پوچھا۔ کاشف الحق نے اپنے والد کے بارے میں بتایا کہ وہ وکیل تھے۔ پھر انھوں نے اپنے دادا کا ذکر کیا کہ تحریک آزادی کے سپاہی اور اردو کے نامور مصنف تھے اور ان کا نام تھا "چوہدری افضل حق"۔

اس اتفاق پر بہت خوشی ہوئی۔ کاشف الحق سے گفتگو جاری رہی۔ وہ کارپوریٹ دنیا میں اپنی کامیابیوں اور اپنی اقدار کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ میرا ذہن گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ ان اقدار کا سلسلہ چوہدری افضل حق کی "زندگی" جیسی خوبصورت تحریروں سے جوڑنے میں بھی مصروف رہا۔ اس وقت مزید حیرانی ہوئی جب کاشف الحق نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ کسی وقت ابراہیم ماسلو کے نظریے کے مطابق ان کی زندگی میں (Self Actualization) کی سٹیج آئے اور وہ روپے پیسے کے چکر سے آگے نکلتے ہوئے سماجی خدمت کے حوالے سے کوئی کام کر سکیں۔

(عاطف مرزا)

کہ وہ پاکستان میں دلچسپی لیں۔ یہاں سرمایہ کاری کریں اور نئے مواقع پیدا کرنے کے لیے تعاون کریں۔ دوسرے لوگوں سے تعاون کی درخواست سے پہلے بیرون ملک پاکستانیوں کا اعتماد حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

شام ڈھل چکی تھی جب ہماری گفتگو اختتام کو پہنچی۔ رخصت ہوئے تو دل اس بات سے سرشار تھا کہ وطن عزیز کے نئے بزنس لیڈرز میں سے ایک رول ماڈل سے مل کر آئے ہیں جو کتنے ہی نئے بزنس لیڈرز کا آئیڈیل بھی بن سکتا اور انھیں اچھی اقدار کے ساتھ کامیاب ہونے کا یقین بھی دلا سکتا ہے۔

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

کھیلوں کی دُنیا

مبارک ہو خوشی کا یہ سماں
ایک روزہ کرکٹ کی ۴۰ ویں سالگرہ
دنیائے کھیل سے دلچسپ معلومات اور تازہ خبروں کا دل لبھانے والا نیا کالم

رانا محمد شاہد

کرکٹ

ایک روزہ کرکٹ کے آغاز کو ۴۰ برس مکمل ہو گئے۔ ایک روزہ کرکٹ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو آسٹریلوی ٹیم سب سے بہتر نظر آتی ہے۔ فتوحات کے حساب سے جنوبی افریقہ دوسرے اور پاکستانی ٹیم تیسرے نمبر ہے۔ موجودہ عالمی چیمپئن بھارت کا نمبر پانچواں ہے۔ ایک روزہ کرکٹ کا سب سے پہلا عالمی کپ ویسٹ انڈیز کے نام رہا۔ سب سے زیادہ مرتبہ آسٹریلوی ٹیم ٹائٹل جیتنے میں کامیاب ہوئی۔ اب تک ۳۳ ٹیمیں یہ اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔ ایک روزہ کرکٹ میں کھلاڑیوں کی انفرادی کارکردگی پر بات کی جائے تو بھارتی بیٹسمین ٹنڈولکر پہلے نمبر پر ہیں۔ رنز کے لحاظ سے ابتدائی دس بیٹسمینوں میں پاکستان کے سابق کپتان انضمام الحق بھی شامل ہیں۔ جبکہ گیند بازوں میں سری لنکا کے مرلی دھرن پہلے نمبر پر ہیں۔ اگلی دو پوزیشنوں پر "دو ڈبلیوز" وسیم اکرم اور وقار یونس کی جوڑی قابض ہے۔ قوانین اور روایات میں تبدیلیوں کے باوجود ایک روزہ کرکٹ کی اہمیت آج بھی موجود ہے۔ اس کی بنیادی وجہ کھلاڑیوں کی تاریخ ساز کارکردگی اور شائقین کی گہری دلچسپی ہے۔

پاکستان ہاکی کی کارکردگی

۲۰۱۱ میں پاکستان ہاکی ٹیم صرف ایک بڑا ٹائٹل جیتنے میں کامیاب رہی۔ گرین شرٹس نے آسٹریلیا میں

ہونے والے چار ملکی ہاکی ٹورنامنٹ کے فائنل میں آسٹریلوی ٹیم کو شکست دے کر ٹائٹل اپنے نام کیا۔ پاکستانی ہاکی ٹیم نے اولمپکس کی تیاریوں کے پیش نظر کئی بیرون ملک دورے بھی کیے۔ بین الاقوامی ہاکی میں مجموعی طور پر آسٹریلیا کا پلہ بھاری رہا۔ عالمی درجہ بندی میں وہ بدستور پہلے نمبر پر ہے۔ چیمپئنز ٹرافی میں ساتویں پوزیشن حاصل کرنے کے باوجود پاکستان کی درجہ بندی ایک درجہ بہتر اور اب پاکستان نویں سے آٹھویں پوزیشن پر آگیا ہے۔

کم سن بھارتی کھلاڑی

بھارت سے تعلق رکھنے والے ۶ سال ۱۰ ماہ کے کمسن کرکٹر مشیر خان نے اس وقت ایک نئی تاریخ رقم کر دی جب اپنے پہلے ہی میچ میں ۷ وکٹیں حاصل کرکے شائقین اور ماہرین کو دم بخود کر دیا۔ مشیر خان

www.Paksociety.com

بھارتی کرکٹ بورڈ کے زیر اہتمام ہونے والی جائلز شیلڈ کرکٹ چیمپئن شپ میں نمائندگی کرنے والے کم عمر ترین کھلاڑی بنے تھے۔ واضح رہے کہ ۲۷ فروری ۲۰۰۵ء کو پیدا ہونے والے مشیر خان کی چشم کشا کارکردگی نے ان کی ٹیم انجمن الاسلام الدتہ انگلش میڈیم سکول کو شیلین ورا ایجوکیشن سوسائٹی کے خلاف اننگز اور ۲۰ رنز سے کامیابی دلوائی۔ لیفٹ آرم اسپنر مشیر خان نے دوسری اننگ میں ۸ اوورز میں صرف ۱۱ رنز دے کر ۶ وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔

دنیائے کرکٹ سے جانے والے کھلاڑی

پاکستانی کرکٹ ٹیم میں "رن مشین" کے نام سے مشہور محمد یوسف کا بین الاقوامی کیریئر بھی ختم ہوگیا۔ وہ جاوید میانداد اور انضمام الحق کے بعد ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ رن بنانے والے پاکستانی کرکٹر ہیں۔ انھوں نے ۹۰ ٹیسٹ میچوں میں ۷۵۳۰ رنز بنائے، جن میں ۲۴ سنچریاں اور ۳۳ نصف سنچریاں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ طویل عرصے تک دنیا بھر کے بلے بازوں کو اپنی انگلیوں پر نچانے والے جادوگر گیند باز مرلی دھرن کرکٹ سے ریٹائر ہوگئے۔ انھیں ٹیسٹ اور ایک روزہ کرکٹ میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ٹیسٹ میں ان کے وکٹوں کی تعداد ۸۰۰ رہی جبکہ ایک روزہ میں ۵۳۴ رہے۔

اسی طرح دنیا کے بڑے بلے بازوں کو اپنی تیز رفتار گیند بازی سے ہلا دینے والے تیز رفتار گیند باز، راولپنڈی

مائیکل کلارک کا اعزاز

آسٹریلوی کپتان مائیکل کلارک نے جنوری کے پہلے ہفتے اپنے ہی ملک میں بطور کپتان پہلی ٹرپل سنچری بنائی۔ انھوں نے آسٹریلیا کی سرزمین پر بطور کپتان سب سے زیادہ ۳۲۹ رنز بھی بنائے۔ ان سے پہلے یہ ریکارڈ لیجنڈری کرکٹر سر ڈان بریڈمین کے پاس تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں انگلینڈ کے خلاف ۲۷۰ رنز اسکور کیے تھے۔ مائیکل کلارک بطور کپتان صرف ۵ رنز کی کمی سے مارک ٹیلر کا ریکارڈ نہ توڑ سکے۔ مارک ٹیلر نے ۱۹۹۸ء میں پاکستان کے خلاف بطور کپتان ۳۳۴ رنز بنائے تھے۔

مائیکل کلارک نے بھارت کے خلاف دوسرے ٹیسٹ میچ میں ۳۲۹ رنز کی اننگ کھیلی۔ انھوں نے ۶۱۷ منٹ تک وکٹ پر قیام کیا اور ۴۶۸ گیندوں کا سامنا کیا۔ ان کی اننگ میں ۳۹ چوکے اور ایک چھکا شامل تھا۔ وہ ۳۲۹ رنز بنا کر آسٹریلوی سرزمین پر دوسرے اور مجموعی طور پر آسٹریلوی ٹاپ سکورر میں تیسرے نمبر آ گئے۔ میتھیو ہیڈن ۳۸۰ رنز بنا کر پہلے اور مارک ٹیلر و ڈان بریڈمین ۳۳۴ رنز بنا کر دوسرے نمبر پر ہیں۔

www.paksociety.com

ایکسپریس شعیب اختر نے بھی اپنے کیریئر کو بریک لگا دی۔ کیریئر کے دوران زخموں اور مختلف تنازعات کا شکار رہنے والے دنیا کے تیز رفتار گیند باز شعیب اختر نے ۲۰۱۱ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف آخری میچ کھیلا اور اس دوران ہی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔

عالمی کپ میں شکست کے بعد آسٹریلوی کپتان رکی پونٹنگ کا شاندار کیریئر بھی طوفانی لہروں کی زد میں آ گیا کیونکہ پورے ۱۰ سال بعد انھیں آسٹریلوی ٹیم کی قیادت سے محروم ہونا پڑا۔

ایک روزہ کرکٹ کا سب سے بڑا اسکور

۲۰۱۱ء کے آخر میں ہی ایک روزہ کرکٹ کی تاریخ کا سب سے بڑا اسکور بنا۔ ناتواں ویسٹ انڈیز کے کمزور بولنگ حملے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تجربے کار بھارتی بلے باز وریندر سہواگ نے ایک روزہ کرکٹ کی دوسری اور اپنے کیریئر کی پہلی ڈبل سنچری داغ دی۔ یوں ایک روزہ کرکٹ کی ایک اننگ میں سب سے زیادہ انفرادی سکور کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ سہواگ نے ۲۱۹ رنز کی دھواں دھار اننگ کھیل کر سچن ٹنڈولکر کا ریکارڈ توڑا۔ سچن ٹنڈولکر نے بھی گزشتہ برس جنوبی افریقہ کے خلاف گوالیار میں ۲۰۰ رنز ناٹ آؤٹ رن بنائے تھے۔

اسی طرح ۱۱ اپریل ۲۰۱۱ء کا دن بنگلہ دیشی گیند باز شاید کبھی نہ بھلا سکیں۔ اس روز بنگال ٹائیگرز آسٹریلیا کے مدمقابل تھے۔ مسلسل تین عالمی کپ جیتنے والی آسٹریلوی ٹیم عالمی کپ ۲۰۱۱ء میں شکست کے بعد غصے سے آگ بگولا تھی۔ جارح مزاج اوپنر اور دنیا کے نمبر ون آل راؤنڈر شین واٹسن نے اپنا سارا غصہ بنگلہ دیشی گیند بازوں پر اتار دیا۔ بنگلہ دیش نے آسٹریلیا کو ۲۳۰ رنز کا ہدف دیا۔ واٹسن نے ۱۵ فلک شگاف چھکوں اور ۱۵ دلکش چوکوں کی مدد سے صرف ۹۶ گیندوں پر ۱۸۵ رنز بنائے۔

یوں آسٹریلیا صرف ۲۶/۱ اوور میں ایک وکٹ کے نقصان پر میچ جیت گیا۔ اندازہ لگایئے کہ اگر شین واٹسن کو بقیہ ۲۴/۱ اوور بھی کھیلنے کو مل جاتے تو وہ کیا قہر برپا کرتے۔ اس میچ میں واٹسن نے صرف چوکوں اور چھکوں کی مدد سے ۱۵۰ رنز بنائے، جو ایک روزہ کرکٹ میں ریکارڈ ہے۔ واٹسن نے ایک اننگ میں سب سے زیادہ چھکے لگانے کا ریکارڈ بھی اپنے نام کیا۔

سر پر انڈے

ہاکی کے کھلاڑی محمد سرور اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گھر والوں نے انھیں بازار سے انڈے لانے بھیجا۔ وہ انڈے خرید کر واپس لوٹ رہے تھے کہ گلی میں کھیلتے دوستوں نے روک لیا۔ محمد سرور نے انھیں دھمکی دی کہ اگر مجھے نہ جانے دیا تو سارے انڈے تمھارے سر پر مار کر توڑ دوں گا۔ ایک لڑکا فوراً بولا: ''ہمت ہے تو مار دو۔''

محمد سرور نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک ایک کر کے سارے انڈے لڑکے کے سر پر مار دیے۔ انڈے ٹوٹ

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

میانداد کی چھلانگیں

بھارت کے خلاف عالمی کپ کے ایک میچ میں جاوید میانداد بلے بازی کرنے گئے۔ اس دن جاوید میانداد مکمل فٹ نہیں تھے۔ بھارت کا وکٹ کیپر کرمانی مخصوص انداز میں اچھل اچھل کر اپیل کیا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ وکٹوں کے پیچھے خوب بول رہا تھا۔ جاوید میانداد نے اسے کہا بھی کہ وہ اس وقت بولا کرے جب گیند باز گیند پھینکنے کی تیاری کر رہا ہو یا گیند پھینک چکا ہو لیکن کرمانی پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ مسلسل جاوید میانداد کو تنگ کرتا رہا۔

آخر تنگ آ کر جاوید میانداد نے اپنی خراب حالت کے باوجود ۳ مرتبہ اچھل اچھل کر اس کے اپیل کرنے کے انداز کی نقل کی تو پورا اسٹیڈیم قہقہوں سے گونج اٹھا۔ کرمانی یہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسے دوبارہ جاوید میانداد کو تنگ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اپنی خراب حالت کی وجہ سے جاوید میانداد کو اچھلنے سے تکلیف تو ہوئی لیکن انھوں نے کرمانی کو سبق سکھا دیا، وہ یوں کہ پورا اسٹیڈیم اس پر ہنسنے لگا۔

چکے تو وہ لڑکا ہنستا ہوا اٹھا اور بولا "واہ بھئی آج تو سر پر خوب شیمپو لگا ہے، نہانے میں بہت مزا آئے گا اور بال بھی روشن و چمک دار ہو جائیں گے۔" یہ سن کر محمد مراد کو احساس ہوا کہ وہ اپنا ہی نقصان کر بیٹھے ہیں۔

بیڈمنٹن کا جنم

برطانیہ میں بیڈمنٹن (Bad Minton) کے نام سے ایک علاقہ واقع ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے ۱۸۷۳ء کے لگ بھگ ایک نئے کھیل کا دلچسپ آغاز ہوا۔ ایک رات اس علاقے میں تقریب جاری تھی۔ اختتام پر بارش شروع ہوگئی۔ لوگ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگے۔ اچانک کسی زندہ دل کو ایک خیال سوجھا۔

اس نے رسی کا ایک سرا ستون کے ساتھ اور دوسرا دوسرے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ بوتل کے ڈھکن نما کارک میں چند تنکے گاڑ کر ایک شٹل سی بنائی اور پلیٹ کے نیچے رکھنے والے میٹ کو ریکٹ کے طور پر استعمال کیا۔

نوجوان پھر میٹوں کی مدد سے کارک (شٹل) کو رسی پر سے ایک طرف سے دوسری طرف پھینکنے لگے۔ یوں ان کے درمیان مقابلہ شروع ہوگیا۔ اس طرح بیڈمنٹن کھیل وجود

میں آیا۔ برصغیر میں یہ کھیل برطانیہ سے پہنچا۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان بیڈمنٹن فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔

یہی ہے قصہ کوئز

دلچسپ معلومات
اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اس
کوئز کا اصل مقصد

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے منتخب قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں [illegible] اور زندگی کا مقصد جاننے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپ معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کی بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو غور سے پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے سوالات کے اپنی جوابات کو لکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے [illegible] قرعہ اندازی [illegible] خوش نصیبوں [illegible] "الف" کے [illegible] شادی کی شاعری [illegible] تبدیل کی جا سکتی ہے۔

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III جوہر ٹاؤن لاہور

گزشتہ ماہ قصہ کوئز ۳ کے درست جوابات دینے والوں کے نام:

اقبال احمد خان (کراچی)، محمد عرفان (لاہور)، محمد حمزہ شہزاد (قصور)، عبداللطیف ولد عبدالعزیز (خان پور)، محمد فہد (قصور)، راؤ محمد شاہد اقبال (نواب شاہ)، مریم ضیا بنت محمد ضیاء اللہ (لاہور)، محمد فاضل قریشی (راولپنڈی)، محمد حمزہ قادری (حیدر آباد)، ڈاکٹر منعم احمد جنجوعہ (لاہور)، انجینئر ظہور الاسلام (مظفر آباد)، محمد جہانگیر چودھری (آزاد کشمیر)، زرنگار (نامعلوم)، محمد فرقان احمد ولد تقی رشید اعوان (گوجرانوالہ)، زاہد اقبال (آزاد کشمیر)، لائبہ رحمان ولد منیر رحمان (پشاور)، نشرین مبشر زوجہ کرنل مبشر احمد (چکوال)، ابوعلی عبدالوکیل (بہاولنگر)، پروفیسر محمد طاہر (سرگودھا)، راشد عالم (کراچی)، رابعہ شہزاد (کوٹ رادھا کشن)، محمد خلیل چودھری (دینہ)، شبانہ ظفر (اوکاڑہ)، فائزہ عمار (کوٹ رادھا کشن)، سعیدہ ادریس (کراچی)، ڈاکٹر محمود احمد عابر (لاہور)، محمد ثاقب (لاہور)، رابعہ شہزاد (قصور)، فائزہ عمار (قصور)، صوبیدار (ر) شہزاد محمد (قصور)

قرعہ اندازی کے ذریعے جنوری ۲۰۱۲ء قصہ کوئز میں انعام پانے والے خوش نصیبوں کے نام

محمد [illegible] (L-107 [illegible] E-4 [illegible] کراچی)

آپ دونوں کو انعام مبارک ہو

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

قصہ کوئز ۱

یہ خطیب کون ہے جس نے ہزاروں کے مجمع پر جادو سا کردیا؟ ان گنت انسانوں کا سمندر یوں خاموش ہے جیسے ان کے منہ میں زبان یا ان کے جسموں میں جان نہ ہو۔ وہ بولے جارہا ہے اور سننے والوں کی پلک تک نہیں جھپکتی۔ وہ الفاظ کو جس طرح چاہے، استعمال کرتا ہے۔ جو کیفیت اور جو تاثر وہ پیدا کرنا چاہے کرلیتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے ”میں نے ۴۰ برس تک لوگوں کو خدا کا کلام سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہیں تھا کہ وہ ریزہ ریزہ ہوجاتے، غاروں سے ہم کلام ہوتا، نجوم اٹھتی، چٹانوں کو جھنجوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لیے طوفان بند ہوجاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے، کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں، صرصر سے گویا ہوتا تو صبا ہوجاتی، دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں شگاف پڑ جاتے، جنگل لہرانے لگتے، صحرا سرسبز ہوجاتے۔ میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا جن کی زمینیں بنجر ہوچکی تھیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے، جن کے ضمیر عاجز آچکے ہیں، جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں، جن کی پیشانیاں انتہائی خطرناک ہیں، جن کا شعبدہ المناک اور جن کا گزر جانا کربناک ہے، جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔“

(الف) تاریخ برصغیر کے معتبر نام، آسمان خطابت کے درخشاں ستارے۔ انگریزوں کے دشمن اول اور عشق رسولؐ سے سرشار اس شخصیت کا نام کیا ہے؟

(ب) یہ شخصیت کہاں دفن ہے؟

☆☆

www.paksociety.com

قصہ کوئز ۲

یہ بچہ نیو ٹمپل روڈ کے گھر کی بالائی منزل پر واقع دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں ۱۴ دیگر افراد کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ رات کو جب سب سو جاتے تو یہ اکیلا دیر تک جاگتا اور لیمپ کی روشنی میں پڑھتا رہتا۔ ایک رات گھر کی ایک خاتون کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ نصف سے زیادہ رات گزر چکی مگر بچہ ابھی تک پڑھ رہا ہے۔ بزرگ خاتون بچے کے پاس گئیں اور کہا ”بچے اتنا نہ پڑھا کر، بیمار ہوجائے گا۔“

بچے نے کہا ”اگر میں اس وقت اتنی محنت نہیں کروں گا تو زندگی میں کبھی کوئی بڑا کام نہ کرسکوں گا۔“ یہ بچہ آگے چل کر بہت بڑا آدمی بنا۔

(الف) یہ کس بچے کا ذکر ہے؟ نام بتائیے۔

(ب) اس بچے نے کون سا کارنامہ انجام دیا؟

☆☆

قصہ کوئز ۳

تحقیق کے دوران اس سائنس دان کے ذہن میں عجیب وغریب خیال آیا۔ اس کے خیال میں وہ تمام لوگ جو گائے پالتے یا گائے کا دودھ دوہتے ہیں، وہ چیچک سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس نے اسی مفروضے پر اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا۔ اسے معلوم ہوا کہ خود گائے کو بھی چیچک سے کم تر ایک بیماری ہوجاتی ہے جسے ”کاؤپاکس“ کہتے ہیں لہٰذا اس نے کاؤپاکس کے جراثیم سے ایک دوا (ویکسین) تیار کرلی، مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اس ویکسین کا تجربہ کس انسان پر کیا جائے؟ اس مقصد کے لیے کوئی شخص رضاکار بننے پر آمادہ نہیں تھا۔ آخرکار ایک باہمت خاتون اپنے بیٹے جیمز فلپس کو رضاکار بنانے پر آمادہ ہوگئی۔ چیچک کے خلاف پہلی ویکسین جیمز فلپس کو دی گئی اور وہ ہمیشہ کے لیے چیچک جیسے مہلک مرض سے محفوظ ہوگیا۔

(الف) سائنسی تاریخ کا یہ اہم واقعہ کس ملک میں پیش آیا؟

(ب) چیچک کی ویکسین تیار کرنے والے سائنس دان کا نام کیا تھا؟

☆☆

قصہ کوئز ۴

جنگل سے گزرتے ہوئے اس نے ہرن کا ایک

خوبصورت بچہ پکڑا۔ اسے اپنے ساتھ گھوڑے پر رکھا اور چل دیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ کیا دیکھتا ہے کہ ہرن بچے کی ماں بھی پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔ وہ رک گیا، ہرنی بھی رک گئی۔ ہرنی اسے درخواست گزار نظروں سے دیکھ رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو، خدارا میرا بچہ مجھے واپس کر دو۔ آخرکار اس نے بچے کو رہا کر دیا۔ بچہ چوکڑیاں بھرتا ماں کے پاس چلا گیا۔ ہرن کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

نوجوان مطمئن اور مسرور واپس آ گیا۔ اللہ کی مخلوق پر رحم کرنے والا، بے زبان ماں اور بچے کا دل رکھنے والا یہ نوجوان بے خبر تھا کہ اللہ نے اس پر کامیابی کے در کھول دیے ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہی نوجوان افغانستان کی ایک ریاست کا حکمران بنا۔ اس کا بیٹا آگے چل کر نامور فاتح اور اسلامی تاریخ کا درخشاں ستارہ بن گیا۔

(الف) بتائیے یہ قصہ کس شخصیت کا ہے؟

(ب) یہ شخصیت کس ریاست کی حکمران بنی؟

☆☆

قصہ کوئز/۵

فرانس خانہ جنگی کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ پھر انگریز سپاہی بھی فرانسیسی سپاہیوں پر حملے کرتے ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے۔ یہ لڑکی پر عزم تھی کہ وہ کچھ کرے مگر کس طرح؟ آخر اس نے کہنا شروع کر دیا "مجھے غیب سے اشارہ ملا ہے کہ میں فرانسیسی سپاہیوں کی مدد کروں۔" اس مقصد کے لیے لڑکی نے بادشاہ سے ملنا چاہا مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ لوگ بھی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ ایک ان پڑھ دیہاتی اور نو عمر لڑکی کی اس بات پر یقین بھی کس طرح کیا جاتا کہ اسے غیب سے کوئی اشارہ ملا ہے؟

لوگ اسے دیوانی، جادوگرنی، دھوکے باز اور نہ جانے کیا کچھ کہنے لگے۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور آخرکار بادشاہ کے بڑے بیٹے سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ شہزادہ اس کے جوش و جذبے اور عزم سے بے حد متاثر ہوا۔ آخرکار فوج کی کمان اسے دے دی گئی۔ اپریل ۱۴۲۸ء میں اس نے مردانہ وردی پہنی، ایک ہاتھ میں سفید جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لی اور ۱۰ ہزار کے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے اورلینز کے محصور شہر میں جا گھسی۔ اس نے شجاعت کے ایسے کارنامے انجام دیے کہ رہتی دنیا تک اس کا نام زندۂ جاوید ہو گیا۔

شاعروں اور ادیبوں نے اسے اپنی تحریروں کا محور بنایا۔ لیکن ۳۰ مئی ۱۴۳۱ء کو اسے انگریزوں نے ایک مقدمے میں کارروائی کے بعد جادوگرنی قرار دے دیا۔ پھر اس کی موت کا فیصلہ بھی ہو گیا۔ موت کے بعد اس کے مقدمے پر نظرِ ثانی کی گئی اور اسے بے گناہ بھی قرار دیا گیا مگر اس وقت تک وہ امر ہو چکی تھی۔

(الف) ہم کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہیں۔ نام بتائیے؟

(ب) اس لڑکی کی موت کیسے واقع ہوئی؟

ماہِ جنوری کے درست جوابات

کوئز/۱ (ا) جنگِ تبوک (ب) حضرت ابوبکر صدیقؓ

کوئز/۲ (ا) ہٹلر (ب) جرمنی

کوئز/۳ (ا) لیاقت علی خان (راولپنڈی) (ب) سید اکبر

کوئز/۴ (ا) فلورنس نائٹ اینگل (ب) انگلستان

(چونکہ اس کی جائے پیدائش اٹلی ہے، اس لیے اٹلی بھی درست ہے)

ماہ دسمبر کے درست جوابات

کوئز/۱ (ا) الیگزینڈر فلیمنگ (ب) پینسلین

کوئز/۲ (ا) نبی اکرم ﷺ (ب) یہ خطاب حج کے موقع پر میدان عرفات میں کیا گیا

کوئز/۳ (ا) ابراہم لنکن (ب) سولہواں صدر

کوئز/۴ (ا) ایڈیسن (ب) ایڈیسن نے بجلی کا بلب گیلوانسکوپ، بیٹری، مصنوعی ربڑ اور چھوٹی بڑی ایجادات ملا کر ایک ہزار سے زائد ایجادات کیں

www.paksociety.com

قارئین کے مطالعے اور راہنمائی کے لیے خصوصی تحریر

اِصلاحِ زُبان

اتنی غلطیاں آپ نے کم ہی ایک جگہ درست ہوتے دیکھی ہوں گی

پروفیسر آسی ضیائی

اغلاط

☆ کیا گیا کام:

مثالیں:

(۲) اپنے اعزاز میں دی گئی دعوت کے موقع پر قومی راہنما نے مختصر تقریر بھی کی۔

(۲) کیا تم نے گھر کے لیے دیا گیا اسکول کا کام پورا کرلیا ہے؟

یہ رجحان بھی بالکل جدید ہے اور اہلِ ذوق پر سخت گراں گزرتا ہے۔ غالباً یہ انگریزی کے لفظی ترجمے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ان جملوں میں سے پہلے میں ''دی گئی دعوت'' کے بجائے ''دی جانے والی دعوت'' اور دوسرے میں ''دیا گیا'' کے بجائے ''دیا ہوا'' لکھنا چاہیے۔

☆ برائے مہربانی:

اس کا صحیح املا ''براہِ مہربانی'' ہے۔

☆ گالیاں نکالنا:

اُردو کا محاورہ ''گالیاں نکالنا'' نہیں۔ اس کی جگہ ''گالیاں دینا'' یا ''گالیاں بکنا'' بولا جاتا ہے۔

☆ اہالیان

''اہل'' خود جمع کے لیے آتا ہے۔ اس کی جمع ''اہالیان'' درست نہیں۔ مثلاً ''اہالیانِ لاہور'' کے بجائے ''اہلِ لاہور'' درست ہے۔

☆ نئی جدّت:

مثال: تم تو ہر بات میں ایک نئی جدت پیدا کرتے ہو۔

''جدت'' کے معنی نئی چیز یا بات کے ہیں۔ لہٰذا ''جدت'' کے ساتھ ''نئی'' لگانا بالکل زائد اور غلط ہے۔

☆ استفادہ حاصل کرنا:

مثال: طلبہ کو اپنے اُستادوں سے پورا پورا استفادہ حاصل کرنا چاہیے۔

''استفادہ'' کے معنی خود ہی فائدہ حاصل کرنا ہیں۔ لہٰذا ''حاصل'' بڑھانا غلط ہے۔ ''استفادہ کرنا'' کافی اور صحیح ہے۔

☆ تقرری رتنزلی:

دونوں غلط ہیں۔ صحیح لفظ ''تقرر'' اور ''تنزل'' ہیں۔

☆ صحیح سمندر، وغیرہ۔ (ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی تراکیب)

مثالیں:

(۱) یہ پہاڑ سطحِ سمندر سے ۵ ہزار فٹ بلند ہے۔
(۲) مظلوم کی چیخ و پکار کا جلاد پر کوئی اثر نہ ہوا۔
(۳) کس سوچ و بچار میں پڑے ہو۔

اُردو میں فارسی عربی الفاظ کے ساتھ ہندی یا انگریزی الفاظ لا کر ترکیب بنانا ایک بڑی غلطی ہے، جو آج کل بہت عام ہوگئی ہے۔ اسی طرح دو ہندی الفاظ کو بھی فارسی ترکیب کے ذریعے باہم ملانا غلط ہے۔ اوپر کے جملوں میں یہی غلطیاں ہیں۔ پہلے جملے میں ''سمندر'' ہندی لفظ ہے، اس لیے ''سطحِ سمندر'' کی ترکیب غلط ہے۔ اس کی جگہ ''سطحِ بحر'' یا ''سمندر کی سطح'' لکھنا چاہیے۔ دوسرے جملے میں ''چیخ'' اور ''پکار'' ہندی الفاظ ہیں اور تیسرے جملے میں ''سوچ'' اور ''بچار'' بھی ہندی ہیں۔ ان کے درمیان فارسی واؤ لانا درست نہیں۔ ان کی جگہ ''چیخ پکار'' اور ''سوچ بچار'' درست ہیں اور یہی اُردو کا روزمرہ بھی ہے۔

تنبیہ:

بعض ایسی تراکیب بھی اُردو میں رائج ہو چکی ہیں جو اس اصول کی رُو سے غلط ہونی چاہئیں، مگر انھیں یا تو اہلِ زبان نے استعمال کیا ہے، یا وہ پولیس، کچہری اور عدالت وغیرہ کی اصطلاحیں بن گئی ہیں، مثلاً: سڑک، آبِ دھار دار، قانونِ لگان، رکنِ اسمبلی وغیرہ۔ انھیں غلط نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ان پر قیاس کر کے اپنی طرف سے کچھ تراکیب بنا ڈالی جائیں تو یہ درست نہ ہوگا۔

☆ **نقصِ امن:**

مثال: پولیس نے اندیشۂ نقصِ امن کے تحت ۳۰ افراد کو گرفتار کر لیا۔

''نقص'' کے معنی کمی کے ہیں اور ''نقض'' کے معنی توڑنا یا درہم برہم کرنا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ''نقصِ امن'' یہاں درست نہیں، صحیح ''نقضِ امن'' ہے۔ ایک نقطے کے فرق سے معنی کچھ کے کچھ ہو گئے۔

☆ **تشہیر:**

مثال: ہماری کمپنی کے مال کی تشہیر کے لیے ہوشیار اور محنتی ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔

''تشہیر'' قدیم زمانے سے ذلیل اور رسوا کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً ''چور کا منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کیا گیا اور سارے شہر میں پھرا کر تشہیر کی گئی۔'' لیکن آج کل غلطی سے یہ اشتہار یا پبلسٹی (Publicity) کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اس کے بجائے ''اشتہار'' یا ''مشتہری'' جیسا لفظ ہونا چاہیے۔

☆ **کاروائی، قائمقام:**

ان دونوں لفظوں میں ایک ایک حرف کم ہے۔ صحیح لفظ ''کارروائی'' اور ''قائم مقام'' ہیں۔

☆ **اعلانیہ، پرواہ:**

صحیح لفظ ''علانیہ'' ہے۔ اس میں خواہ مخواہ ایک ''الف'' زائد بڑھانا غلط ہے۔ اسی طرح ''پروا'' صحیح لفظ ہے نہ کہ ''پرواہ''۔

☆ **سمجھ نہ آنا:**

مثالیں:
(۱) مجھے تمھاری بات کی سمجھ نہ آئی۔
(۲) سمجھ نہیں آتی کہ ہمارا کیا حشر ہوتا ہے۔

ان مواقع پر ''سمجھ نہ آنا'' خلافِ روزمرہ ہے۔ یہ جملے اس طرح صحیح ہوں گے:

۱۔ میری سمجھ میں تمھاری بات نہ آئی۔ یا، میں تمھاری بات نہ سمجھا۔

۲۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا کیا حشر ہوتا ہے۔

''سمجھ نہ آنا'' عقلاً بھی غلط ہے۔ سمجھ وہ ذہنی قوت ہے جس کے ذریعے کسی بات کا علم حاصل ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ قوت دماغ میں پہلے ہی سے موجود رہتی ہے۔ اس کے آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

البتہ اگر یہ کہنا مقصود ہو کہ دماغ ابھی بالکل کسی بات کو بھی سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا، تب ''سمجھ نہ آنا'' کا استعمال درست ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

''تم اتنے بڑے ہو گئے، ابھی تک تمھیں سمجھ نہ آئی، جو بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

آیئے بات کرتے ہیں

۲۰۱۲ء میں ان شاء اللہ اپنی ایک عادت ضرور بدلنی ہے

بہت سی باتیں ایسی جو ہم دوسروں سے کرنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں پاتے یہ سلسلہ ایسا ہی ایک مفید پلیٹ فارم ہے جہاں ہمارے قارئین اپنے عزائم، ارادے اور خیالات مجسم کرتے ہیں تاکہ کہنے کے بعد اپنانے اور کر دکھانے میں آسانی رہے

ماہ مارچ کا موضوع

مجھے پاکستان سے محبت کا دعویٰ نہیں ”مگر عملاً بہت ہے“

ضائع نہیں کروں گا

میری عرصہ دراز سے یہ بُری عادت ہے کہ تحریر لکھتا اور اسے ضائع کر دیتا ہوں۔ تین یا چار مرتبہ اردو ڈائجسٹ کے لیے تحریریں لکھیں لیکن بھجوائی نہیں۔ کئی مرتبہ مختلف مدیروں کے نام خطوط لکھے لیکن ضائع کر دیے۔ لیکن اب میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ تحریر اور خط ضائع نہیں کرتا۔

(منیجر بیت سوئٹس اینڈ بیکرز، کرمی شاہو، لاہور)

اپنا احتساب آپ

میں اس سال اپنی ایک عادت تو بدل ہی ڈالوں گی۔ وہ ہے دوسروں کو غلط سمجھنا اور خود کو ہر غلطی و کوتاہی سے بری الذمہ جاننا یعنی ہمیشہ اپنے آپ کو صحیح سمجھنا جیسا کہ ہم عموماً کرتے اور ہر بات میں دوسروں کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ اس سال میری اپنی ذات کی خامیاں میرے نشانے پر ہوں گی۔ میں اپنا احتساب کروں گی اور دوسروں کے بجائے خود سے جواب طلبی ہو گی۔ گو انسان کے لیے خود کو اپنے سامنے برائے احتساب پیش کرنا بظاہر مشکل ہے لیکن میں دیانت داری اور جرأت سے اپنی غفلت اور کوتاہیوں کا جائزہ لوں گی اور لائحہ عمل بناؤں گی۔

فرشتوں سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

(نام نہیں لکھا)

کڑھنا چھوڑ دیا

مجھے پاکستان کے حالات پر کڑھنے کی گندی عادت ہے۔ سوچتا رہتا ہوں کہ ہمارے قائد مرحوم نے بڑی محنت سے ہندوؤں اور انگریزوں کو مات دے کر یہ

پاکستان حاصل کیا تھا۔ جناب قائد اور علامہ اقبال کے کئی سہانے خواب تھے۔ لیکن ہم نے اس ملک کا حلیہ بگاڑ دیا۔ ستم یہ کہ خود کو سدھارنے کے بجائے یہ سوچتے رہتے ہیں کہ پاکستان کیوں بنا؟ کیا سوال اٹھانے والے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ رہ کر ان کے تلوے چاٹتے۔ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں پاکستان کا جو حشر کیا، اس کی بابت سوچ کر بھی کبھار تنہائی میں آبدیدہ ہو جاتا ہوں۔ وہ اس لیے کہ تصور میں اپنے بچوں کا مستقبل دیکھ رہا ہوں۔ اسے روشن کرنے کی تراکیب پر غور کرتا رہتا ہوں۔

لیکن بہرحال اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس سال اپنی یہ عادت بدل لوں گا اور آیندہ پاکستان کے حالات پر دوسرے بھائیوں کی طرح کڑھنا چھوڑ دوں گا۔ کبوتر کی طرح مصائب کی بلی کو دیکھ کر آنکھیں موند لوں گا۔

(سید انعام علی رضا۔ احمد پور شرقیہ)

”کثرتِ تحریر“ کی عادت

لکھنا، پڑھنا میری ”عادت“ ہے۔ مشغلہ اور تھوڑے بہت پیسوں کے حصول کا ذریعہ بھی۔ لیکن ”عادت“ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اس کی زیادتی یا کثرت بُری ہے۔ میں نے گزشتہ ۵۰ برس کی ادبی زندگی میں اس حد تک لکھا کہ دو بار جراحتِ چشم کی نوبت آئی۔ ایک مرتبہ موتیا اور دوسری بار آنکھوں پر چھائی جھلی ”چربی تہیں“ کی صفائی کے لیے۔ میں اس سال ”کثرتِ تحریر“ کی اپنی عادت کو تبدیل یا بدل تو نہیں سکتا، البتہ کم ضرور کر دوں گا۔ یہ میرا اپنے ضمیر سے وعدہ ہے، کسی ایسے راہنما کا نہیں جس کے بقول ”وعدے قرآن و حدیث نہیں ہوا کرتے۔“

(پروفیسر محمد ظریف خان۔ کراچی)

لکھنا..... آسودگی کا ذریعہ

۲۰۱۲ء میں میرا خود سے وعدہ ہے کہ میں سستی، کاہلی اور بے جا مصروفیات ختم کر کے اپنے تخلیقی کاموں کو وقت دوں گی۔ پہلے بھی میں زندگی کے تمام امور انجام دیتے ہوئے نظمیں، غزلیں، مضامین اور کہانیاں لکھا کرتی تھی۔ پھر پتا نہیں کیسے آہستہ آہستہ لکھنا کم اور پھر ختم کر دیا۔ ذہن الجھا رہتا ہے۔ وجہ ذہنی ناآسودگی ہے۔ میں اگر دوبارہ لکھنا شروع کر دوں تو ذہن بھی آسودہ ہو گا اور کئی کام بھی بہ حسن و خوبی انجام پائیں گے۔

(یاسمین کنول۔ پسرور)

ترتیبِ زندگی

میں کافی دیر سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنی چیزوں کو ترتیب میں لاؤں اور زندگی کو بہتر گزار سکوں۔ اردو ڈائجسٹ نے اب مجھے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اب میں اپنی اس عادت کو بدلوں گا۔ اس سے نہ صرف میری بلکہ مجھ سے متعلقہ لوگوں کے کام میں بھی بہتری کی صورت ہو جائے گی۔

(حافظ ندیم احمد۔ مری)

فہم قرآن و رزقِ حلال

میں کتابیں پڑھتا اور لوگوں سے ملتا رہا ہوں۔ اب ان سے مل کر ترجیحات متعین کروں گا۔ اول نمبر پر فہم قرآن ہے اور پھر رزقِ حلال کا حصول۔ ۲۰۱۲ء میں یہی نکات میری توجہ کا مرکز ہوں گے۔

(سید مکرم علی۔ لاہور)

سستی و کاہلی

میں سستی و کاہلی کا شکار رہتا ہوں۔ اکثر میرے کام اسی وجہ سے ادھورے رہ جاتے ہیں۔ میری یہ دیرینہ

خواہش ہے کہ اپنی اس عادت کو بدل لوں۔ اب اُردو ڈائجسٹ کے توسط سے میں اس عادت سے جان چھڑا لوں گا۔

(سانولہ وسیم اکئی۔ سابق مدیر ہم قدم، بہاولپور)

فون سنوں گا

میں نے جب سے موبائل فون لیا ہے تو، دوسروں کی کال اکثر نہیں سنتا یا لاپروائی کا شکار رہتا ہوں۔ میں کافی دنوں سے اس حوالے سے سوچ رہا تھا کہ اپنی اس عادت کو بدلوں۔ اب میں ۲۰۱۲ء سے ان شاء اللہ ہر کال سن کر کسی کو بھی مایوس نہیں کروں گا۔

(عامر یعقوب۔ ہارون آباد)

غیبت سے بچاؤ

میں پوری کوشش کروں گی کہ غیبت سے بچ سکوں! غیبت و چغل خوری اس معاشرے میں ایک ناسور کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ خاص طور پر خواتین میں یہ معاملہ زیادہ ہی گمبھیر ہے۔ اللہ کے نبیؐ نے غیبت کرنے والے کو بھائی کا مردہ گوشت کھانے والے کے مترادف کہا ہے۔

(سنول ریاض۔ منڈی بہاؤالدین)

التوا

میرے اندر ہر کام التوا میں ڈالنے کی عادت ہے۔ میں اسے ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ آج کا کام کل پر نہ چھوڑوں گا۔ میں یہ عادت اپناؤں گا کہ جو کام کل کرنا ہے، اسے آج کر لو اور جو کام آج کرنا ہے، اسے ابھی کر لو۔

(کاشف نیازی۔ لاہور)

خامیوں پر قابو

دین اور دنیا کے لیے ہر کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ۲۰۱۲ء میں اپنی خامیوں پر قابو پاؤں تا کہ اپنے مقاصد انجام دے سکوں۔ اس مقصد کے لیے اپنی روایتی سستی و کاہلی کی عادت کو بدلوں گا۔

(محمد اشرف قدیم۔ حاصل پور)

عورتوں کے لیے کوششیں

موجودہ دور میں خواتین اتنی بااختیار نہیں۔ اکثر بااختیار ہونے کے باوجود بے اختیار بھی ہیں۔ وہ اس لیے کہ مردانہ آمریت والے معاشرے میں قدم قدم پر ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ مثلاً میں ایک سرکاری ثانوی سکول کی صدر معلمہ اور گریڈ ۱۸ کی اعلیٰ سرکاری افسر تھی۔ خواتین اساتذہ تو میرا کہا مان لیتیں لیکن ایک مرد چپڑاسی، ایک کلرک کو میں قواعد و ضوابط کا پابند اس لیے نہ بنا سکی کہ ان کا تعلق خاص گروہی لسانی تنظیم سے تھا۔ اسی طرح شوہر اور بیوی کے برابر حقوق ہونے کے باوجود گھر پر حکم شوہر صاحب یعنی ''مرد'' کا ہی چلتا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں میرا ارادہ ہے کہ اس سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھوں۔ اللہ کی طرف سے مرد بے شک افضل ہے مگر عورت کو بھی تو مان لینا چاہیے اور اسے مان دینا چاہیے۔

(ریحانہ ظریف۔ گلستان جوہر، کراچی)

لوگوں کے کام آنا

زندگی بہت مختصر واقع ہوئی ہے۔ پل کی خبر نہیں کہ کیا سے کیا ہو جائے گا۔ اس لیے میں ۲۰۱۲ء میں چاہوں گا کہ اپنا وقت زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود کے کاموں میں لگا کر اپنے آپ کو دنیا و آخرت میں کامیاب کراؤں اور دوسروں کے کام آؤں۔

(عمیر افتخار باجوہ۔ فیصل آباد)

www.Paksociety.com

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

حالاتِ حاضرہ پہ گہری نظر

اردو ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ مجھے مل گیا ہے، آپ کا بہت شکریہ۔ دوسرے آپ کو یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ''اردو ڈائجسٹ'' مجھے باقاعدگی سے مل رہا ہے جس کے لیے میں آپ کی بہت ممنون ہوں۔ آپ کے ڈائجسٹ کا انداز دوسروں سے بہت مختلف اور منفرد ہے۔ اس میں شامل مضامین کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے جو اپنے اندر زندگی کے مختلف شعبوں کو

سمیٹے ہوئے ہے۔ جس کے باعث یقیناً آپ کے ڈائجسٹ کو قارئین کا بہت وسیع حلقہ میسر ہوگا۔ آپ کے ادارے اور تجزیے میں حالاتِ حاضرہ کو بڑی باریک بینی اور گہری نظر سے دیکھا گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی وسعتِ نظر کو اور زیادہ کشادگی عطا فرمائے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین

(بانو قدسیہ۔ لاہور)

جامع انٹرویو جیسے کوزے میں دریا

شوقِ دیدار نے مجنوں بنا دیا کے مصداق انتظار کے کٹھن لمحات گزارے۔ شکر ہے اس بار رسالہ جلدی ملا۔ بے تابی کے ساتھ ورق گردانی کی۔ دل دھک رہا تھا گویا دنیا کی سب سے قیمتی چیز مل گئی ہو۔ بلاشک و شبہ ہے بھی سب سے قیمتی۔ اپنے آپ ریلا خیالات شامل دیکھ کر دل باغ باغ ہوا۔ ایکو سسٹری کے بعد سارے کاموں کو خیرباد اور کمرکس کے ایک کونے میں دبک گیا۔ عادت بنی ہے کہ ''الف'' سے شروع کرو اور ''ی'' پر جا کر دم لو۔ تحی کلاس انڈسٹری کے سی۔ ای۔ او کا انٹرویو پڑھا تو بے اختیار بول اٹھا کہ سبحان اللہ آج بھی اسلامی اصولوں کو اپنا کر آگے بڑھنے کی جستجو کرنے والے موجود ہیں اور کامیاب بھی۔ ماشاء اللہ ایسا جامع انٹرویو کیا ہے جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ ایسے اچھے انٹرویو نسلِ نو کے لیے ایک عمدہ سبق ہیں جو مغربی تہذیب و تمدن میں ہی کامیابی کا راز ڈھونڈتے ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے امتیاز صاحب نے اپنی انڈسٹری کی بنیاد رکھی، جو کہ ایک نمونہ ہے۔ اچھا ہوا کہ جنید صاحب نے فوٹوگرافی ورلڈ میں ان کو لکھنے کی گزارش بھیجی، تحریر ورثہ ہے۔ یہ رسالہ اب ہماری زندگی کا جز بن چکا ہے۔ نئی نسل کی تربیت کا بہترین آلہ سمجھ کر اپنے شاگردوں تک کو فارغ وقت میں پڑھنے کی تلقین کرتا ہوں۔

(محمد حمزہ۔ فیڈرل اردو یونیورسٹی کراچی، پاکستان)

اشتہار پر دل خراب ہوا

پاکستان ٹوڈے (Pakistan Today) کے اشتہار میں بچوں سے انسان بننے کی منظر کشی کی گئی ہے۔ دل بہت خراب

ہوا کہ جدت (Innovation) کے نام پر مقام کو ضرب لگ رہی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس پر غور کریں گے کہ اس سے بہتر طور پر سوچنا اور اشتہار دینا چاہیے تھا۔ ہم اتنے اچھے رسالے کے دامن کو اس قسم کی غلطیوں سے آلودہ نہیں دیکھ سکتے۔

(فرحت طاہر۔ گلستان جوہر، کراچی)

کامیابی کے لیے دعاگو

آپ کا خط اور اردو ڈائجسٹ آج موصول ہو گیا۔ اس کے لیے شکریہ۔ اردو ڈائجسٹ یقیناً ایک معلوماتی ڈائجسٹ ہے۔ میں مستقبل میں اس کی مزید کامیابی اور ترقی کے لیے دعاگو ہوں۔

(سیدہ مہتاب بار علی۔ ... لاہور)

قصہ کوئز کے جوابات

قصہ کوئز کی بہتری کے لیے تجویز بھیج رہا ہوں۔ بے حد دلچسپ سیکشن ہے۔ لیکن ہم تمام جوابات کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اگلے شمارے میں جوابات شائع کر دیا کریں۔ (مشتاق ہاشمی)

جی خوش ہوا.....!

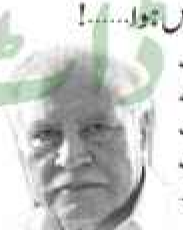

اس انٹرویو کا حال احباب سے سنا تھا۔ آپ کی عنایت سے پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ بہت شکرگزار ہوں۔ انٹرویو نہایت دیانتداری سے لکھا گیا ہے۔ جی خوش ہوا، جیتے رہیے۔

(رضا علی عابدی۔ لندن)

ٹی وی پروگراموں کا منفی اثر

دسمبر کا شمارہ سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے فکرانگیز تحریریں لیے ہوئے تھا۔ قومی سانحات کو یاد رکھنا اور ان سے سبق سیکھنا روشن ضمیر قوموں کا وتیرہ ہوتا ہے۔ آپ کا کالم بھی ایک اہم مسئلے کی نشاندہی کر رہا تھا جس کی طرف سے حکومت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے بھی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ میں ٹی وی چینلوں پر چلنے والے بعض پروگراموں پر بات کرنا چاہتا ہوں جو تمام حدیں پھلانگتے جا رہے ہیں۔ قتل، ڈکیتی، غارت گری، زنا، محبت کی شادیاں اور لڑکیوں کے گھر سے فرار کے قصے نمک مرچ لگا کر ڈرامائی کیفیت کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کا رویہ شام کے ان بدنام زمانہ اخباروں جیسا ہے جو چھوٹی سی خبر کو شہ سرخی بنا کر پیسے کماتے ہیں۔ ایسے واقعات ہر معاشرے میں ہوتے ہیں لیکن ان کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا۔ اس سے حاصل بھی کیا ہوگا سوائے بچے ذہنوں کے خراب ہونے کے۔ ان کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک پروگرام کا نام مشہور مقولے "کوئی دیکھے نہ دیکھے اللہ تو دیکھ رہا ہے" کے وزن پر "کوئی دیکھے نہ دیکھے شبیر تو دیکھ رہا ہے" رکھا ہوا ہے۔ (جاوید بسام۔ دہلی کالونی، کراچی)

برف باری اور ٹینٹوں کے سکول

پہاڑوں پر برف باری ہے۔ ٹھنڈی تیز ہوائیں سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ کر رہی ہیں۔ یہ زلزلہ روک مکانات سردی کی شدت کا مقابلہ نہیں کر پا رہے۔ آج کل گورنمنٹ کے ایک سکول میں عارضی طور پر پڑھا رہی ہوں۔ سکول کی حالت زار بس کیسے لکھوں۔ ۶ سال پرانے ٹینٹ ہیں اور سردی کی شدت، برف باری ہوتے ہی ٹینٹ بھی گر جائیں گے۔ سردی سے کانپتے معصوم بچے، بیٹھنے کی جگہ نہیں لیکن حکومت کے پاس فنڈ ہونے کے باوجود خرچ کرنے کو تیار نہیں۔

نئی بستی شام میں جنوری کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل دیکھتے ہی شمارے کی خوبصورتی کا اندازہ ہو گیا۔ اللہ پاک کے فرمان اور فرمان رسولؐ نے دل کو منور کیا۔ رسالے کی ترتیب اس کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کر رہی تھی۔ ہر چیز مناسب مقام پر سجی ہوئی تھی۔ ایک دلچسپ اور منفرد ملاقات نے حیران کر ڈالا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ یہ آپ کی بہترین کاوش ہے۔ شبیر نبیؐ کے پہلے سفیر کی روح پرور داستان روح کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اس قسم کی داستانیں ہر ماہ شامل ہونی چاہئیں۔ بہت سا علم تو مل ہی جاتا ہے۔

(... ملک۔ چہڑی، آزاد کشمیر)

خوبصورت سرورق

رسالے کا انتہائی خوبصورت سرورق تھا۔ جناب الطاف حسن کا تجزیہ دل میں گھر کرنے والی تحریر تھی۔ خدا ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں کو عقل و شعور عطا فرمائے کہ یہ ملک اور قوم کے لیے کچھ بہتر کام کر سکیں۔ اگر ہو سکے تو قصہ کوئز کے درست جوابات بھی شائع کر دیں۔

(محمد ادریس دانش ... سیکرٹری ... ضلع شیخوپورہ ... آباد)

وزیر اعلیٰ پنجاب کی توجہ کے لیے

زمانہ بدل گیا ہے۔ ہر ادارہ [illegible] روزانہ ۲۴ گھنٹے اپنے گاہکوں اور کرم فرماؤں کے لیے دستیاب ہوتا ہے۔ حد یہ کہ بینک بھی اے ٹی ایم اور اپنے کال سینٹروں کے ذریعے رابطے رہتے ہیں۔ حکومت سے رابطہ کرنا ہو تو کوئی کیسے کرے؟ ایک تجویز ہے، وزیر اعلیٰ صاحب اچھی بات سنتے اور عمل کرتے ہیں۔ جس طرح ڈینگی کی وبا کے دنوں میں کال سینٹر یا ہیلپ سینٹر بنایا گیا تھا، حکومتی مسائل، توجہ، مشوروں اور مدد کے لیے بھی ایک کال سینٹر ہونا چاہیے۔ مثلاً ملتان روڈ کروڑوں روپے سے بنی ہے۔ بارش ہوئی تو نکاس کے سوراخ بند تھے۔ لہٰذا پانی کی نکاسی کیسے ہوتی؟ ٹھوکر والی شاپ پر دو چار دکاندار روزانہ چلتی سڑک پر دن بھر سارا کوڑا ڈالتے ہیں۔ شام تک غلاظت کے پہاڑ بن جاتے ہیں۔ ساری سڑک پر چھلکے اور لفافے پھیلے ہوتے ہیں۔ کوئی سنتا ہے؟

یہ واردات ٹھوکر نیاز بیگ روڈ کے سامنے روز ہوتی ہے۔ کوئی سرکاری ملکیت والی چیزوں کو کاٹ رہا ہو، چرا رہا ہو، تو کوئی تو شکایت کی جگہ ہو......؟ ۱۱۲۲ کی طرح، ۱۵ کی طرح۔ اچھی گورننس بھی ممکن ہوگی۔ ویسے تو اصولاً ہر محکمے کا کال سینٹر ہو۔ افسروں کے فون نمبر اور مانیٹرنگ کا نظام الگ ہونا چاہیے جو متعلقہ محکمے کو بتائے اور کام کروائے۔ صبح ۹ سے ۲ بجے دن والے نظام سے تو اسی طرح کی ناقص مینجمنٹ ہوتی ہے، جیسی سب کو بھگتنی پڑتی ہے۔

(مہوش فیصل۔ علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور)

چاہنے والے کا تھپڑ

آپ کا مضمون بعنوان "حلق تک بھری گئی" واقعتاً قابلِ تعریف ہے۔ آپ نے جو دیکھا وہ بہت ہی تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت منظر ہوگا۔ اپنے مضمون کے ذریعے اپنا اور دوسروں کا علاج کرنے کی سعی کی ہے۔ پرانے زمانے کا واقعہ قارئین کو سنا کر دل ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ نیا شادی شدہ جوڑا پیدل جا رہا تھا۔ کیچڑ کی وجہ سے ایک بزرگ ہستی کا پاؤں پھسلا اور چھینٹے دلہن کے کپڑوں پر پڑ گئے۔ خاوند نے غصے میں آ کر بزرگ کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ قریب ہی گھر تھا جس میں داخل ہو کر اوپر والی سیڑھی سے دولہا کا پاؤں پھسلا اور گر کر فوت ہو گیا۔

دلہن نے بین کرتے ہوئے بتایا کہ باہر ایک بابا جا رہا ہے، اس نے میرا خاوند مار دیا ہے۔ بابے سے دریافت کیا گیا تو اس نے جواب میں کہا کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا، صرف یہ ہوا کہ لڑکی کے چاہنے والے نے مجھے تھپڑ مارا اور میرے چاہنے والے (اللہ پاک) نے جواباً ایک تھپڑ مارا لیکن یہ ہے کہ بڑی ہستی کا تھپڑ بھی تو بڑا ہی تھا۔

(مشتاق احمد وڑائچ۔ ٹاؤن آفیسر، فیصل آباد)

بیٹے کی شادی میں بھی پڑھا

اردو ڈائجسٹ کا نیا شمارہ مجھے بہت پسند آیا۔ میں اپنے بیٹے محمد کی شادی کی تقریب اور تیاریوں میں مصروف تھی۔ پھر بھی وقت نکال کر سارا پڑھا۔ اصل میں بچپن میں آغا جان (قاضی حسین احمد صاحب) کی راہنمائی کی وجہ سے اردو ڈائجسٹ پڑھتے بڑے ہوئے، ۳۰ برسوں کی محبت ہے۔ اس نے بہت ساتھ نبھایا، بہت کچھ سکھایا۔ یہ سب صاف ستھرا فیملی پرچہ ہے۔

(ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی۔ منصورہ، لاہور)

قصہ کوئز کا سلسلہ بہت اچھا لگا

ماہ دسمبر ۲۰۱۱ء سے جو "قصہ کوئز" والا سلسلہ شروع ہوا، یہ سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔ لیکن اب عرض یہ ہے کہ اگلے شمارے میں گزشتہ شمارے کے "قصہ کوئز" کے جوابات دے دیا کریں تاکہ جنھیں نہیں معلوم، ان کے علم میں بھی اضافہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ "اردو گرامر اور روزمرہ لغت" والا سلسلہ باقاعدگی سے شائع کیا کریں۔ اس کے علاوہ عرض ہے کہ "گوشۂ کمپیوٹر" والے سلسلے کو بھی دوبارہ شروع کریں کیونکہ اس میں سے بہت سی مفید "ویب سائٹس" کا پتا چلتا ہے۔

(رحمت اللہ بلوچ۔ فورٹ منرو)

وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ

میں اردو ڈائجسٹ کا کم سے کم ۳۱ برس سال سے قاری ہوں۔ اپنے بچوں کو بھی عقیدت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرواتا ہوں۔ اس میگزین کے ساتھ ایک دلی وابستگی ہے۔ لیکن کچھ عرصے سے اس کو دیکھ دیکھ کر دل کڑھتا تھا۔ اس کا معیار اور اس کا انداز اس کے شایانِ شان نہیں لگتا تھا۔ یہ میگزین تو نسلوں کو راہنمائی فراہم کرتا رہا ہے لیکن اب وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں لگتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے اس کے انداز میں ایک نئی شان آ گئی ہے۔ دیکھ دیکھ کر دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے اختر عباس صاحب کے لیے کہ جنھوں نے ہمارے قومی سرمایے کو ایک مرتبہ پھر جاندار بنا دیا اور ہمارے قومی ورثے کو ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔ ماشاء اللہ الطاف حسن قریشی صاحب والی محنت پھر نظر آنے لگی ہے جو اب

ان کے بس میں نہیں رہی تھی۔ اب ان کے مضامین اور ان کا گیٹ اپ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ایسے سنجیدہ ادب میں نئی نسل کو اپنا خوبصورت ماضی پیش کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت بھی دے اور اجر بھی۔ گھٹیا ادب اور سیکولر اور فحش مواد کے اس طوفان میں کوئی ایسا بھی ہونا چاہیے جس پر ہم فخر کر سکیں جو ہماری اصل اقدار اور ہمارے اصل کلچر کو پیش کرے۔

(کمپیوٹر کے سلسلے میں کسی موزوں لکھنے والے کی تلاش جاری ہے۔ کتاب سنگ میل لاہور نے چھاپی ہے۔) (ڈاکٹر آصف محمود کھوکھر۔ لاہور)

کیا پرچہ بنا دیا

میری بھی وہی رائے ہے جو کسی شاعر نے کہی کہ اردو ڈائجسٹ نے سو نسلوں کی آب یاری کی۔ میرے والد دو باتیں کہا کرتے تھے: پاکستان ٹائمز اور اردو ڈائجسٹ پڑھا کرو۔ کیا پرچہ بنا دیا ہے، بے پناہ خوشی ہوتی ہے دیکھ کر۔ اتنا اچھا لے آؤٹ، مسائل سے ماورا ان پرچے کے طور پر خوشی سے اٹھایا ہے۔

(افتخار مجاز۔ پی ٹی وی۔ لاہور)

صاحب آواز دوست

انداز اور مضامین دونوں نے دل لبھایا۔ مختار مسعود پر مضمون صاحب آواز دوست پسند آیا۔ ان کی تصویر پہلی بار دیکھی۔ کہانیوں کا انتخاب بھی بہت عمدہ تھا۔ (غلام حسین ...۔ حیدرآباد سندھ)

خوش گوار حیرت

شمارے کی خوب صورتی، دلکشی بہت خوشگوار حیرت ہے۔ میں بھکر کے ایک سکول میں استاد ہوں۔ میرے کام کی بہت سی چیزیں مل گئیں۔ (... خان۔ بھکر)

خدمت

اردو ڈائجسٹ سیاسی، ادبی، تاریخی اور قومی محاذ پر بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے لیے آپ بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ رسالہ ہر لحاظ سے معیاری ہے اور ہر قسم کا ذوق رکھنے والوں کے لیے نہایت صحت مندانہ تفریح، عمدہ انتخاب اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔

پروفیسر سید مطلوب علی زیدی

(صدر شعبہ ...۔ ایف سی کالج ...)

قصۂ کوتاہ

اردو میں کمپیوٹر مضامین کو شامل اور ادب کا مزا مزید بڑھ گیا ہے۔ مختار مسعود پر مضمون پسند آیا بلکہ زبان کا مزا بھی بھایا۔ کیا بہتر ہو کہ ان کی تین شاہکار کتابوں سے چیدہ چیدہ اقتباسات پر مشتمل مضمون بھی شائع ہو۔ آپ کا تاثراتی مضمون بھی ہونا چاہیے تھا جیسے اشفاق احمد پر تھا۔ قصۂ کوتاہ اچھا سلسلہ ہے، مگر گزشتہ کوئز کے جوابات نہیں دیے۔ (محمد حمزہ ...۔ حیدرآباد)

شالا نظر نہ لگے

اردو ڈائجسٹ تو ہم پہلے بھی چاہتے تھے مگر اب نئے سرے سے (شالا نظر نہ لگے) اور بھی زیادہ مزے کا ہو گیا ہے۔ کوئی چیز "وڈاتی" میں ہو اور اس میں جدت ہوتی رہے تو اچھی لگتی ہے اور دل اکتاتا نہیں، بوریت نہیں ہوتی۔

(آمنہ ...۔ وزیرآباد)

۲ شکریے واجب

۲ شکریے واجب ہیں۔ ایک تو یہ مضمون ربع صدی سے چھپنے کے انتظار میں رہا۔ جس محبت اور محنت سے چھاپا ہے میرے پاس الفاظ نہیں کہ شکریہ ادا کر سکوں۔ مختلف Fonts میں چھپ گیا تھا۔

(مختار مسعود نے خوب تبصرہ کیا فرمانے لگے تم نے مجھ غریب کو خوب تختۂ مشق بنا ڈالا۔)

● یہ بیٹی کہہ رہی تھی کہ جب سکول میں تھے تو سکول کا معیار بہت بلند ہو گیا۔ اب اردو ڈائجسٹ کو تختۂ کمال پہ پہنچا دیا ہے۔

(مختار مسعود صاحب کیا آپ نے جو تعارفی جملے لکھے ہیں انھوں نے لوٹ لیا۔)

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل قلم
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

(چوہدری ...۔ راولپنڈی)

ٹرننگ پوائنٹ

ہر شمارہ ہی تازہ ہوا کا خوشگوار جھونکا ثابت ہو رہا ہے۔ تعریف کرنے کے لیے دل چاہیے، یہ آسان کام نہیں۔ میں ۵۰ سال سے چھپ رہا ہوں۔ اردو کے قارئین درمیان میں کم ہو گئے تھے مگر الحمدللہ یہ Turning Point ہے۔ اردو ڈائجسٹ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ دل اندر تک سے خوش ہے۔

(محمود ...۔ لاہور)

بیوہ انگلیاں

کئی روز ہسپتال رہا۔ آج گھر آ گیا ہوں۔ ہسپتال والوں نے انگوٹھا لے لیا ہے۔ میری انگلیاں بیوہ ہو گئی ہیں۔ پرچہ البتہ بیوٹی فل، بیوٹی فل، بیوٹی فل۔ لیٹا لیٹا سارا پڑھ ڈالا۔ بیماری میں چیزیں اور تحریریں شاید ویسے بھی زیادہ خوب صورت لگنے لگتی ہیں۔

(منظور چوہدری۔ منصورہ، لاہور)

جاذب تصاویر

"عشق جب بھری تھی" عریانی اور فحاشی کے سیلاب کے خلاف ایک اچھی صدائے احتجاج تھی۔ صدقہ جاریہ کے مقابل گناہ جاریہ اصطلاح خوب تھی۔ عمل صفحے کی بڑی تصاویر بھی خوشنما اور جاذب نظر تھیں۔ "پاکستان پہلی اور آخری محبت ہے۔" جذبہ حب الوطنی کے تناظر میں اچھے جذبات پر مشتمل تھی۔

(فاروق اعظم ساحلی۔ علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور)

ہم دم دیرینہ سے ملاقات

اردو ڈائجسٹ کا دوسرا شمارہ بھی ملا۔ حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ اپنے گوناگوں صدمات اور پھر بینائی سے محروم ہونے کے سبب اردو ڈائجسٹ سے رابطہ نہ رہا تھا۔ اگرچہ اس کے باوجود دیگر رسالے اور میگزین بھی ملتے رہے اور ان کو پڑھوا کر تشفی بھی رہی اور اردو ڈائجسٹ کا خلا بری طرح محسوس ہوتا۔ بڑی تشنگی رہتی۔ خصوصاً آپ کے بصیرت افروز اداریوں کی کمی بہت محسوس ہوتی رہی اور اب یک وقت پے در پے ۲ شمارے ملے تو یقین جانیے کہ ایسا لگا جیسے کسی ہمدم دیرینہ سے ملاقات ہو گئی۔ رسید لکھنے میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ میں چاہتی تھی کہ ہر دو شمارے کے تمام مندرجات پڑھ کر ہی کوئی تاثر قائم کر سکوں۔ اردو ڈائجسٹ نے ماضی اور حال کے ہر ۲ معیاروں کے امتزاج سے ایک نیا اور بڑا خوشگوار و پرتحکم تیار کیا ہے۔ ایک ایک تحریر کا ذکر بہت طویل ہو جائے گا۔ خصوصاً اختر عباس کا افسانہ بابیہ نہ صرف والدہ بلکہ موجودہ حالات کی آنکھیں کھول دینے والی اطلاع اور معلومات سے بڑی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے افسانے کا تار و پود بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس کے طرح کی تفصیلات کے سلسلے میں ۳۶۵ دن لگاتار ایک سا حسین انتظام بے حد اہم اور معلومات افزا میرے نزدیک اس لیے کہ ان دنوں عرصے سے ایک رویہ یہ ہوتا جا رہا ہے کہ عمرہ اور حج کرنے والے حضرات اور خواتین (خصوصیت) سے اس فرض سے ادائی کے بعد جو سفرنامے تحریر کر رہے ہیں ان کو سعودی عرب کی حکومتی بدانتظامیوں، عربوں کے رویوں کی منفی تفصیلات بڑی خصوصیت اور اہتمام سے رقم کر رہے ہیں۔ وہاں کے قیام کے دوران کی تفصیلات بہت مبالغے سے لکھ رہے ہیں۔ اتنی زیادہ کہ پڑھنے والے اس سفر پر جانے کی ہمت ہی نہ کریں۔ اس مضمون نے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔

(الطاف فاطمہ۔ گنج بخش، لاہور)

شکر خدا کا

شکر خدا کا پانسٹھ تک کا مسئلہ حل ہوا۔ اک مدت سے قاری ہوں۔ اردو ڈائجسٹ زندگی کا حصہ ہی بن گیا ہے۔ صحت کے حوالے سے تحریریں عمدہ ہوتی ہیں۔ کیریئر کونسلنگ بھی اچھی تھی۔ وزن کم کرنے کے حوالے سے کوئی مستقل سلسلہ بھی دینا چاہیے۔ قارئین کا بے حد فائدہ ہوگا۔

(ڈاکٹر محمد سعید جاوید۔ تحفہ)

منی لائبریری

فرسٹ ایئر کا طالب علم ہوں۔ مطالعہ کا شوق ہے۔ اردو ڈائجسٹ ہر بار ایک نئی لائبریری بن کر سامنے آتا ہے۔ پڑھنے کو اتنا کچھ ہوتا ہے کہ انسان حیران رہ جائے۔

(مدثر۔ کوٹ مومن، ضلع سرگودھا)

زندگی کا خوبصورت حصہ

آپ نے قصہ کوئز کے لیے ارسال کردہ میرے جوابات کو نہ صرف درست قرار دیا بلکہ میرا نام بھی کامیاب امیدواروں کی فہرست میں شامل فرمایا۔ اب قرعہ اندازی میں نام کا شامل نہ ہونا قسمت کی بات ہے۔ البتہ قسمت کی خوبی ہے کہ اردو ڈائجسٹ ہماری زندگی کا خوبصورت حصہ ہے۔

(پروفیسر محمد ظریف خان۔ کراچی)

کہانیوں کا عمدہ انتخاب

آپ کی کہانیوں کا انتخاب بے حد عمدہ ہوتا ہے۔ اس بار ماشاءاللہ، بشریٰ رحمن اور تسلیم احمد بشیر کی کہانیاں بے حد اچھی تھیں۔ تعارفی جملے تو بے حد کمال کے ہوتے ہیں۔ اردو زبان کی شائستگی اور شگفتگی کا خوب صورت امتزاج ہوتا ہے۔ کہانیوں کی تصاویر کا

معیار بہت شاندار ہو گیا ہے۔ کسی بھی اچھے رسالے سے بہتر ہوتی ہیں۔ درد دل پہ دستک نے ڈائجسٹ کے صفحات کو اور مرغوب و محبوب بنا دیا ہے۔ سچی بات اور دل پہ دستک دینے والی بات ہوتی ہے۔

(پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی۔ کراچی)

تبدیلی کی تیاری

عالمی و قومی تحریکوں سے حاصل ہونے والے نتائج کے تجزیے اور جائزہ کی اشد ضرورت ہے اور اس سوچ کو عام کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ محض ٹی وی اور قدیم رویوں کی طرح گھٹیا لڑائیاں دیکھنے سے انقلاب نہیں آتے۔ براہ کرم اردو ڈائجسٹ کی تحریروں سے قوم کو جگائیے۔ اپنے تجزیے میں ان باتوں کو ضرور زیر بحث لائیں کیونکہ مجھے جتنا مواد ملتا ہے میں پڑھ تو لیتی ہوں مگر کسی سے بات کریں تو لوگ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ ہمارے ہاں لوگ ابھی کسی بڑی تبدیلی کے لیے تیار نہیں۔

(مسز طوبیٰ تنسیم ملک۔ مورگاہ۔ راولپنڈی)

ایسی صورت حال پر خاموشی ممکن نہیں

آپ کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ کسی نے اس موضوع پہ نہیں لکھا جو پچھلے شمارے میں درد دل پہ دستک میں آپ نے اٹھایا۔ ایک بار میرے گھر پر تقریب تھی۔ کئی بڑے صحافی آئے ہوئے تھے۔ وہاں میں نے ان سے کہا تھا ”جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں فحاشی پھیلے ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔“

جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ ایسی صورت حال پر خاموش کیسے رہ سکتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ کو اس موضوع پر اور بات کرنی چاہیے اور لوگوں کی زبان بننا چاہیے۔

(کرامت شیخ۔ گارڈن ٹاؤن۔ لاہور)

تیز ترک گامزن

کیا بتاؤں کتنا پرانا تعلق ہے میرا اردو ڈائجسٹ سے۔ ابا جی مرحوم ڈان اخبار اور اردو ڈائجسٹ لازماً لیا کرتے تھے۔ اس لیے میرے بچپن کی یادیں اس سے وابستہ ہیں۔ زندگی دائرہ در دائرہ سفر کرتی رہی اور بہت سے ساتھ چھوٹے تو یہ ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ کبھی یہ اپنے کسی واقف کار کے گھر سے اٹھا لاتے تو یوں لگتا کہ میرے میکے سے آنے والا بادِ صبا کا کوئی جھونکا قریب سے گزرا ہے اور لفظ لفظ پڑھ ڈالتی اس کو۔ ریلیف کے حوالے سے دادو کا دورہ کر کے واپس آ رہی تھی تو زاد سفر میں ”خاموشی چھپے شور“ بھی موجود تھی۔ تمام راستے میں پوری پڑھ ڈالی۔ نقشِ زود گزرتی رہی خاص طور سے جو بالآخر پھر وڈاک کرنے لگے۔ کل شمارہ ڈائجسٹ ملا، پڑھ کر دل خوش ہوا۔ محسوس یہ ہوا کہ لوگ سرشار ہیں نئی تبدیلیاں دیکھ کر اور امیدیں بھی نئی ادارت سے خوب وابستہ کر بیٹھے ہیں۔ رب پوری کرائے گا سب کی امیدیں ان شاء اللہ اور یاد رکھیے کہ کیا کہہ رہے ہیں اقبال۔

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

(افشاں نوید۔ ناظمہ سندھ جماعت اسلامی، کراچی)

ایک سے بڑھ کر ایک

اردو ڈائجسٹ ایک ایسا رسالہ ہے جو کہ ایک قاری بخوشی اپنے گھر میں رکھ اور فیملی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ ماہ جنوری کے شمارے میں خاص کر جناب الطاف حسن قریشی کا تبدیلی کا آئینی راستہ پڑھ کر بہت پسند آیا۔ خواتین کے متعلق معلومات، مشورہ حاضر ہے، پکا ایمان، سد ذوالقرنین، خلافت راشدہ کا ایک جج، حضرت مصعب بن عمیرؓ اور تجزیے بہت ہی اعلیٰ تھے۔ ویسے تو ہر ایک ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ کوئز کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے اسے جاری رکھا جائے۔

(محمود منصور خان۔ سلوالہ میانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا)

آئیے بات کرتے ہیں

آئیے بات کرتے ہیں کا سلسلہ بھی اچھا ہے لیکن ایک بات کو ایک مہینے میں کور (Cover) ہونا چاہیے۔ ہر ماہ کا الگ موضوع۔ ایک شکوہ یہ بھی ہے کہ ”پاکستان ہے سب چلتا ہے“ کے عنوان کے تحت آپ نے رائے کا اظہار طلب کیا تھا اور ساتھ ہی وہ بہتر تحریروں پر انعام اور ۶ ماہ کے شماروں کے مفت تحفہ کا اعلان کیا تھا لیکن اس کا اعلان تاحال نہیں کیا گیا۔

(زرنگار۔ موہڑ قدیم، منڈی فیض آباد)

گم کردہ راہوں کو راہ نمائی

یوں تو تمام مضامین اچھے ہیں لیکن اثر پذیری اور سبق آموزی کے لحاظ سے ”ہوائی سفر“ اور ”بھی کے دن بڑے“ سے خصوصاً متاثر ہوا ہوں۔ اس طرح کی معاشرتی و اصلاحی کہانیاں آتی رہنی چاہئیں، تاکہ گم کردہ راہوں کو راہ نمائی ملتی رہے۔ آخر میں گزارش کروں گا کہ اس خط کتابت کے بجائے ایس ایم ایس کا کنکشن دے دیں تاکہ قارئین کو اپنی معروضات آسانی سے پہنچانے میں سہولت ہو۔

(تنویر احمد۔ ضلع جہلم)

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

پرائی چیز پہ آیا دل

خدا جانے میرا دل ہی اتنا نرم ہے جو ایک تصویر دیکھ کر دکھی ہو گیا یا بجھ سے جاتی، زندگی کی خوب صورتی، رشتوں کا تقدس اور اقدار کی کم مائیگی اور بے وقعتی دل کا درد بڑھا گئی۔ ہونے کو تو کچھ ایسا بڑا نہیں ہوا، ایک گرلز کالج کے مینا بازار میں ایک "لو برڈ کیج" (Love Bird Cage) کی تصویر ہے جسے ایک نو مولود اخبار نے اپنے رنگین صفحات کی شان بڑھانے کے لیے شائع کیا ہے۔ ساتھ ہی خبر میں پوری تفصیل دی ہے کہ جس لڑکی کو قید کیا گیا ہے اس کا نام کسی اور نے دیا اور ساتھ پیسے ادا کیے وہ سر جھکائے شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی ہے۔ لو جیل سے نکلنے کے لیے قیدی لڑکی کو بھی پیسے ادا کر کے ہی رہائی ملے گی۔

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

یہ لفظ چند سال پہلے پہلی بار سنا تو سمجھنا مشکل تھا کہ جیل کے ساتھ محبت کا اور پنجرے کا کیا تعلق، مگر بھلا ہو ہمارے کچھ اعلیٰ درجے کے تعلیمی اداروں اور ان کے منتظمین کا کہ انھوں نے ویلنٹائن ڈے کے دنوں میں ہی اس کو کریز (Craze) بنا دیا۔ ہر بڑے سکول میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ جہاں مخلوط تعلیم ہے وہاں پہ لڑکے اور لڑکی کو اس "لو جیل" میں بند کرنے کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جہاں زیادہ تخلیقی صلاحیتوں والے لوگ تھے انھوں نے جال کا پنجرہ بنا لیا۔ لاؤڈ سپیکر اور ڈیک پہ اعلانات ہوتے ہیں اور تالیوں کی گونج میں لڑکے لڑکیاں ہنستے مسکراتے جیل میں قید ہونے کے لیے چل پڑتے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے اگر ان کا افیئر خفیہ تھا اور دو چار کے علاوہ باقی کو اس کی خبر نہ تھی تو اب اس تعلق کو سند قبولیت عطا کر دی جاتی ہے اور پہلے جھجک، فطری شرم حیا کے باعث اس تعلق کو سب کے سامنے ماننا مشکل تھا تو اب پوری سہولت کے ساتھ سب کے سامنے اظہار، اقرار اور اعلان ہو گیا ہے۔

ریم اور اس کی والدہ میرے سامنے بیٹھی ہیں۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کے سکول میں کلاس نہم کی طالبہ ہے۔ سکارف لیتی ہے۔ شائستہ اطوار بچی جس نے اچھے والدین سے اچھی تعلیم تہذیب سیکھی اور اپنی پسند سے اسے اختیار بھی کیا۔ باتیں جاری تھیں جب اس نے نم آنکھوں سے مجھے دیکھا، وہ رو ہی دی "میں تو وہاں سے گزر رہی تھی۔ اچانک کچھ لڑکیوں نے مجھے پکڑا اور کھینچتے ہوئے ایک پنجرے میں ڈال دیا جس پہ "لو برڈ کیج" لکھا تھا۔ وہاں ایک لڑکا بھی لایا گیا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اس نے اپنے دوستوں سے کہہ کر یہ کروایا۔ بے عزتی کس قدر تکلیف دہ ہو سکتی ہے آپ اس مجھ سے پوچھیے، جو اس ساری طرز زندگی اور سوچ کو ہی ناپسند کرتی ہے۔ مجھے میری مرضی کے خلاف اس بے ہودہ کھیل کا حصہ بنا دیا گیا۔ میں رو بھی نہیں سکتی تھی کہ احمق، بزدل اور نجانے کیا کیا کہلاتی۔ میں نے اپنی ٹیچر سے شکایت کی تو وہ مسکرا کر بولی "جانے دو ریم، مستی کے دن ہیں۔"

تب اس کی والدہ نے کہا "سر! چند روز بعد وہ دن آ رہا ہے جس کی تیاریوں کے لیے ہر جگہ ایسا انتظام اور اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جو بچیاں نہیں چاہتیں کہ اس ناپسندیدہ چلن کا

حصہ نہیں ہیں، وہ سب چارج کیا کریں۔ جس طرح عمل کو وہ مناسب نہیں سمجھتیں، ان پر وہی کچھ مستی کے نام پہ کیوں تھوپا جائے۔ کہاں کی رسم، کہاں کی تہذیب اور قیمت ہماری بچیوں کو چکانی پڑ رہی ہے۔

بے شک اس لمحے میرے پاس تسلی کے مناسب الفاظ نہیں تھے۔ آیئے اب چند لمحوں کے لیے آپ کو اٹلی لیے چلتا ہوں جہاں ایک روز بڑا مختلف واقعہ ہوا تھا اور اس کی بڑی بھاری قیمت کی بے شک یہ ایک بہت بڑی قیمت تھی، جو ایک بینک منیجر کو چکانی پڑی۔ نہ صرف نوکری گئی، ملک بھر میں بے عزتی ہوئی۔ ساتھ میں (۱۵۰۰ یورو) ایک ہزار پاؤنڈ جرمانہ بھی ہوا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ وہ لڑکی جسے بینک منیجر نے اپنا ویلنٹائن بنانے کی جبری کوشش کی، اٹلی کی رہنے والی تھی اور اٹلی کی عدالتیں حکمرانوں اور بااثر طبقوں کے نام اور معاشرے یا مستی کا چلن دیکھ کر فیصلے نہیں کرتیں۔ وہ انصاف کی "رٹ" کے نفاذ پر یقین رکھتی ہیں۔ ۵۰ سالہ والٹر جے پرانیو لیکی کے اطالوی قانون کے تحت ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے ۱۴ ماہ کی سزا سنائی ہے، نے اس فیصلے کو ظالمانہ کہا ہے جبکہ کورٹ نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے "His Romantic Gesture Amounted to Sexual Violence" (اس کی جسارت جسمانی تشدد کے زمرے میں آتی ہے۔)

یہ چند سال پہلے ۱۴ فروری کا ہی دن تھا، جب دنیا بھر میں سرخ رنگ میں رنگی ہوئی نفسانی محبت کا راج ہوتا ہے۔ ایک دنیا ہے جو اپنی حدود کو توڑ کر دوسروں کی حدود اور آزادیوں کو پامال کرنے پر تل جاتی ہے۔ ویسے تو ویلنٹائن ڈے کے موقع پر اپنے اپنے ویلنٹائن کی تلاش اور ان کو تحفے اور پھولوں سے اظہار محبت کو ویلنٹائن کا قرینہ سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں جدید تہذیب کے پیروکار اور نمائندے تو ہر لمحے اس طرح کی کسی بھی بات پر پوری طرح ایمان لانے کو تیار ہی بیٹھے ہوتے ہیں۔

گلوبل ویلج کا شہری بننے کے بعد ہم نے اپنی کسی بات یا روایت کو دوسروں تک کیا پہنچانا تھا، دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنے اندر ضرور اس کو لے لیا تھا۔ ۱۴ فروری کو بڑے شہروں میں وہ طوفان بدتمیزی مچتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ حد یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں اس روز انتظامیہ بے بس ہو جاتی ہے۔ لو برڈز (Love Birds) کے لیے، لو جیلو کا اہتمام کالجوں میں ہی نہیں، تقریباً ہر انگریزی سکول میں ہونا لازم قرار پایا ہے، جن میں ایک لڑکے لڑکی کو منتخب کر دیا جاتا ہے۔ دن بھر راہ چلتی لڑکیوں کو پھول دینا، دوستیوں کو پیش کش کرتا، چھو کر گزرنا، چھیڑنا، دل والے کارڈز کو جگہ جگہ بانٹ کر تماشا دیکھنا، اپنے ویلنٹائن کی تعداد بتانا، اس پر اترانا، ڈانس پر جانا اور نہ صرف ویلنٹائن کی پارٹیوں بلکہ ڈانس پارٹیوں کا اہتمام معمول بن گیا ہے۔ چند سالوں سے ریڈیو کے مختلف ایف ایم چینلوں نے اس دن لائیو پروگرام دینے شروع کیے ہیں۔ ایک دو قومی اخبارات ایڈیشن اور پیغامات شائع کرتے ہیں۔ ٹی وی کے پروگراموں کی تو بات ہی چھوڑیں۔ وہاں تو کپڑوں کے رنگ تک بدل جاتے ہیں۔ گانے، جملے، باتیں، ڈرامے، ہر چیز رنگین ہو جاتی ہے۔

اس سارے منظرنامے میں ان لڑکیوں کا کوئی رول نہیں جو ہزاروں نہیں لاکھوں میں ہیں اور اس طوفان بدتمیزی کا شکار ہوتی ہیں مگر کسی تھانے، کسی عدالت میں کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ کوئی بس نہیں چلتا۔ کوئی شکایت نہیں سنتا۔ یہ کہہ کر معاملہ دبا دیا جاتا ہے کہ چھوڑیں جی مستی کرنے کے دن ہیں، بچے ہیں، کچھ تو کریں گے اور یہ سب اٹلی میں نہیں ہمارے ہاں ہوتا ہے۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ویلنٹائن کا تعلق اٹلی سے ہی تھا۔ یہ رومن دور میں رومی پادری، بشپ اور سینٹ تھا، اور اس کے بادشاہ وقت شہنشاہ کلاڈیس کے احکامات کے خلاف نہ صرف خفیہ طور پر نوجوانوں کی شادیاں کرانے کا سلسلہ جاری رکھا، بلکہ جیل کے قیدیوں کو فرار کرانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا رہا، مگر وہ جو کہتے ہیں کہ سو دن چور کے ایک دن بادشاہ کا، سو بادشاہ تک اس کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچی تو اسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اٹلی کے لوگ اسے پادری سے زیادہ عاشق کے نام سے یاد کرتے ہیں، کیونکہ

www.paksociety.com

حضرت نے جیل میں جا کر جیلر صاحب کی صاحبزادی سے عشق کا آغاز کر دیا اور اسے خطوط لکھے۔ خط کے آخر میں لکھا جانے والا جملہ "تمھارے ویلنٹائن کی طرف سے" دیکھتے ہی دیکھتے دنیا میں مستی اور محبت کا مضبوط حوالہ بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سرخ پھول، سرخ دل، سرخ کارڈ، سرخ لباس، حتیٰ کہ سرخ رنگ بھی ویلنٹائن کا لازم حصہ ہو گئے۔ پہلے بھی یہ محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا رہا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اب یہ دنیا بھر میں جنسی تعلق اور محبت کے اظہار کا سستا طریقہ قرار پایا ہے۔

یورپی ممالک، خصوصاً اٹلی کی اپنی روایات ہیں۔ اٹلی ایک ایسا کٹر کیتھولک عیسائی معاشرہ ہے، جہاں مشہور ڈکٹیٹر اور فاشسٹ مسولینی کی پوتی الیسندرا مسولینی، عورتوں کے ساتھ ہونے والے جنسی جرائم کے خلاف زوردار تحریک چلا رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے ہر رسالے اور اخبار میں عریاں و نیم عریاں ہی نہیں بالکل برہنہ تصاویر تک چھپتی ہیں۔ جنس کے بدنام ترین مراکز بھی وہاں پر ہی قائم ہیں۔

ہر طرح کی آزادیاں ہیں، مگر پھر بھی قانون اور عدالتیں ایسی کسی بھی شکایت کو گوارا نہیں کرتیں اور اس پر "کوئی بات نہیں" والا رویہ اختیار نہیں کرتیں۔ ان کے پاس دلیل کوئی بھی ہو، اصل مسئلہ اور سوال تو ہمارے لیے ہے کہ کیا آنے والے دنوں میں ویلنٹائن ڈے ہماری سرکاری عید کا درجہ پانے والا ہے اور جو پسند نہ کریں، وہ اس بدتمیزی کے طوفان کا یونہی شکار ہوتے رہیں، رسوائی تو ہو اور شنوائی نہ ہو۔

مغربی ممالک کے وہ لوگ جو ہمیں بے حد ناپسند ہیں وہ تو شخصی آزادی کو بھی ایک حد دیتے ہیں۔ اس کو ایک Value اور قدر مانتے ہیں اور اس کی قدر اور حفاظت کرتے ہیں۔ کیا ہمارے پاس بچانے اور قدر کرنے کو کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ جس جس غیر ملکی بات اور روایت کو بے ضرر جان کر اپنے ہاں آتے دیکھ لوگ خاموش رہے تھے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے ہر گھر کے اندر در آئی ہے۔ در و دیوار پر ہی نہیں، گھروں کے اندر رہنے والوں کے طرز عمل اور طرز فکر پر بھی حاوی ہو چکی ہے۔ مزاحمت تو دور رہی، اب تو اس کے خلاف بولنے والی زبانیں بھی گنتی کی رہ گئی ہوں گی۔

گزشتہ ویلنٹائن ڈے پر پنجاب یونیورسٹی کے سامنے واقع پھولوں کی دکانوں پر بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ لگتا تھا پورا لاہور صرف ویلنٹائن ڈے منانے اور اپنے ویلنٹائن کو سرخ پھول دینے نکل کھڑا ہوا ہے۔ گھنٹوں وہاں ٹریفک جام رہی۔ ۵۰ روپے والا گلاب کا ایک پھول سو سو روپے میں بکا۔ یہی حال پھولوں کی ان تمام دکانوں پر تھا، جو لبرٹی یا برکت مارکیٹ میں قائم ہیں۔ کچھ معصوم لوگوں نے اپنی بیویوں اور بچوں نے اپنے والدین کو بھی یہ کہہ کر پھول دیے کہ آپ ہمارے ویلنٹائن ہیں۔ کیونکہ انھیں لگتا تھا کہ سرخ پھولوں اور سرخ کارڈز دینے کی اس میراتھن میں نہیں وہ رجسٹرڈ ہونے سے رہ گئے تو جناب مشرف صاحب کی شروع کی ہوئی روشن خیالی اور جدیدیت کی دوڑ میں شریک نہ ہو سکیں گے۔

اٹلی سے شروع ہونے والے ویلنٹائن کا اس قدر جنون وہاں ہو تو سمجھ میں بھی آتا ہے، مگر محبت کے نام پر ہوس کے پھیلاؤ کے اس کھیل کی وہاں پر پھر بھی کوئی حد مقرر ہے، قیمت مقرر ہے اور تجاوز پر سزا بھی..... اور ایک ہم ہیں کہ ہوس کے اس طوفان کے خلاف بولنا تو دور رہا، اس کے خلاف بات کرنے والے بھی برے لگنے لگے ہیں۔ کتنے ہی روشن خیال ہمیں سمجھانے بیٹھ جاتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، چھوڑیں، یہی مستی کے دن ہیں۔ یقیناً وہ درست کہتے ہیں مستی کے ہی دن ہیں مگر مستی کا نشہ اترنے پر جو جو گھٹن باقی بچتی ہے۔ وہ بہت دکھ دیتی ہے۔ ہماری تو خدا جانے قسمت میں ہی کچھ مسئلہ ہے کہ حکومت سے لے کر اپوزیشن تک اور بزنس سے لے کر تعلیمی اداروں تک، جس جس کا بس چلتا ہے، اپنی مستی کے شوق اور دھن میں ہر طرف شائستگی کا حلیہ بگاڑنے پر لگ جاتا ہے۔

کتنی ہی بچیاں ان نم آنکھوں سے پوچھنا چاہتی ہیں، اپنا دکھ بتانا چاہتی ہیں یہ کہہ کر کہ مستی کے دن ہیں کوئی سنتا ہی نہیں۔ اکثر سننے پر تیار ہی نہیں ہوتا۔ ہمارا دل جب جب کسی پرائی چیز پر بے طرح آتا ہے، ہم سننا، دیکھنا اور سوچنا کیوں بند کر دیتے ہیں۔